

علامہ اقبال

شخصیت اور فکر و فن

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی



علامہ اقبال

شخصیت اور فکر و فن

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

اقبال اکادمی پاکستان

ناشر
محمد سہیل عمر
ناظم
اقبال اکادمی پاکستان
(حکومتِ پاکستان، وزارت ثقافت)
چھٹی منزل، ایوان اقبال، لاہور
Tel: [+92-42] 36314-510
Fax: [+92-42] 3631-4496
Email: director@iap.gov.pk
Website: www.allamaiqbal.com

ISBN: 978-969-416-455-7

عزیز شاگرد

اور

اقبال دوست

صابر کلوروی

(۱۹/ اکتوبر ۱۹۴۹ء۔ ۲۲/ مارچ ۲۰۰۸ء)

کی یاد میں

مرنے والے مرتے ہیں، لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

— علامہ اقبال

اظہارِ تشکر

- برادرم محمد سہیل عمر اور عزیزِ محترم ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر نے مسودہ پڑھ کر مفید مشورے دیے۔
- عزیزِ مکرم ڈاکٹر خالد ندیم کی معاونت نے اس کام کو سہل بنایا۔
- برادرِ عزیز ڈاکٹر عبداللہ شاہ ہاشمی اور شاگردِ عزیز قاسم محمود احمد نے حوالوں کی تلاش، املانویسی اور پروف خوانی میں مدد دی۔ قاسم محمود احمد نے طبع دوم کا اشاریہ بھی تیار کیا۔
- پسرانِ عزیز حسن عمیر احمد اور قاسم عُزیر احمد نے کتاب کا بہت سا حصہ کمپوز کیا۔
- اس 'مہم' کی تکمیل دیگر افرادِ خانہ کے تعاون کے بغیر ممکن نہ تھی۔

راقم تہِ دل سے سب کا شکر گزار اور سب کے لیے دُعا گو ہے۔

مؤلف

فہرست

❖......❖......❖

دیباچہ

(طبع دوم)

یہ کتاب تقریباً ڈیڑھ سال پہلے اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد نے شائع کی تھی۔ میں نے کتاب کی سافٹ کاپی بصورت سی ڈی اور ٹریسنگ بھی اکادمی کو بھیجی تھی۔ کتاب چھپ کر آئی تو خوشی ہوئی کہ کاغذ بہت عمدہ استعمال کیا گیا تھا مگر افسوس ہوا کہ تدوین اور فارمیٹنگ کے نام پر کتاب میں حسب ذیل تبدیلیاں کردی گئی تھیں:

(۱) انتساب کا صفحہ خارج کر دیا گیا۔ (۲) اظہارِ تشکر کا صفحہ بھی مکمل قلم زد کر دیا گیا۔ (۳) کتاب کا فولیو اُڑا دیا گیا (۴) صفحات کے شمار نمبر اُردو میں تھے انھیں انگریزی ہندسوں سے بدل دیا گیا۔ (۵) جیسا کہ قارئین ملاحظہ کریں گے میں نے ہر باب کا عنوان (ماسوا ایک باب کے) علامہ اقبال کے کسی نہ کسی مصرعے سے اخذ کیا تھا۔ جہاں مصرعے کا ابتدائی حصہ عنوان بنایا گیا، وہاں باقی حصے میں اور جہاں مصرعے کے آخری حصے کو عنوان بنایا گیا، وہاں شروع میں نقطے لگائے گئے تھے۔ یہ ایک معروف علمی طریقہ ہے مگر اکادمی ادبیات کے تدوین کار اس سے بے خبر تھے، چنانچہ انھوں نے مصرعوں کے ابتدائی نقطوں کو غیر ضروری سمجھ کر اُڑا دیا۔ (۶) میں نے اکادمی کو جو ٹریسنگ بھیجی تھی، اس میں خاص طور پر احتیاط برتی گئی تھی کہ اختتامِ سطر پر لفظ ٹوٹنے نہ پائیں — اکادمی نے جو 'فارمیٹنگ' کی، اس میں ہر صفحے پر دو دو، چار چار لفظ ٹوٹ گئے۔ (۷) ناشر نے ایک اور 'اجتہاد' یہ کیا کہ کتاب کا نام اور ابواب کے عنوانات کو (جو خط نستعلیق میں تھے) ایک چیٹے سے نسخ میں بدل دیا۔ ویسے تو یہ ذوق کی بات ہے مگر اس سے ایک جگہ مضحکہ خیز صورت پیدا ہوگئی۔ باب ۴ کا عنوان: 'دیدۂ بینائے قوم' تبدیل ہوکر دیدئہ بینائے قوم بن گیا۔ (۸) میرے دیباچے کا عنوان تھا: 'دیباچہ' اِسے 'پیش لفظ' سے بدل دیا گیا۔ (۹) دیباچے کے آخر میں تاریخِ تحریر، دیباچہ نگار کا ڈاک کا پتا اور برقی پتا سب مِٹا دیے گئے۔ (۱۰) کتاب کا نام بھی علامہ اقبال، شخصیت اور فکروفن سے بدل کر علامہ محمد اقبال، شخصیت اور فن کر دیا گیا۔

میں نے اپنے لکھے کو کبھی حرفِ آخر نہیں سمجھا اور اپنے اساتذہ، بزرگوں، دوستوں بلکہ اپنے شاگردوں تک کے مشوروں اور تجاویز کا طلب گار رہتا ہوں اور جو مشورہ یا تبدیلی بھی معقول نظر آئے، اُسے مان لیتا ہوں مگر اکادمی ادبیاتِ پاکستان نے یک طرفہ طور پر اور مَن مانے طریقے سے اور مصنف کی اجازت تو کُجا، اُسے بتائے بغیر یہ تبدیلیاں کر دیں تو مجھے دلی طور پر بہت افسوس ہوا۔ مجھے تسلیم ہے کہ طباعت کی تکنیکی ضروریات کے تحت بعض اوقات فارمیٹنگ میں بعض تبدیلیاں ناگزیر ہوتی ہیں مگر میں نہیں سمجھتا کہ انتساب، اظہارِ تشکر، فولیو اور مصنف کے پتے کو کتاب سے خارج کرنے اور نستعلیق کو نسخ سے، اُردو ہندسوں کو انگریزی ہندسوں اور لفظ 'دیباچہ' کو 'پیش لفظ' سے بدلنے کی مجبوری، ضرورت یا مصلحت کیا تھی؟

کتاب کے دو نسخے موصول ہونے پر (جی ہاں اہلِ قلم کی فلاح و بہبود کا سب سے بڑا یہ حکومتی ادارہ مصنفین کو صرف دو اعزازی نسخے دیتا ہے۔ اُردو بازار کا معمولی پبلشر زیادہ فراخ دل ہے۔ وہ کم از کم ۵ نسخے تو دے ہی دیتا ہے) میں نے اکادمی کے نئے صدر نشین کو بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک ایک عرض داشت بلکہ مصنف کی 'فریاد' پر مشتمل ایک خط ارسال کیا جس کا جواب ابھی تک نہیں ملا۔

یہ کتاب سال بھر سے ختم تھی۔ تقریباً چھے ماہ پیش تر راقم نے اکادمی ادبیات کو مطلع کر دیا تھا کہ وہ کتاب کو دوبارہ طبع کرنے کی زحمت نہ کریں۔ ڈیڑھ دو ماہ قبل اقبال اکادمی پاکستان کے ناظم جناب محمد سہیل عمر نے کتاب چھاپنے کی پیش کش کی، چنانچہ زیرِ نظر دوسرا اڈیشن ان کے زیرِ اہتمام شائع ہو رہا ہے۔ اس اڈیشن میں طبعِ اوّل کے محذوفات اور تبدیلیوں کو بحال کر دیا گیا ہے، کتاب کی اغلاط کو مقدور بھر دُور کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور چند مقامات پر لفظی تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں۔ کہیں کہیں وضاحتی جملوں اور آخر میں اشاریے کا اضافہ بھی کیا جا رہا ہے۔

قارئین سے درخواست ہے کہ وہ اپنے تاثرات، تجاویز اور غلطیوں سے راقم کو ضرور آگاہ کریں۔ والسلام

رفیع الدین ہاشمی

rdhashmi@yahoo.com

۱۵؍ جولائی ۲۰۱۰ء

پیش نامہ

(طبع اوّل)

اکادمی ادبیات پاکستان نے ۱۹۹۰ء میں پاکستانی زبانوں کے ممتاز تخلیق کاروں کے بارے میں 'پاکستانی ادب کے معمار' کے عنوان سے ایک اشاعتی منصوبے پر کام شروع کیا تھا۔ معمارانِ ادب کے احوال و آثار کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لیے یہ کتابی سلسلہ بہت مفید خدمات انجام دے رہا ہے۔ اکادمی، پاکستان کی تمام زبانوں کے نام وَر ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں اور نقادوں کے بارے میں کتابیں شائع کر رہی ہے۔

علامہ محمد اقبالؒ ان عظیم المرتبت صاحبانِ قلم میں شمار کیے جاتے ہیں، جن کے نوکِ قلم سے روحِ عصر ظہور کرتی ہے۔ ہماری قومی منزلت اور ملّی افتخار کے لیے اقبال سے نسبت ایک معتبر حوالہ ہے۔ اقبال کی فکر عہدِ حاضر میں اُٹھنے والے سوالوں کے وہ جواب فراہم کرتی ہے جو ہماری دین و دانش کے سرچشموں کے بطن سے نمود کرتے ہیں اور تہذیبِ جدید کے سیلِ بے پناہ میں بھی اپنی شناخت باقی رکھنے کا حوصلہ فراہم کرتے ہیں۔ بیسویں صدی کے آغاز کے عشروں میں جس طرح فکرِ اقبال نے مسلمانانِ عالم بالخصوص برصغیر کے مسلمانوں کی بیداری کی تحریک میں بنیادی کردار ادا کیا تھا، اکیسویں صدی میں دانش و آگہی کے بحران سے نکالنے میں بھی مرکزی کردار سرانجام دے سکتی ہے۔ یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ پچھلی صدی میں دنیا بھر میں جتنا کام اقبالؒ کے حوالے سے اب تک کیا جا چکا ہے کسی اور مسلم مفکر کے بارے میں نہیں ہوا، اس کے باوجود تشنگی کا احساس موجود ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فکرِ اقبال کی گہرائیاں مزید اُجاگر ہو رہی ہیں۔

علامہ محمد اقبالؒ کی شاعری اور فکر سے نئی نسل کو آگاہ کرنا جتنا آج ضروری ہے اتنا اس سے پہلے نہیں تھا۔ اکادمی ادبیات پاکستان نے 'پاکستانی ادب کے معمار' سلسلے کی کتاب علامہ محمد اقبالؒ: شخصیت اور فن شائع کرنے کا منصوبہ بنایا تو ضروری محسوس ہوا کہ اُردو کے علاوہ دوسری پاکستانی زبانوں میں بھی اس کے تراجم بیک وقت منظرِ عام پر لائے جائیں

تا کہ ان سے بھرپور استفادہ کیا جا سکے۔ سو بلوچی، پشتو، پنجابی، سندھی، سرائیکی اور انگریزی میں تراجم بھی ساتھ ہی اشاعت پذیر ہو رہے ہیں۔

اُردو میں علامہ محمد اقبال: شخصیت اور فن نامور اقبال شناس، ممتاز تنقید نگار اور محقق پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے اکادمی ادبیات پاکستان کے لیے تحریر کی ہے۔ ہم ان کے تہِ دل سے شکرگزار ہیں۔ انھوں نے علامہ محمد اقبالؒ کے حوالے سے تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کا امتیازی اختصاص کے ساتھ بے حد وقیع کام کیا ہے۔ اقبال شناسی میں ڈاکٹر صاحب کے مقام و مرتبے سے صاحبانِ علم بخوبی واقف ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان کا اشاعتی منصوبہ 'پاکستانی ادب کے معمار' ادبی حلقوں کے علاوہ عوامی سطح پر بھی پسند کیا جائے گا۔

افتخار عارف

دیباچہ

(طبع اوّل)

علامہ اقبال پر دو ہزار سے متجاوز چھوٹی بڑی کتابوں میں سے تقریباً ایک سو ایسی ضرور ہوں گی، جو کاملاً یا جزواً ان کی سوانح اور شخصیت سے بحث کرتی ہیں۔ ان میں ہر ضخامت اور معیار کی کتابیں شامل ہیں ___ سوال یہ ہے کہ پھر اسی موضوع پر ایک اَور کتاب لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

ضرورت کی بات تو بعد میں ہوگی (اور بتوفیقِ الٰہی جو قاری اس کتاب کا مطالعہ کرے گا، ضرورت اس پر الم نشرح ہو جائے گی) ___ پہلے مَیں یہ عرض کروں گا اور بلا تأمل کہ اگر برادر محترم افتخار عارف فرمائش نہ کرتے (یا حکم نہ دیتے) اور پھر اُن کا اصرار جاری نہ رہتا تو مَیں یہ کتاب نہ لکھتا یا لکھنے میں ہرگز کامیاب نہ ہوتا ___ پس اس کتاب کی تصنیف و تالیف کا سہرا (credit) اُنھی کے سر ہے۔

....

یہ کتاب محققوں، دانش وروں اور نقادوں کے لیے نہیں، اقبال کے عام قاری کے لیے ہے، اس قاری کے لیے جو اقبال کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اقبال بیسویں صدی کا سب سے بڑا شاعر تھا، لیکن وہ نرا شاعر نہ تھا، ایک مفکر اور فلسفی بھی تھا۔ اقبال پوری امتِ مسلمہ کا محسن اور عالمِ انسانیت کا ایک بڑا نام ہے۔ وہ ایک ایسا باکمال شخص تھا، جو غلام قوم میں پیدا ہوا (اور اسے اس کا شدید احساس تھا)، مگر اس کے عزائم اور مقاصد اتنے بلند تھے کہ اس نے:

سوے قطار مے کشم ناقۂ بے زمام را

کا عظیم مِلّی فریضہ انجام دیا اور اسی سلسلے میں خطبۂ الٰہ آباد کی صورت میں اس نے قیامِ پاکستان کے جواز کے لیے پہلی اینٹ فراہم کی۔

ایسی کثیر الجہات شخصیت کا احاطہ، ایک مختصر سی کتاب میں ممکن نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ راقم نے ،اس نابغۂ روزگار کے کوائفِ حیات اور اس کے فکروفن کے اہم پہلو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں قارئین کو بعض ایسے واقعات و بیانات بھی ملیں گے، جو سوانحِ اقبال کی عام کتابوں میں نظر نہیں آتے۔ اس کے ساتھ ساتھ سوانحِ اقبال کے بعض بیانات و نکات کی تصحیح اور بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔

....

اقبال کے سوانحی ذخیرے کو دیکھتے ہوئے احساس ہوا کہ بیشتر سوانح نگاروں نے اپنے اپنے زاویۂ نظر سے اقبال کا مطالعہ کیا ہے۔ جہاں تک راقم نے اقبال کو پڑھا اور سمجھا، خرم علی شفیق کی رائے قابلِ توجہ ہے کہ اقبال کی اصل زندگی؛ ان کا مطالعہ اور ان کی فکر تھی ——— اس میں یہ اضافہ کر لیجیے کہ خدا نے اقبال کو جو غیر معمولی بصیرت عطا کی تھی، مطالعے، سوچ بچار اور غور و فکر نے اسے جلا بخشی اور اس سے ان کا منفرد نوعیت کا وہ فکر اور وِژن سامنے آیا، جو ان کی شاعری اور نثر خصوصاً خطوط اور خطبات میں نمایاں ہے ——— یہ اصل اقبال ہے۔

کسی اِدّعا کے بغیر عرض ہے کہ زیرِ نظر کتاب اصل اقبال کی دریافت کی جانب ایک کوشش ہے ——— اقبالیات کے ایک ادنیٰ طالب علم کی ایک معمولی اور ناتمام سی کاوش ——— وقت بہت کم تھا، چنانچہ ایک محدود مدّت میں لکھی جانے والی کتاب ناتمام و ناقص ہی ہوگی۔ اَلسَّعْیُ مِنِّی وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللّٰہِ۔

آخری ابواب زیرِ تالیف تھے کہ عزیز دوست، شاگرد اور چوٹی کے اقبال شناس ڈاکٹر صابر کلوروی ۲۲ر مارچ ۲۰۰۸ء کو ہم سے جدا ہو کر، دنیائے علم و ادب، اُردو تحقیق، خصوصاً جہانِ اقبالیات کو سوگوار کر گئے ——— اب ایسے لوگ عنقا ہوتے جا رہے ہیں، جن کی ذات اخلاص، مہارت اور تحرک کی جامع ہو ——— مرحوم اس کی ایک مثال تھے ——— یہ کتاب انھی سے منسوب کی جا رہی ہے۔ باری تعالیٰ اُن کی مغفرت کرے، آمین!

رفیع الدین ہاشمی
ایچ ای سی ایمی نینٹ پروفیسر
شعبۂ اقبالیات، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور
rdhashmi@yahoo.com

۱۲ر مئی ۲۰۰۸ء

اختصارات

حوالوں میں بعض کتابوں کے لیے حسب ذیل مختصر نام اختیار کیے گئے ہیں:

۱۔	تصانیفِ اقبال	تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ
۲۔	دمادم رواں ہے	دما دم رواں ہے یمِ زندگی
۳۔	سید میر حسن	علامہ اقبال کے استاد شمس العلماء مولوی سید میر حسن (حیات و افکار)
۴۔	گم شدہ کڑیاں	حیاتِ اقبال کی گم شدہ کڑیاں
۵۔	مخفی گوشے	حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے
۶۔	مکاتیب بنام گرامی	مکاتیبِ اقبال بنام گرامی
۷۔	مکاتیب بنام نیاز	مکاتیبِ اقبال بنام خان نیاز الدین خاں
۸۔	مکتوبات بنام نیازی	مکتوباتِ اقبال، مرتبہ: سید نذیر نیازی
۹۔	Disclaimer	*The Idea of Pakistan & Iqbal: A Disclaimer*
۹۔	Reconstruction	*The Reconstruction of Religious Thought in Islam*
۱۰۔	Speeches	*Speeches, Writings & Statements of Iqbal*

❖......❖......❖

(۱)

آبا مرے لاتی و مناتی

اقبال کا بچپن، پنجاب کے قدیم شہر سیالکوٹ کی خوابیدہ و خاموش گلیوں میں گزرا۔ ذہنی نشو و نما کا ابتدائی دور سید میر حسن ایسے نابغۂ روزگار استاد کی صحبت اور سکاچ مشن سکول (بعد ازاں کالج) کے مخصوص تعلیمی ماحول میں بسر ہوا۔ اوائلِ شباب میں انھوں نے لاہور کی شعری و ادبی محفلوں اور گورنمنٹ کالج کے اساتذہ بالخصوص پروفیسر آرنلڈ سے استفادۂ علمی کیا اور پھر انھوں نے کیمبرج کے علمی ماحول اور ہائیڈل برگ کی رومان پرور فضاؤں سے بھی بہت کچھ اخذ کیا، لیکن ان کی شخصیت کی مجموعی تشکیل و تعمیر میں ان سب چیزوں کے ساتھ ساتھ ان کے آبا و اجداد کے گونا گوں اثرات کا بھی دخل ہے، جن کا خون اقبال کی رگوں میں گردش کر رہا تھا۔

۱

سپرو، برہمنوں کی ایک شاخ ہے اور برہمن ہندوؤں کی سب سے اونچی اور معزز ذات سمجھی جاتی ہے۔ اقبال کے آبا و اجداد سپرو تھے۔ سپروؤں کی اس نسل میں، ایک شخص بابا لول حج سب سے پہلے قبولِ اسلام کی نعمت سے بہرہ ور ہوئے۔ وسیلۂ معاش کے طور پر انھوں نے زراعت کا پیشہ اختیار کر رکھا تھا۔ دائرہ اسلام میں آنے کے بعد، ان کا نکاح کسی مسلم گھرانے کی خاتون سے ہوا،[۱] مگر بیوی سے اُن کے تعلقات اچھے نہ تھے۔ بابا کی آنکھیں بھینگی اور پاؤں ٹیڑھے تھے، بیوی کبھی کبھی ان پر ہنسا کرتی تھی۔ ایک روز بیوی کی طنزیہ ہنسی سے دلِ حساس کو ایسی ٹھیس پہنچی کہ دنیا کی ہر شے سے جی اچاٹ ہو گیا۔ بیوی بچے، گھر بار، کھیت کھلیان، مال مویشی، سب کچھ چھوڑ چھاڑ، اور دامن جھاڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ گھر بار اور شہر ہی سے نہیں، سرزمینِ کشمیر ہی سے کوچ کیا۔

آشفتہ مزاجی، بابا کو سالہا سال تک اجنبی سرزمینوں میں لیے پھرتی رہی۔ کتنے شام و سحر گزر گئے، دن ہفتوں میں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ وقت کا سیلِ رواں جاری رہا۔ اقبال کے بابا جی نے سالہا سال سیر و سیاحت میں گزار دیے۔

روایت ہے کہ بابا، حج بیت اللہ سے بھی متعدد بار مشرف ہوئے۔ تقریباً بارہ برس بعد واپس کشمیر آ گئے۔ لوٹ کر تو آنا ہی تھا۔ انسانی فطرت ہے: کُلُّ شَیءٍ یَرجِعُ اِلیٰ اَصلِہٖ۔ (ہر چیز اپنی اصل کی طرف واپس آتی ہے۔)

وطن کی مٹی میں ایک خاص قسم کی مہک ہوتی ہے۔ پھر اس مٹی کی پیداوار، کشمیر کے دہکتے چنار اور سرسبز کھیت اور وہاں کے زعفران زار ——— بابا لول حج کو کیا کچھ نہیں یاد آتا ہوگا۔ کب تک بن باس گزارتے۔ کشمیر کی مٹی کی خوشبو، پس ماندگان کی یادیں اور خون کا رشتہ انھیں واپس کھینچ لایا۔ بابا لول حج واپس تو آ گئے، مگر اب وہ ایک مختلف شخص تھے۔ سالہا سال کی سیاحتی زندگی، دنیا جہان کے مشاہدے، اجنبی سرزمینوں کے تجربات اور سب سے بڑھ کر حج بیت اللہ کی تاثیر نے اُن کے قلب و ذہن کو ایسی صفائی اور پاکیزگی عطا کی اور ایسا منقلب کیا کہ وہ معمول کی زندگی کی طرف راغب ہونے کے بجائے بابا نصرالدین کے ہاتھ پر بیعت ہو گئے۔ یہ بابا کشمیر کے معروف بزرگ شیخ العالم شیخ نورالدین ولی کے ایک نام وَر خلیفہ تھے۔ لول حج نے مکروہاتِ زمانہ سے منہ موڑ کر زندگی کے باقی ایام، بابا نصرالدین کی خدمت اور صحبت میں بسر کر دیے۔ اقبال کے یہ نیک طینت جَدّ (بابا لول حج) چرار شریف میں واقع شیخ العالمؒ کی معروف درگاہ کے احاطے میں، اپنے مرشد کے جوار میں آسودۂ خاک ہیں۔[۲]

خاندانِ اقبال میں غور و فکر، درویشی اور تصوف کی جس روایت کا آغاز بابا لول حج سے ہوا، چند پشتوں کے بعد یہ روایت ہمیں اسی خاندان کے ایک بزرگ شیخ اکبر کے ہاں بھی نظر آتی ہے، جو غالباً اقبال کے پڑدادا تھے۔[۳] شیخ اکبر کو بابا لول حج کا سیاحتی ذوق وشوق ورثے میں ملا تھا۔ وہ ایک متقی، پرہیز گار اور نیک انسان تھے۔ اُن کے مرشد سادات میں سے تھے۔ شیخ اکبر کی خاندانی نجابت اور پارسائی نے مرشد کو اتنا متاثر کیا کہ انھوں نے اپنی صاحبزادی شیخ اکبر کے عقد میں دے دی۔ پھر جب سید صاحب فوت ہوئے تو شیخ اکبر ہی ان کے جانشین مقرر ہوئے، کیونکہ سید صاحب کے بیٹے ابھی سنِ بلوغت کو نہیں پہنچے تھے۔[۴]

گویا ہمارے اقبال، پیروں کی اولاد تھے۔ اس پر تعجب کیوں؟ اقبال نے خود ایک جگہ کہا ہے کہ "ہمارے والد کے دادا یا پڑدادا پیر تھے۔"[۵] اقبال کی طبیعت میں روحانیت اور تصوف کی طرف میلان اور جذب وسوز شاید انھی بزرگوں کے خون کا اثر تھا۔

بابا لول حج نے وطن چھوڑا، ایک عرصہ سیر وسیاحت میں گزار دیا، پھر اپنے وطن کشمیر جنت نظیر

کو لوٹ آئے، اب ان کی اولاد نے رختِ سفر باندھا۔ شیخ اکبر نے کئی بار پنجاب کا سفر کیا اور ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں میں مقیم رہے۔ بعض روایات کے مطابق اقبال کے اسلاف میں چوتھی پشت میں شیخ محمد رفیق کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ آئے تھے۔ تین بھائی بھی اُن کے ساتھ تھے۔ دوسرے بھائی تو پنجاب کے مختلف علاقوں کی طرف کوچ کر گئے، محمد رفیق نے سیالکوٹ میں بزازی کی دکان کھول لی۔[۶] وہ ''درمیانے قد کے بزرگ تھے اور نہایت وجیہہ اور خوب صورت تھے اور خدو خال، لب و لہجے اور درخشاں چہرے سے ان کی کشمیریت ٹپکی پڑتی تھی''[۷]۔ ایک بار وہ اپنے بیٹے غلام محمد کے پاس روپڑ (پنجاب) گئے تھے کہ بیمار ہوئے اور وہیں فوت ہو گئے۔ شیخ محمد رفیق کے ایک بیٹے عبداللہ ریاست حیدرآباد دکن چلے گئے اور وہاں اپنے قدیمی آبائی پیشے زراعت سے وابستہ ہو گئے۔

بعض روایات میں ہے کہ ہجرت کرنے والے بزرگ جمال الدین تھے۔ وہ شیخ محمد رفیق کے والد تھے۔ یہی شیخ محمد رفیق، اقبال کے دادا تھے۔

۲

کشمیر سے ہجرت شیخ محمد رفیق نے کی ہو یا ان کے والد شیخ جمال الدین نے، یہ ذکر ہے انیسویں صدی کے تیسرے عشرے کا۔ اس زمانے میں کشمیر سکھوں کے زیرِ نگیں تھا۔ بقول ڈاکٹر جاوید اقبال یہ: ''عہدِ حکومت؛ کشمیر کی تاریخ کا بدترین دور تھا۔'' اپنے ۲۷ سالہ عہدِ حکومت (۱۸۱۹ء - ۱۸۴۶ء) میں سکھ صوبے دار ہر طرح کی من مانی کرتے رہے۔ زندہ رُود میں ایک انگریز مصنف ولیم مورکرافٹ کا بیان نقل کیا گیا ہے کہ سکھ کشمیریوں کو انسان نہیں، جانور سمجھتے تھے۔ ان کے دورِ حکومت میں اگر کوئی سکھ کسی کشمیری کو قتل کر دیتا تو اُسے قانوناً سولہ روپے سے بیس روپے تک جرمانہ ادا کرنا پڑتا۔ اس میں مقتول کے خاندان کو، اگر وہ ہندو ہوتا تو چار روپے ملتے، اگر مقتول مسلمان ہوتا تو اسے فقط دو روپے دیے جاتے۔ اسی زمانے کے ایک اور سیاح بیرن شون برگ کی روایت ہے کہ گائے کے ذبیحے کی سزا موت تھی۔ اگر کوئی مسلمان گائے ذبح کرتا پکڑا جاتا تو اُسے سری نگر کی گلیوں میں گھسیٹا جاتا اور پھر پھانسی پر لٹکا دیا جاتا یا زندہ جلا دیا جاتا۔[۸] سکھوں کے ان مظالم کے علاوہ باشندگانِ کشمیر کو کبھی کبھی قدرتی آفات (قحط، سیلاب، زلزلوں وغیرہ) کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا:

زلزلے ہیں، بجلیاں ہیں، قحط ہیں، آلام ہیں
کیسی کیسی دخترانِ مادرِ ایام ہیں[9]

خیال رہے کہ اگرچہ سکھوں نے بطورِ خاص مسلمانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا، تاہم کشمیر کا عمومی ماحول غیر مسلموں کے لیے بھی پریشان کن تھا۔ ہندوؤں کے بہت سے خاندانوں (مثلاً: پنڈت جواہر لال نہرو اور سر تیج بہادر سپرو کے اجداد) نے بھی اسی زمانے میں کشمیر سے ترکِ وطن کیا۔ آئے دن کے مسائل و مصائب، پریشانیوں اور عدمِ تحفظ کے احساس نے اقبال کے بزرگوں کو بھی کشمیر سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا۔[10]

شیخ محمد رفیق کے ہاں یکے بعد دیگرے دس بیٹے پیدا ہوئے مگر سوئے اتفاق سے ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچا۔ ۱۸۳۷ء میں گیارھواں بیٹا تولّد ہوا۔ نام اس کا رکھا گیا: نور محمد۔ معاشرے میں عموماً تو ہم پرستی، جہالت اور ضعیف الاعتقادی کا دور دورہ تھا۔ گھرانے کی زیادہ تر مستورات بھی ٹونے ٹوٹکے اور تعویز گنڈے پر یقین رکھتی تھیں۔ کسی کو سوجھا تو ٹونے کے طور پر نور محمد کی ناک چھید کر، اس میں ایک چھوٹی سی ''نتھ'' ڈال دی گئی تاکہ موت کا فرشتہ اسے لڑکی سمجھ کر ٹل جائے۔ اس ٹونے کا کیا اثر ہوتا، زندگی اور موت تو قادرِ مطلق کے ہاتھ میں ہے۔ اس کا فیصلہ تھا کہ گیارھواں بیٹا زندہ رہے گا، طویل عمر پائے گا اور اُس کی صُلب سے محمد اقبال پیدا ہوگا، جو نہ صرف ملتِ اسلامیہ بلکہ پوری عالمِ انسانیت کو اقبال مندی کا راستہ دکھائے گا۔ ہاں اس ''نتھ'' کی وجہ سے نور محمد کا عرف شیخ نتھو پڑ گیا۔[11]

۳

شیخ نور محمد عرف نتھو تجارت پیشہ گھرانے کے فرد تھے۔ انھوں نے قرآن شریف ضرور پڑھا ہوگا، مگر کسی مدرسے میں باقاعدہ تعلیم نہ حاصل کر سکے تھے۔ وہ ذہین تھے، اور کچھ سیکھنے، آگے بڑھنے اور کچھ حاصل کرنے کے ذوق و شوق سے مالا مال۔ بس اسی لگن اور دل چسپی کی بنا پر حرف شناسی سے عبارت شناسی کی منزل تک پہنچے اور رفتہ رفتہ، دھیرے دھیرے اردو عبارت پڑھنے لگے۔ بعد ازاں فارسی کتابیں بھی پڑھ لیتے تھے۔[12]

وہ سادہ مزاج، بردبار اور حلیم الطبع شخص تھے۔ والد کے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹانے لگے۔ جس کسی کو ان سے معاملہ پیش آتا، وہ اس نوجوان کے حسنِ اخلاق سے متاثر ہوتا۔ شیخ محمد رفیق نے جلد ہی اپنے اکلوتے بیٹے نور محمد کی شادی سمبڑیال، ضلع سیالکوٹ کے ایک کشمیری گھرانے میں

کردی۔ اب نور محمد دُھسّوں اور لوئیوں کی تجارت میں زیادہ توجہ سے حصّہ لینے لگے۔ شیخ محمد رفیق بوڑھے ہو چکے تھے۔ نور محمد نے کاروبار سنبھال لیا اور اپنی محنت اور کوشش سے اسے مزید ترقی دی۔ دُھسّوں کی تجارت کے ساتھ برقعوں کی ٹوپیاں بھی تیار کرنے لگے۔ ٹوپیاں بہت عمدہ تھیں، مقبول ہوئیں۔ ایک روایت کے مطابق ان کی دکان پر کپڑے بھی سیے جاتے تھے اور سیالکوٹ میں سب سے پہلے سلائی مشین انھوں نے منگائی تھی۔ انھوں نے چند درزی اور ٹوپیاں سینے والے کاریگر، اپنے ہاں ملازم رکھ لیے۔[۱۳] وہ خود ایک نیک نفس اور دیانت دار شخص تھے۔ ان کی دکان پر سلائی کا کام توجہ اور سلیقے سے کیا جاتا تھا، اس لیے خدا نے کاروبار میں برکت دی اور گھرانے کی مالی حالت بہتر ہو گئی۔

اپنے حسنِ اخلاق، عالی ظرفی، گوناگوں خوبیوں اور صلح کُل طبیعت کی وجہ سے شیخ نور محمد کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ خاندان اور برادری میں انھیں ''میاں جی'' کہہ کر پکارتے تھے۔ پنجاب کے دیہی معاشرے میں ''میاں جی'' کے ساتھ بزرگی، احترام، دانش و بینش اور معاملہ فہمی کے تصورات وابستہ ہیں۔ شیخ نور محمد نہ صرف اپنے خاندان بلکہ محلے، کاروباری حلقوں اور شہر میں بھی ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ تقریباً ۲۵ سال کی عمر میں اللہ نے انھیں اولادِ نرینہ عطا کی، نام عطا محمد رکھا گیا۔ شیخ عطا محمد (۱۸۵۹ء۔۱۹۴۰ء) نے رُڑکی انجینئرنگ کالج سے ڈپلوما حاصل کیا اور ایک بھرپور زندگی گزاری۔ لاہور اور یورپ میں اقبال کی تعلیم کے زیادہ تر اخراجات وہی برداشت کرتے رہے۔

شیخ نور محمد کی شخصیت کا ایک اور پہلو بھی قابلِ ذکر ہے، جس کا تعلق ان کی روحانیت سے ہے۔ وہ نیک سرشت اور پاکیزہ مزاج تھے۔ تلاوتِ کلام پاک، عبادات خصوصاً نوافلِ شب اور تہجد سے شغف رکھتے تھے۔ خدمتِ خلق کے ساتھ کلام اللہ کی تلاوت کو ''دین و دنیا کی ترقی کا سبب سمجھتے تھے۔ ان کی یہی تاکید اپنی اولاد کو تھی۔''[۱۴]

تصوف سے ان کی دل چسپی کا یک اور حوالہ شیخ محی الدین ابن عربی کی تصانیف (فتوحاتِ مکیہ اور فُصوصُ الْحِکَمْ) تھیں۔ وہ تعلیماتِ ابن عربی کی شرح و بحث میں شریک رہتے تھے۔ ''علم و عرفان کا ذوق اور دینی جذبہ انھیں کشاں کشاں علما و صلحا کی مجالس میں لے جاتا اور وہ ان صحبتوں سے برابر استفادہ کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی اہلِ علم کی یہ مجلسیں ان کے مکان یا دکان پر بھی آراستہ ہوتی تھیں۔ ان کی گفتگو حکیمانہ خیالات و عارفانہ کیفیات کی آئینہ دار

ہوتی تھی۔ چنانچہ میر حسن انھیں ''ان پڑھ فلسفی'' کے لقب سے پکارتے تھے۔''[۱۵] بعض لوگ تصوف کے مشکل نکات کی تفہیم کے لیے ان سے رجوع کیا کرتے تھے۔[۱۶]

شیخ نور محمد کی روحانیت اور صوفیانہ افتادِ نہاد سے متعلق متعدد واقعات ملتے ہیں[۱۷] مگر ان کی روحانیت اور تصوف کا رنگ، تصوف کے روایتی طور طریقوں سے بالکل جدا تھا۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی لکھتے ہیں ''۔ شیخ نور محمد ان صوفیوں سے بالکل مختلف تھے جو وجد و جلال کی لذتوں میں کھو کر، قرآن سے بے تعلق ہو جاتے ہیں۔ انھیں مطالعۂ قرآن کا خاصا ذوق تھا۔''[۱۸] ہمیں شیخ نور محمد کی زندگی، دیانت و شرافت، خدمتِ خلق اور کسبِ حلال کے لیے محنت و جدوجہد سے عبارت نظر آتی ہے۔ ساری عمر روزی کے لیے 'دل بہ یار و دست بہ کار'، پر ان کا عمل رہا۔ دل خدا کی طرف، ہاتھ کام میں لگے رہتے تھے۔[۱۹]

دنیاوی تگ و دو میں انھوں نے ہمیشہ خیال رکھا کہ رزقِ حلال سے تجاوز نہ ہونے پائے۔ روایت ہے کہ کچھ عرصہ وہ ڈپٹی وزیر علی کے ہاں ملازم رہے۔ اس ملازمت کی ''آمدن کا کچھ حصہ ایسا بھی تھا، جو کسبِ حلال کے اسلامی تصور میں نہیں آتا تھا۔''[۲۰] چنانچہ شیخ نور محمد نے وہ ملازمت ہی ترک کر دی۔

ان کی روحانیت کا یہ پہلو بھی نام نہاد صوفیہ سے مختلف اور منفرد تھا کہ وہ بناوٹ اور تصنع سے کوسوں دور تھے اور کسی خاص وظیفے کے یا اسمِ اعظم کے اِخفا کے قائل نہ تھے۔ علامہ اقبال کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد راوی ہیں کہ ایک بار میں نے دادا جان سے ''اسمِ اعظم'' کے بارے میں پوچھا تو فرمایا: ''مجھے جادو منتر، ٹونے ٹوٹکے جیسا کوئی اسمِ اعظم معلوم نہیں ہے کہ اس کے پڑھتے ہی کچھ سے کچھ ہو جائے۔ ہاں، اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے سے مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں، اس لیے دعا ہی اسمِ اعظم ہے۔ پھر فرمایا: قرآن حکیم میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بہت سی اچھی صفات ہیں، جن کے ذریعے اس سے دعائیں کرنی چاہییں۔[۲۱] روحانیت سے متعلق شیخ نور محمد کی زندگی میں متعدد واقعات ملتے ہیں۔ تفصیلات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے یہاں صرف ایک واقعہ بیان کرنا کافی ہوگا۔

ان کی عمر لگ بھگ چالیس برس ہوگی، جب انھوں نے ایک خواب دیکھا کہ ایک وسیع و عریض میدان میں بہت سے لوگ جمع ہیں۔ فضا میں ایک خوب صورت پرندہ یا سفید کبوتر اُڑ رہا ہے۔ لوگ اُٹھ اُٹھ کر دیوانہ وار اُسے پکڑنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ پرندہ کبھی نیچے اترتا، کبھی آسمان کی طرف اُڑ جاتا۔ آخر وہ سراپا جمال پرندہ، ایک دم فضا سے اترا اور نور محمد کی گود میں

آ گرا۔[۲۲] خواب سچے بھی ہوتے ہیں۔ چند روز بعد شیخ نور محمد کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا، یہ اس سچے خواب کی تعبیر تھی۔ خواب؛ اقبال مندی کا تھا۔ خواب کی تعبیر کے دن نومبر کی ۹ تاریخ تھی اور سنہ ۱۸۷۷ء، اس کا نام بجا طور پر ''محمد اقبال'' رکھا گیا۔

۴

اقبال کی والدہ امام بی کا تعلق سمبڑیال ضلع سیالکوٹ کے ایک کشمیری گھرانے سے تھا۔ وہ ایک نیک دل، سلیقہ شعار اور دین دار خاتون تھیں۔ بالکل ان پڑھ تھیں، مگر اُن کی معاملہ فہمی، حسنِ سلوک اور جذبۂ خدمتِ خلق کی وجہ سے پورا محلہ ان کا گرویدہ تھا۔ بسا اوقات عورتیں اپنے زیور ان کے پاس امانتاً رکھ جاتیں۔ محلے یا برادری کے گھرانوں میں کوئی اختلاف ہو جاتا یا کوئی جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوتا تو بے جی کی طرف رجوع کیا جاتا اور وہ اس خوش اسلوبی کے ساتھ فیصلہ صادر کرتیں کہ فریقین مطمئن ہو جاتے۔[۲۳] بے جی ہمیشہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اور اعانت کے لیے تیار رہتیں۔ قدرت نے انھیں غریب پروری اور خدمتِ خلق کا غیر معمولی جذبہ ودیعت کیا تھا۔ وہ خاموشی سے مستحق خواتین کی مدد کیا کرتیں۔ امداد کرنے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ وہ محلے برادری کے غریب مگر شریف گھرانوں کی دس بارہ سال کی تین چار بچیاں اپنے گھر لے آتیں اور ان کی کفالت کرتیں۔ بچیاں گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹاتیں اور اس کے ساتھ ہی بے جی سے قرآن پاک، نماز، ضروری دینی تعلیم، اردو لکھنا پڑھنا، کھانا پکانا اور سینا پرونا بھی سیکھتیں۔ بے جی اپنی ہی بچیوں کی طرح ان کی پرورش کرتیں۔ کچھ مدت بعد مناسب رشتہ تلاش کر کے ان کا بیاہ کر دیتیں۔ یوں محسوس ہوتا جیسا اپنی ہی بیٹیوں کو رخصت کر رہی ہوں۔[۲۴] تربیت بھی وہ نہایت ذمہ داری سے کرتیں اور اس سلسلے میں ہمیشہ چوکنا رہتیں۔ بچیوں کے گھر سے باہر جانے اور قریبی اعزہ سے ملنے ملانے کے علاوہ، وہ بچوں پر بھی کڑی نظر رکھتیں۔ بقول شیخ اعجاز احمد: تربیت کے معاملے میں وہ ایک آمر سے کم نہ تھیں۔[۲۵]

ایسی والدہ کے گہوارۂ تربیت میں پرورش پانے والے بچے کو اقبال مند اور ماہ و انجم کا ہم قسمت ہونا ہی تھا:

تربیت سے تیری مَیں، انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا[۲۶]

۵

شیخ نور محمد، امام بی بی اور میر حسن ـــــ اقبال، ان تین نیک طینت ہستیوں کے پروردہ اور تربیت یافتہ تھے۔ اقبال کے کرم فرما، لسان العصر حضرت اکبرالہ آبادی نے، برسوں بعد والدۂ اقبال کا جو مرثیہ لکھا، اُس میں نہایت صحیح بات کہی کہ اقبال کی شخصیت میں جو خوبیاں تھیں: حق شناسی، خوش خوئی، ذوقِ معرفت، خودداری، تمکنت وغیرہ، ان کا بنیادی سبب یہ تھا کہ اُن کے والدین ''ابرار'' تھے اور اقبال کی ذات میں انھی کا فیضِ تربیت جلوہ گر تھا:

حضرتِ اقبال میں جو خوبیاں پیدا ہوئیں
قوم کی نظریں جو ان کے طرز کی شیدا ہوئیں
یہ حق آگاہی ، یہ خوش گوئی ، یہ ذوقِ معرفت
یہ طریقِ دوستی ، خودداریِ باتمکنت
اس کے شاہد ہیں کہ ان کے والدین ابرار تھے
باخدا تھے ، اہلِ دل تھے ، صاحب اسرار تھے
جلوہ گر ان میں ، انھی کا ہے یہ فیضِ تربیت
ہے ثمر اس باغ کا یہ طبعِ عالی منزلت [۲۷]

شیخ نور محمد اپنے اقبال مند بیٹے کی تربیت کے لیے کس قدر سنجیدہ اور کوشاں رہے ہوں گے، اس کا اندازہ دو ایک واقعات سے لگایا جا سکتا ہے:

ایک واقعہ تو وہ ہے جس کا ذکر اقبال نے سب سے پہلے ۱۹۳۴ء کے سفر افغانستان سے واپس آتے ہوئے، اپنے عزیز دوست اور رفیقِ سفر سید سلیمان ندوی سے کیا تھا۔ بعد ازاں نذیر نیازی کو بھی یہی واقعہ سنایا تھا کہ جب مَیں سیالکوٹ میں پڑھتا تھا تو نمازِ فجر کے بعد قرآن مجید کی تلاوت میرا معمول تھا۔ والد صاحب اپنے اوراد و وظائف سے فارغ ہو کر مسجد سے گھر آتے اور مجھے تلاوت کرتا دیکھ کر، اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ ایک روز نمازِ فجر کے بعد حسب معمول تلاوت میں مصروف تھا کہ والد صاحب میرے پاس سے گزرے۔ فرمایا: کبھی فرصت ملی تو میں تمھیں ایک بات بتاؤں گا۔ کچھ مدت بعد اسی طرح مسجد سے آ کر میرے پاس بیٹھ گئے۔ میں تلاوت کرتے کرتے رک گیا۔ وہ فرمانے لگے: تم کیا پڑھ رہے ہو؟ مجھے ان کے اس سوال پر تعجب ہوا اور کچھ ملال بھی، کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ میں قرآن مجید کی تلاوت کر رہا ہوں۔ بہرحال میں

نے بڑے ادب سے جواب دیا: قرآن مجید۔ کہنے لگے: تم جو کچھ پڑھتے ہو، اسے سمجھتے بھی ہو؟ کہا: کیوں نہیں، کچھ نہ کچھ سمجھ لیتا ہوں۔ والد صاحب خاموش ہوئے اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ مَیں سوچتا رہا: اس سوال جواب کا مقصد کیا تھا؟

چند دن گزر گئے۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ اس واقعے کو چھٹا روز تھا۔ حسبِ معمول میں تلاوت کر رہا تھا کہ والد صاحب مسجد سے آئے اور جب میں نے تلاوت ختم کر لی تو مجھے بلایا اور اپنے پاس بٹھا کر بڑی نرمی سے کہنے لگے: بیٹے! قرآن مجید وہ شخص سمجھ سکتا ہے جس پر اس کا نزول ہو۔ جب تک تم یہ نہ سمجھو کہ قرآن مجید تمھارے قلب پر بھی اسی طرح اتر رہا ہے جیسے رسول اللہؐ کے قلبِ اقدس پر نازل ہوا تھا تو تلاوت کا مزہ نہیں اور تم قرآن مجید کو پوری طرح سمجھ بھی نہیں سکتے ہو۔ اگر تم تلاوت اس طرح کرو، جیسے یہ تم پر نازل ہو رہا ہے یعنی اللہ خود تم سے ہم کلام ہے تو یہ تمھاری رگ و پے میں سرایت کر جائے گا۔

اقبال کہتے ہیں کہ والد صاحب کی باتوں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن مجید دل کے راستے بھی انسانی شعور میں داخل ہوتا ہے۔[۲۸]

بالِ جبریل (ص ۷۸) کا یہ شعر، اسی واقعے کی یاد دلاتا ہے:

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی، نہ صاحبِ کشاف

شیخ نور محمد کے اندازِ تربیت کے ایک اور واقعے کا ذکر اقبال نے رموزِ بے خودی میں کیا ہے۔ مثنوی کے متعلقہ حصے کا عنوان ہے: ''در معنیِ ایں کہ حسنِ سیرتِ ملیہ از تادّب بآدابِ محمدیہ است'' یعنی اس مضمون کی وضاحت میں کہ ملتِ اسلامیہ کا حسنِ سیرت و کردار، آدابِ محمدیہؐ کی اِتباع میں ہے۔

علامہ بتاتے ہیں کہ میرا لڑکپن کا زمانہ تھا، بلکہ آغازِ شباب۔ ایک روز ایک بھکاری ہمارے گھر کے دروازے پر آیا اور اونچی اونچی آواز میں بھیک مانگنے لگا۔ میں نے چاہا کہ وہ ٹل جائے، مگر وہ پیہم صدا بلند کرتا رہا۔ مجھے غصہ آ گیا اور جوشِ جذبات میں اچھے برے کی تمیز نہ رہی۔ مَیں نے اس کے سر پر ایک لاٹھی دے ماری۔ اُس نے ادھر اُدھر سے بھیک مانگ کر جو کچھ بھی جمع کیا تھا، وہ اُس کی جھولی سے زمین پر گر گیا۔ والد صاحب یہ منظر دیکھ رہے تھے، میری اس حرکت سے بے حد آزردہ ہوئے، چہرہ مرجھا گیا اور ان پر افسردگی چھا گئی۔ ان کے لبوں سے ایک جگر سوز

آہ نکلی اور دل سینے میں تڑپ اٹھا۔ ستارے جیسا ایک آنسو نکلا، پلکوں پر چمکا اور گر گیا۔ یہ دیکھ کر مجھے سخت ندامت ہوئی کہ میں نے والد کو سخت تکلیف پہنچائی۔ اپنی اس حرکت پر بے قرار بھی ہوا (کہ اب تلافی کیسے ہو؟) اسی کیفیت میں والدِ ماجد کہنے لگے: اُمتِ مسلمہ کل اپنے آقا رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے سامنے جمع ہوگی۔ ان میں ہر طبقے کے لوگ ہوں گے: غازی، حفاظِ حدیث، شہدا، اکابرِ امت، زاہد، عالم اور گنہگار بھی۔ اس موقع پر اس دردمند گداگر کی صدا بلند ہوگی (وہ فریاد کرے گا کہ مجھ سے ایک نوجوان نے زیادتی کی ہے)۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے مخاطب ہوں گے:

حق جوانے مسلمے با تو سپرد
کو نصیبے از دبستانم نبرد
از تو ایں یک کارِ آساں ہم نہ شد
یعنی آں انبارِ گِل آدم نہ شد[۲۹]

(حق تعالیٰ نے ایک مسلمان نوجوان کو تیرے سپرد کیا کہ تو اسے صحیح تعلیم و تربیت دے لیکن اس نوجوان نے میری ادب گاہ سے کوئی سبق نہ حاصل کیا۔ [حضورؐ فرمائیں گے کہ] تو اس آسان سے کام کو بھی انجام نہ دے سکا، یعنی ایک تودۂ مٹی کو آدمی نہ بنا سکا۔)

والد نے فرمایا کہ اگرچہ آنحضورؐ، اس ملامت میں بھی نرم گفتار ہی ہوں مگر میں تو سخت خفیف اور شرمندہ ہوں گا اور امید و بیم میں گرفتار رہوں گا۔ پھر مجھے مخاطب ہو کر کہا: بیٹا! ذرا سوچو اور رسولؐ اللہ کی امت کے جمع ہونے کا منظر تصور میں لاؤ، پھر میری یہ سفید داڑھی دیکھو اور میرے امید و بیم کے لرزے کو نگاہ میں رکھو۔ اس کے بعد دردمندانہ لہجے میں کہنے لگے:

بر پدر ایں جورِ نازیبا مکن   پیشِ مولا بندہ را رسوا مکن
غنچہ ای از شاخسارِ مصطفیٰ   گل شو از بادِ بہارِ مصطفیٰ
از بہارش رنگ و بو باید گرفت   بہرۂ از خلقِ اُو باید گرفت[۳۰]

(دیکھو، بیٹا! اپنے باپ پر یہ نازیبا ظلم نہ کرو اور آقا کے سامنے غلام کو رسوا نہ کرنا۔ تو شاخسارِ مصطفیٰ کا ایک غنچہ ہے۔ حضورؐ ہی کی نسیمِ بہار سے شگفتہ ہو کر پھول بن جا۔ تجھے آپؐ کی بہار سے رنگ و بو حاصل کرنی چاہیے اور تجھے آپؐ کے خلقِ عظیم کی اتباع کرنی چاہیے۔)

وجوہات تو اور بھی ہیں، مثلاً اقبال گھرانے کی دین سے گہری وابستگی، مذہبی شعائر کی پابندی،

والدۂ اقبال کا جذبۂ خدمتِ خلق؛ پھر علامہ میر حسن کی تربیت اور خود اقبال کے والد شیخ نور محمد کا روحانی مزاج، نیک نفسی اور پرہیزگاری وغیرہ لیکن راقم کی دانست میں یہی وہ واقعہ ہے، جس نے اقبال کے قلب و ذہن میں آخرت میں جواب دہی کے احساس وشعور کو بیدار کیا اور اُن کے نیک طینت والد نے اپنی دل سوز اور دردمندانہ گفتگو اور پند و نصیحت کے ذریعے، ان کے دل میں محبتِ رسول کا بیج بویا۔ اقبال کی شاعری اور شخصیت میں یہ بیج ایک تن آور، اور بلند و بالا اور اطراف میں خوب پھیلی ہوئی شاخوں والا گھنا درخت بن کر نمودار ہوا۔

عین ممکن ہے اقبال کے لڑکپن میں اسی طرح کے کچھ اور واقعات بھی رونما ہوئے ہوں۔

حوالے اور حواشی

۱۔ زندہ رُود، ص ۲۶

۲۔ صحیفہ، اقبال نمبر، اول، اکتوبر ۱۹۷۳ء ص ۴۔ زندہ رُود، ص ۲۶-۲۸

۳۔ عروجِ اقبال، ص ۶، ۷

۴۔ فوق بحوالہ عروجِ اقبال، ص ۷

۵۔ زندہ رُود، ص ۲۹

۶۔ تاریخ اقوامِ کشمیر، بحوالہ زندہ رُود، ص ۳۱

۷۔ ایضاً

۸۔ بحوالہ: زندہ رُود، ص ۳۴۔ زندہ رُود میں مزید روایات کی روشنی میں سکھوں کے مظالم کی مزید تفصیل بھی دی گئی ہے۔

۹۔ بانگِ درا، ص ۲۳۰

۱۰۔ زندہ رُود، ص ۳۴-۳۵

۱۱۔ مظلوم اقبال، ص ۲۲۔ دما دم رواں ہے ...... ص ۱۷۔ زندہ رُود، ص ۳۲

۱۲۔ زندہ رُود، ص ۴۰

۱۳۔ روایاتِ اقبال، ص ۳۲۔ زندہ رُود، ص ۴۰

۱۴۔ زندہ رُود، ص ۴۰

۱۵۔ عروجِ اقبال، ص ۱۲

۱۶۔ ذکرِ اقبال، ص ۸

۱۷۔ اقبال کے حضور، ص ۱۶۹، ۱۷۰ وغیرہ

۱۸۔ عروجِ اقبال، ص ۱۴؛ زندہ رُود، ص ۴۰

۱۹۔ عروجِ اقبال، ص ۱۱

۲۰۔ بحوالہ عروجِ اقبال، ص ۱۷
۲۱۔ روز گارِ فقیر، دوم، ص ۱۲۷-۱۲۸
۲۲۔ ذکرِ اقبال، ص ۱۰
۲۳۔ مظلوم اقبال، ص ۳۹
۲۴۔ زندہ رُود، ص ۴۰۔ مظلوم اقبال، ص ۴۰-۴۱
۲۵۔ مظلوم اقبال، ص ۴۰
۲۶۔ بانگِ درا، ص ۲۲۹
۲۷۔ روز گارِ فقیر، دوم، ص ۲۳-۲۴
۲۸۔ اقبال کے حضور، ص ۶۰-۶۱۔ زندہ رُود، ص ۸۸
۲۹۔ اسرار و رموز، ص ۱۳۱
۳۰۔ ایضاً

❖......❖......❖

(۲)

وہ شمعِ بارگہِ خاندانِ مرتضوی

مولوی غلام حسین سیالکوٹ کے ایک معروف اور جید عالم دین تھے، مسلکاً اہل حدیث تھے۔ اقبال، ان کے مکتب واقع مسجد شوالہ تیجا سنگھ میں ناظرہ قرآن شریف پڑھنے جایا کرتے تھے۔[1] ایک روز میر حسن وہاں آئے اور مولوی غلام حسین سے گفتگو کرنے لگے۔ اس اثنا میں اُن کی نظر مولوی صاحب کے ایک شاگرد محمد اقبال پر پڑی۔ شاید اقبال کے چہرے مہرے میں کوئی خاص بات تھی، جس نے میر حسن کو متاثر کیا۔ پوچھا: ''یہ کس کا لڑکا ہے؟''

''شیخ نور محمد کا''۔ نور محمد، میر حسن کے قریبی دوستوں میں شامل تھے۔ جب ملاقات ہوئی تو کہا: اپنے بچے کو میرے پاس بھیجو۔

نور محمد کو کچھ تامل ہوا۔ کیوں؟ مولوی غلام حسین کی تعلیم میں کچھ خرابی یا کمی ہے؟ مگر میر حسن کا اِصرار غالب آیا۔ اقبال کو ان کے مکتب میں بٹھا دیا گیا، جو اُن کے گھر کے قریب ہی کوچہ میر حسام الدین میں واقع تھا۔[2] شاگرد ذہین تھا اور ہونہار؛ اُستاد بھی سیکڑوں، بلکہ ہزاروں میں ایک تھا۔ میر حسن نے توجہ سے پڑھایا اور اقبال نے دل لگا کر پڑھا۔ اِسی اثنا میں مولوی میر حسن سکاچ مشن سکول سے وابستہ ہو گئے۔ اقبال بھی اسکول میں داخل کرا دیے گئے۔ یہ اقبال کے بچپن کا زمانہ تھا۔ ان کا بیشتر وقت میر حسن کے ساتھ ہی بسر ہوتا تھا، مگر یہ مولوی میر حسن تھے کون؟

۱

میر حسن کے تعارف کے بغیر، اقبال کا ہر تذکرہ نامکمل رہے گا۔ اقبال؛ شیخ نور محمد عرف نتھو اور امام بی جیسے پاکیزہ صفت والدین کے بیٹے تھے، مگر ان کی خوش بختی کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ انھیں میر حسن جیسا سرپرست اور باکمال استاد ملا۔ میر حسن جیسے نابغہ روزگار اور مثالی استاد کی شاگردی کسی بھی لڑکے کے لیے باعثِ عزت و افتخار ہو سکتی ہے۔ اقبال تو پھر اقبال تھے..... ''دیر سے آنے'' والا اقبال۔ اصل میں قدرت جب نوازنے پر آتی ہے تو یکے بعد دیگرے طرح طرح

کے انعامات سے نوازتی چلی جاتی ہے۔

علامہ سید میر حسن کا ایک مختصر تعارف ڈاکٹر جاوید اقبال نے کرایا ہے، لکھتے ہیں: ''اقبال کی ابتدائی طالب علمانہ زندگی پر سید میر حسن (۱۸۴۴ء۔۱۹۲۹ء) کی شخصیت حاوی ہے۔ سید میر حسن ایک روشن فکر اہل علم تھے، جو مصالح دین اور مصالح دنیا کو ایک ساتھ پیش نظر رکھ کر شاگردوں کی تربیت کرتے تھے۔ وہ نہ صرف علوم اسلامی اور عرفان و تصوف سے آگاہ تھے بلکہ علوم جدیدہ، ادبیات، لسانیات، اور ریاضیات کے بھی ماہر تھے۔ ان کے پڑھانے کا انداز ایسا تھا کہ اپنے شاگردوں میں اردو، فارسی اور عربی کا فصیح لسانی ذوق پیدا کر دیتے۔ انھیں عربی، فارسی، اردو اور پنجابی کے ہزاروں اشعار از بر تھے۔ فارسی کے کسی شعر کی تشریح کرتے وقت وہ اس کے مترادف اردو اور پنجابی کے بیسوں اشعار پڑھ ڈالتے تا کہ اس کا مطلب پوری طرح ذہن نشین ہو جائے۔ اپنی تدریسی مصروفیات کے باوجود مسلسل اور متواتر مطالعہ بھی جاری رکھتے۔ وہ ایک راسخ العقیدہ اور عبادت گزار مسلمان تھے۔ مجسم اخلاق تھے۔ عام طور پر نہایت فصیح اور سلجھی ہوئی اردو میں بات چیت کرتے۔ سادگی، سنجیدگی، استغنا، تواضع، خوش طبعی اور احسان مندی ان کے مزاج کی نمایاں خصوصیات تھیں۔''[۳]

میر حسن کے معمولات کا آغاز نمازِ تہجد سے ہوتا۔ نمازِ فجر کے بعد قبرستان جاتے۔ اپنی ہمشیرہ اور دیگر عزیزوں، رشتہ داروں کی قبروں پر فاتحہ پڑھتے۔ واپسی پر ان کے بعض شاگرد، ان کے ہم رکاب ہو جاتے اور سبق سنانا شروع کر دیتے۔ گھر پہنچتے تو بہت سے لڑکے جمع ہو چکے ہوتے۔ اپنا اپنا آموختہ دُہراتے۔ پھر باری باری میر حسن کو سبق سناتے، نیا سبق لے کر اُسے یاد کرتے۔ میر حسن کی بیٹھک ''گویا دبستاں کھل گیا'' کا منظر پیش کرتی۔ کوئی بغدادی قاعدہ پڑھ رہا ہے تو کوئی قرآن پاک، ایک لڑکا حکایاتِ سعدی کا سبق لے رہا ہے، دوسرے کو میر حسن شاعری کے رموز سمجھا رہے ہیں[۴] اگر ہم اپنے تخیل سے کام لیں تو اس مکتب کا منظر کچھ یوں ہوگا:

میر حسن باری باری ایک [ایک لڑکے] کو اپنے پاس بلاتے کہ وہ اپنی کتاب کا کوئی حصہ انھیں پڑھ کر سنائے۔ جب وہ پڑھ رہا ہوتا تو اُسے مشکل الفاظ کے معنی بتاتے رہتے۔ پورا حصہ ختم ہو جاتا تو پوچھتے: اس ساری بات کا کیا مطلب ہوا؟ بعض اوقات کسی شعر کا مطلب واضح کرنے کے لیے ان کے ہم معنی اردو، فارسی اور پنجابی کے اشعار بھی سناتے تھے۔[۵]

سکول کا وقت قریب آتا تو یہ مکتب اگلے روز تک کے لیے بند ہو جاتا۔ میر حسن جلدی جلدی

کھانا کھاتے اور سکول روانہ ہو جاتے۔ بہت سے لڑکے بھی اپنے استاد کے ساتھ ہی سکول چل دیتے، کچھ پوچھتے یا سناتے اور بعض اپنے گھروں سے ہو کر، سکول پہنچ جاتے۔ اقبال بھی سکول جانے والوں میں شامل ہوتے۔

دوپہر تک یا کبھی سہ پہر تک کا وقت سکول میں گزرتا۔ وہاں اقبال، میر حسن کے علاوہ، متعدد دوسرے اساتذہ سے بھی درس لیتے۔ سکول سے چھٹی ہوتی تو دوسرے لڑکوں کی طرح وہ بھی اپنے گھر پہنچتے، جلدی جلدی کچھ کھا پی کر، اپنے محبوب استاد کے گھر کی راہ لیتے، جہاں ان کے دو ہم عمر، ہم جولی استاد زادے (تقی شاہ اور ذکی شاہ) ان کے منتظر ہوتے۔ کیا لطف تھا اس دوستانہ مصاحبت میں۔ مجلس آرائی ہوتی اور گپ بازی بھی۔ اقبال بعد دوپہر اور شام کا سارا وقت اِنھی ہم جولیوں کے ساتھ گزارتے تھے۔[۱] ہم عمر اور ہم ذوق دوستوں کے درمیان وقت گزارنا لڑکپن اور نوجوانی کا شاید سب سے دل چسپ اور پُرمسرت مشغلہ ہوتا ہے۔ یوں تو ان لڑکوں کی کئی ایک دل چسپیاں مشترک تھیں، مگر سب کا ایک بڑا مشغلہ کبوتر بازی کا تھا۔ سید تقی شاہ کا بیان ہے کہ ایک بار ہم نے کبوتر خریدے تو اقبال نے اس خوشی میں تک بندی کی۔ سید تقی شاہ نے مندرجہ ذیل پانچ مصرعے نقل کیے ہیں:

دل میں آئی جو تقی کے، تو کبوتر پالے
جمع لا لا کے کیے، لال، ہرے، مٹیالے
ان میں ایسے ہیں جو ہیں پہروں کے اڑنے والے
اب یہ ہے حال کہ آنکھیں ہیں کہیں، پاؤں کہیں
پاؤں کے نیچے، نہ معلوم، زمیں ہے کہ نہیں![۲]

مگر یہ نہیں کہ لڑکے سارا وقت مجلس آرائی یا کبوتر بازی کی نذر کر دیتے ہوں۔ میر حسن کی موجودگی میں ممکن نہ تھا کہ وہ اپنی تعلیم یا اپنے اسباق سے غافل ہو جائیں۔ میر حسن لڑکوں کو تفریح کا موقع بھی دیتے ہوں گے، مگر تعلیم کا سلسلہ رات گئے تک جاری رہتا۔ دراصل میر حسن کل وقتی استاد تھے۔ محنتی اور شوقین طلبہ انھیں ہر وقت گھیرے رہتے۔ ذکی شاہ کہتے ہیں: والد صاحب کا مشغلہ تعلیم و تدریس کے سوا کچھ نہ تھا۔ شاگردوں سے وقت مقرر کر لیے جاتے تھے۔ سکول اور کالج جاتے اور آتے پڑھاتے تھے۔ میر حسن بازار سے سودا سلف لینے کے لیے گھر سے نکلتے تو اس وقت بھی کوئی نہ کوئی طالب علم کتاب لیے ساتھ ہو جاتا، کچھ نہ کچھ پڑھتا جاتا۔ اپنائیت کے ایسے ماحول میں

اقبال کو اپنا وقت گزارنے میں کوئی تامّل، کوئی جھجک یا کوئی پریشانی نہ تھی۔ میر حسن کے ہاں رہنے میں اقبال کو اپنے والدین کی تائید بھی حاصل تھی۔ شیخ نور محمد کو پورا اطمینان تھا کہ اقبال؛ میر حسن کی نگرانی میں جو وقت گزارتا ہے، وہ ضائع نہیں ہو رہا۔

اقبال؛ میر حسن کی اس تربیت گاہ سے، غالباً سب سے زیادہ فائدہ اٹھانے والوں میں سے تھے۔ سکول کے اسباق وہ بخوبی تیار اور یاد کر لیتے تھے۔ مزید برآں یہاں ان کا فطری ذوقِ شعری آہستہ آہستہ پرورش پا رہا تھا۔ ذکر آ چکا ہے کہ میر حسن شعر و ادب کا نہایت عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ عربی، فارسی، اردو اور پنجابی کے ہزاروں شعر ان کے نوکِ زبان تھے۔ حسبِ ضرورت برمحل شعر پڑھتے۔ اقبال کو اپنے ذوقِ شعری کی تربیت کے لیے نہایت سازگار ماحول ملا تھا۔

دراصل اس دور میں تربیت؛ تعلیم و تدریس کا لازمی جُز تھی۔ اس تربیت میں بہت کچھ شامل تھا۔ معاشرت کے ادب و آداب، مجلس کے طور اطوار، ذمہ داری کا احساس، اساتذہ کا احترام۔ حسنِ اخلاق کی تعلیم، تربیت اور ہدایت و راہ نمائی کی غایت انسان سازی کے سوا کچھ نہ تھی۔ غرض اقبال نے دبستانِ میر حسن سے بہت کچھ سیکھا، بہت کچھ پایا اور بعد میں اس کا اعتراف شعری زبان میں یوں کیا:

وہ شمع بارگہِ خاندانِ مرتضوی
رہے گا مثلِ حرم ،جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے، کھلی میری آرزو کی کلی
بنا یا جس کی مروّت نے نکتہ داں مجھ کو [۸]

علامہ میر حسن بچوں کو ہمیشہ حصولِ علم کی طرف راغب کرتے، اکساتے، جہاں تک اور جس طرح بھی ممکن ہوتا، ان کی مدد کرتے۔ بعض نالائق طلبہ کو بھی انھوں نے تعلیم کی طرف مائل کیا اور اس طرح ان کی زندگی سنوار دی۔ ایک طالب علم جو مدرسہ چھوڑ کر شاید بددل ہو کر تعلیم ترک کر چکا تھا، اسے بلایا، زندگی میں علم کی اہمیت بتائی، حصولِ علم کی ترغیب دی اور پھر اس توجہ اور محبت سے اسے پڑھایا اور اس میں حصولِ علم کا ذوق و شوق پیدا کیا کہ وہ کامیابی کے ساتھ مختلف تعلیمی مراحل طے کرتا گیا اور عملی زندگی میں کامیاب رہا۔ پوسٹ ماسٹر جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہوا۔ نام تھا اس کا: حاکم رائے۔

طلبہ کی خیر خواہی اور انھیں تعلیم دینے میں سید میر حسن؛ ہندو مسلم یا عیسائی کا امتیاز روا نہ

رکھتے۔ ہر طرح کے طالب علم ان کے ہاں آتے، ایک سرچشمۂ فیض تھا جس سے سبھی سیراب ہوتے تھے۔

میر حسن کی زندگی اور ان کی معاشرت بہت سادہ تھی۔ کھدر کے معمولی کپڑے پہنتے مگر صاف ستھرے، سر پر پگڑی باندھتے، ظاہراً روایتی وضع قطع رکھتے تھے۔ انھیں دیکھنے والا ''اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ'' کا تاثر لیتا، مگر وہ بہت سمجھدار اور دانش مند شخص تھے۔ وقت کے بے حد پابند تھے، اور وقت کی تنظیم اور تقسیم ان پر ختم تھی۔ روایت ہے کہ وہ ٹھیک وقت پر سکول پہنچتے اور بسا اوقات چپڑاسی انھیں آتا دیکھ کر سکول کی گھنٹی بجا دیتا۔ ایک بار کسی نے پوچھا: ''آپ کس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں؟'' فرمایا: ''مَیں مسلمان ہوں۔'' وہ ہر طرح کے تعصب سے بالاتر تھے۔ فقط ظاہراً ہی دین دار نہ تھے، اسلام کا حقیقی شعور رکھتے تھے۔ دوسروں پر نکتہ چینی سے گریز کرتے۔ ایسے باکمال استاد کی قدر افزائی کرنے والے بھی موجود تھے۔ سکاچ مشن سکول میں انھیں ہمیشہ عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا۔ ان کا نام سکول کے رجسٹر میں سب سے اوپر لکھا ہوتا اور جب وہ ملازمت سے سبک دوش ہوئے تو انھیں تاحیات پوری تنخواہ بطور پنشن دی جاتی رہی۔

ان کی سب سے بڑی دلچسپی تعلیم تھی اور درس و تدریس۔ اپنے ماحول اور گرد و پیش کا مکمل ادراک اور وژن رکھنے والے ——— یہ تھے اقبال کے استاد۔ اقبال کو احساس تھا کہ مجھے میر حسن جیسا باکمال استاد ملا ہے۔ اس کا اعتراف اس طرح کیا ہے:

مجھے اقبال ، اس سید کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اس کے دامن میں ہیں ، وہ کچھ بن کے نکلے ہیں [9]

اقبال؛ اپنے والد کی توجہ اور میر حسن کی تعلیم سے برابر فیض یاب ہوتے رہے۔ ذہین تھے۔

میر حسن علمی فضیلت، وقت کی پابندی، حسنِ کردار کی وجہ سے اساتذہ اور طلبہ میں یکساں طور پر مقبول و محترم اور ہر دل عزیز تھے۔ شاگرد دل و جان سے ان کا احترام کرتے اور ان سے عقیدت رکھتے تھے۔ میر حسن کو بھی اپنے شاگردوں سے محبت تھی۔ انھیں گورنمنٹ کالج لاہور بلکہ گورڈن کالج راولپنڈی اور علی گڑھ یونی ورسٹی سے بھی پرکشش تنخواہ کی پیش کش ہوئی، مگر وہ مشن کالج کو چھوڑ کر کہیں اور جانے پر رضا مند نہ ہوئے۔[10] یہ استغنا اُن کے مزاج کا خاصہ تھا، جو اقبال کی طبیعت میں بھی منتقل ہوا۔ انسان سازی میں جس طرح کی تعلیم، تربیت اور ماحول کی ضرورت ہوتی ہے، قدرت نے انھیں وہ سب کچھ بڑی فیاضی سے عطا کیا تھا۔ مشنری سکولوں کے سربراہ بالعموم

پادری ہوتے تھے۔ ان لوگوں کا اولین مقصد فروغ عیسائیت تھا۔ یہ اقبال کی خوش قسمتی تھی کہ سکاچ مِشن کے لوگ نِرے پادری نہ تھے بلکہ ان کے بیشتر اساتذہ فرض شناس، طلبہ کے خیر خواہ اور اخلاق کریمانہ سے متصف تھے۔ ان اساتذہ نے ایثار و خدمت کی ایسی روایت قائم کی اور ان کی مذہبی رواداری سے آزادیِ فکر اور اخوت و یگانگت کی ایسی فضا پیدا ہو گئی کہ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی طلبہ؛ سب ایک ہی گھرانے کے افراد کی طرح گھل مل کر رہتے تھے۔[۱۱]

چونکہ اساتذہ صاحبِ کردار تھے، اس لیے طلبہ پر اُن کی نیک سیرت کے اثرات مرتب ہونا فطری بات تھی۔ اس زمانے کے پرنسپل واخ اپنی دیانت داری اور فرض شناسی کے باعث ایک مثالی استاد تھے۔ روایت ہے کہ جب وہ ایک آنے میں روشنائی کی بوتل خریدتے تو کالج کے حساب میں صرف نصف آنہ یعنی دو پیسے لکھتے اور باقی دو پیسے اپنے حساب میں شامل کرتے، کیونکہ دفتری کاموں کے علاوہ اس روشنائی کو کبھی کبھی وہ اپنی نجی مراسلت میں بھی استعمال کر لیتے تھے۔[۱۲]

اقبال ایک طرف تو میر حسن کی تعلیم و تربیت سے برابر فیض یاب ہوتے رہے، دوسری طرف ان کی سر پرستی اور نگرانی میں سکاچ مشن سکول کے فرض شناس اور باکردار اساتذہ کی شاگردی میں تعلیم کی منازل طے کرتے رہے۔ ان کی سیرت پر میر حسن اور سکول کے اساتذہ نے ایک گہرا نقش بٹھا دیا تھا۔

یہ ذکر آچکا ہے کہ لڑکپن بلکہ بچپن ہی سے اقبال کی طبیعت میں شعر و سخن کی طرف ایک فطری میلان موجود تھا۔ وہ موزوں طبع تھے۔ سکول کے ایک ایسے لڑکے کی طبیعت میں، جو آگے چل کر ''شاعرِ مشرق'' بننے والا تھا، موزونیِ طبع، احساسِ جمال اور نکتہ آفرینی اچنبھے کی بات نہ تھی، البتہ اس کے ہم جماعتوں اور ہم جولیوں نے اپنے جیسے اس لڑکے کی شعر گوئی کو قدرے عجیب محسوس کیا ہوگا، کیونکہ بظاہر وہ ایک مختلف اندازِ طبیعت رکھنے والا لڑکا تھا۔ وہ لڑکا (اقبال) بازار میں بکنے والے پنجابی قصوں کو بڑی دلچسپی سے سنتا اور پھر انھیں خرید لاتا اور گھر کی خواتین کے سامنے خوش الحانی سے پڑھتا۔ اس کی عمر بمشکل ۱۰، ۱۲ برس تھی۔[۱۳]

اصل میں وہ بچپن ہی سے خوش آہنگ تھے۔ انھیں قرآن مجید بھی خوش الحانی سے پڑھنے کی عادت تھی۔[۱۴] (جب تک آواز جواب نہ دے گئی، یہ عادت قائم رہی۔) بعض اوقات قصہ پڑھتے پڑھتے، وہ اپنی طرف سے بھی کوئی مصرع اس میں جڑ دیتے جو بہت مؤثر اور خوبصورت ہوتا۔ گویا اقبال کے ہاں ابتدا ہی سے بدیہہ گوئی کے آثار موجود تھے، مثلاً: ایک روز اقبال میر حسن کے ساتھ کہیں

جا رہے تھے۔ میر حسن کا بھانجا احسان بھی ساتھ تھا۔ ابھی بچہ ہی تھا مگر خوب تندرست و توانا، بوجھل محسوس ہوا، چنانچہ تھوڑی دور چل کر اقبال نے اسے گود سے اتار دیا۔ میر حسن نے دیکھا تو کہنے لگے: ''اس کی برداشت بھی دشواری ہے۔'' یہ موزوں جملہ ہے۔ اقبال نے بھی جواباً ایک موزوں جملہ کہا: ''تیرا احسان بہت بھاری ہے۔''[۱۵] دراصل میر حسن کی صحبت نے ان کے شعر گوئی کے میلانِ طبعی کو اور بڑھا دیا تھا۔ یہ ذکر آ چکا ہے کہ میر حسن دورانِ تدریس بھی اپنے طلبہ کو موقع محل کے مطابق بکثرت اشعار سنایا کرتے تھے۔

ایک اور چیز بھی اقبال کے میلانِ شعر گوئی میں اضافے کا سبب بنی، اور وہ تھی: فارسی زبان کی تحصیل میں ان کی غیر معمولی محنت و کاوش۔ وہ کہتے ہیں کہ فارسی سیکھنے میں، میں نے سخت محنت کی اور متعدد اساتذہ سے استفادہ کیا۔[۱۶]

یہی زمانہ تھا جب انھوں نے کبوتروں کے متعلق فی البدیہہ چند مصرعے موزوں کیے۔ (یہ مصرعے گذشتہ صفحات میں درج کیے جا چکے ہیں۔) یہ ان کی مشقِ سخن کا قدیم ترین دستیاب نمونہ ہے۔ بہر حال اپنے طبعی میلان کی بنا پر شعر و شاعری سے ان کی دلچسپی رفتہ رفتہ زیادہ ہوتی گئی۔ جب مڈل جماعتوں میں زیرِ تعلیم تھے تو سکول کے تقریری مقابلوں اور بیت بازی کے مقابلوں میں بھی حصہ لینے لگے۔ اپریل ۱۸۹۰ء میں اقبال کو آٹھویں جماعت میں ترقی ملی۔ اس زمانے میں وہ سیالکوٹ کے مقامی مشاعروں میں شریک ہونے لگے تھے۔[۱۷] تخلص اقبالؔ اختیار کیا۔ ۱۸۹۲ء میں اقبال نے مڈل کے امتحان میں اچھے نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔ اپنے سکول میں آرٹس کے طلبہ میں اول رہے۔ اپریل ۱۸۹۲ء میں وہ دسویں جماعت میں پہنچ گئے۔[۱۸]

تعلیم، سکول کی غیر نصابی سرگرمیوں، کبوتر داری اور پتنگ بازی کے ساتھ شعر گوئی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اُن کا اس زمانے کا جو کلام محفوظ رہ گیا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشقِ سخن کے اس ابتدائی زمانے میں، ان کی شاعری بالکل روایتی انداز کی تھی، مثلاً: دہلی کے رسالے زبان (ستمبر ۱۸۹۳ء) میں اُن کی ایک غزل ملتی ہے، جس کے چند اشعار یہ ہیں:

آبِ تیغِ یار تھوڑا سا نہ لے کر رکھ دیا
باغِ جنت میں خدا نے آبِ کوثر رکھ دیا

ہے یقیں، پھر جائے گا جب دیکھ لے گا وہ صنم
غیر کے گھر آج میں نے اپنا بستر رکھ دیا

ہو نہ جائے پردۂ انوارِ حق تیرا نقاب
تو نے گر اس کو اُٹھا کر روزِ محشر رکھ دیا
ہاتھ دھو بیٹھ آبِ حیواں سے خدا جانے کہاں
خضر نے اُس کو چھپا کر اے سکندر رکھ دیا[19]

دراصل یہ غزل زبان کی طرف سے دیے گئے حسب ذیل طرح مصرع پر لکھی گئی تھی:

میرے آگے شکوۂ بے جا کا دفتر رکھ دیا

اس زمانے میں ہندستان بھر میں مرزا داغ دہلوی کی شاعری کا بہت شہرہ تھا۔ نوجوان شاعر اصلاحِ سخن کے لیے اور شاید اصلاحِ سخن سے زیادہ، نسبتِ تلمذ کے لیے داغ سے رجوع کرتے تھے۔ مرزا داغ، نظام دکن کے استاد تھے اور اُن کی شہرت کا یہ بھی ایک اہم سبب تھا۔ انھوں نے اصلاحِ سخن کے سلسلے کو باقاعدہ ایک ادارے کی شکل دے رکھی تھی۔ ملک کے دور دراز حصوں میں پھیلے ہوئے اُن کے شاگرد، خط کتابت کے ذریعے اُن سے اصلاح لیتے تھے۔ اقبال نے بھی انھیں خط لکھا اور چند غزلیں اصلاح کے لیے بھیجیں۔[20]

اگر چہ اقبال کے ابتدائی دور کے کلام پر، داغ کے رنگِ شاعری کے اثرات موجود ہیں مگر وہ نرے مقلد نہ رہے۔ ان کا ذہن انتخابی اور مطالعہ اپنے ہم عمر لڑکوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع تھا۔ روایت ہے کہ اقبال کو بچپن ہی سے مطالعے کا بے حد شوق تھا۔ شادی کے بعد انھوں نے اپنے سسر خان بہادر ڈاکٹر عطا محمد کے ذخیرۂ کتب سے بھی فائدہ اٹھایا۔[21] چنانچہ انٹرمیڈیٹ اور بی اے کے زمانے میں انھوں نے جو غزلیں کہیں، اُن پر نہ صرف داغ بلکہ امیر مینائی اور کسی حد تک غالب کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔[22] اس میں اقبال اپنے مطالعے کے علاوہ میر حسن کے شعری ذوق اور اُن کی علمی تربیت کا بھی دخل ہے۔ بہر حال داغ کی شاگردی کے زمانے میں رسالہ زبان (نومبر ۱۸۹۳ء) میں اُن کی ایک اور غزل چھپی، جس کا مطلع ہے:

کیا مزا بلبل کو آیا شیوۂ بے داد کا
ڈھونڈتی پھرتی ہے اُڑ اُڑ کر جو گھر صیاد کا[23]

یہ زمانہ تھا کہ داغ سے نسبتِ تلمذ کو شعرا اپنے لیے باعثِ فخر و امتیاز سمجھتے تھے۔ اقبال نے بھی اسی لیے داغ کی شاگردی اختیار کی تھی۔ نومبر ۱۸۹۳ء کے رسالے میں ان کی شائع شدہ متذکرہ بالا غزل پر، اُن کے نام کے ساتھ ''تلمیذ بلبلِ ہند حضرت داغ دہلوی'' بھی لکھا ہوا ہے۔

فروری ۱۸۹۴ء کے رسالے زبان میں ان کی وہ مشہور غزل شائع ہوئی، جس کا مقطع ہے:

گرم ہم پر کبھی ہوتا ہے جو وہ بت اقبال
حضرتِ داغ کے اشعار سنا دیتے ہیں[۲۴]

اقبال کا ابتدائی کلام روایتی ہونے کے باوجود، نو آموز اور نو مشق شاعروں سے کہیں زیادہ پختہ تھا۔ اس میں انفرادیت، ندرت اور پختہ گوئی کی علامات نظر آتی تھی۔ چنانچہ داغ نے جلد کہہ دیا کہ کلام میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے۔ اور یہ سلسلہ شاگردی کا بہت دیر قائم نہیں رہا۔[۲۵] بہر حال اقبال نے اپنا شعری سفر پورے خلوص اور اعتماد کے ساتھ جاری رکھا۔

۲

ذہانت میں وہ اپنی عمر کے دوسرے لڑکوں سے بہت آگے تھے۔ کتابیں پڑھتے، شاعری بھی کرتے مگر سکول اور کالج کی تعلیم میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ انھیں اپنی عمر کے عام لڑکوں کی طرح کھیل کود، کبوتر پالنے، پتنگ اڑانے اور اکھاڑے میں ورزش کرنے کا شوق بھی تھا۔ ان کے والد شیخ نور محمد اور استاد میر حسن انھیں ایسی جائز تفریحات سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کرتے تھے۔ انھی مشاغل و مصروفیات اور شب و روز کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے میٹرک کے امتحان کا مرحلہ آ پہنچا۔

اقبال کے زمانے میں میٹرک کا امتحان پنجاب یونی ورسٹی ہی لیتی تھی[۲۶] مگر اس برس شاید طلبہ کی کم تعداد کے پیشِ نظر سیالکوٹ کو امتحانی سنٹر نہیں بنایا گیا تھا۔ سیالکوٹ کے طلبہ کے لیے قریب ترین امتحانی سنٹر گجرات تھا، چنانچہ تمام طلبہ بشمول محمد اقبال، مارچ ۱۸۹۳ء کے تیسرے ہفتے میں گجرات پہنچے۔ بہار کے خوش گوار موسم میں گندم کی لہلہاتی فصلوں کے درمیان، ریل کا یہ سفر لڑکوں کو اچھا لگا ہوگا۔ ممکن ہے دورانِ سفر کچھ لڑکے ہاتھ میں کوئی کتاب یا نوٹ بک پکڑے کچھ پڑھنے یا کوئی فارمولا یاد کرنے اور رٹا لگانے کی کوشش کرتے رہے ہوں۔

وہ دو ہفتے گجرات کے مشن ہائی سکول میں مقیم رہ کر امتحان دیتے رہے۔[۲۷] امتحان ختم ہوا اور لڑکے دل و دماغ کا سارا بوجھ اتار چکے تو واپسی کا سفر، ان کے لیے بالکل ایک تفریحی سفر ثابت ہوا۔ دلچسپ اور پُر لطف ـــــ ہنستے مسکراتے، گیت گاتے اور ایک دوسرے سے چہلیں کرتے واپس آئے ہوں گے۔

اقبال کے لیے گجرات کا یہ سفر ایک اور لحاظ سے بھی اہم رہا کہ اقبال کے بیشتر سوانح نگاروں

کے مطابق یہ ان کی عائلی زندگی کے آغاز کا سبب بن گیا۔ گجرات کے سول سرجن ڈاکٹر شیخ عطا محمد (۱۸۵۵ء-۱۹۲۲ء) بڑے متدین اور نیک بزرگ تھے۔ انھوں نے خوش شکل محمد اقبال کو دیکھا تو چہرے مہرے اور طور اطوار سے لڑکا انھیں اچھا لگا۔ قیافہ شناس ہوں گے تو اندازہ لگایا ہوگا: لڑکا ذہین ہے۔ اس کے برعکس ایک روایت یہ بھی ہے کہ شیخ نور محمد سے ڈاکٹر صاحب کی یاد اللہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہونے کے سبب خاصے آسودہ حال تھے، مگر شیخ نور محمد کا گھرانا سماجی اور مالی اعتبار سے ان کا ہم پلّہ نہ تھا۔ دونوں گھرانوں میں ایک واضح معاشرتی تفاوت کے باوجود شیخ نور محمد کی دین داری، نیک نفسی اور اقبال کی ذہانت اور قابلیت اس رشتے کا سبب بنی اور کریم بی بی سے اقبال کی نسبت ۱۸۹۲ء میں (ایک سال قبل ہی) طے ہو چکی تھی۔ یہ رشتہ ایک ایسے شخص نے طے کرایا تھا جو سیالکوٹ میں ملازم تھا۔ دونوں خاندانوں سے اس کے مراسم تھے۔[۲۸]

ساٹھ افراد پر مشتمل اقبال کی بارات بذریعہ ریل سیالکوٹ سے گجرات پہنچی۔ سید میر حسن بھی باراتیوں میں شامل تھے۔ ۴ مئی تقریباً چار بجے شام کا وقت تھا، تھوڑی دیر بعد رسمِ نکاح ادا کی گئی۔ حق مہر دو ہزار روپے مقرر ہوا، جس میں سے ایک ہزار روپے اسی وقت ادا کیا گیا۔[۲۹] اس دَور کے لحاظ سے یہ رقم خاصی خطیر تھی۔ بارات دلھن کو بیاہ کر اگلے روز واپس سیالکوٹ آ گئی۔ اس وقت اقبال کی عمر تقریباً ۱۷ برس تھی۔ دراصل اس زمانے میں کم عمری میں شادی کا رواج تھا۔ (مرزا غالب کی شادی ۱۳ برس کی عمر میں امراؤ بیگم سے ہو گئی تھی۔) بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال دِل سے اس شادی پر رضا مند نہ تھے، مگر زمانے کا ماحول اور روایات ایسی تھیں کہ بچوں کو والدین کے سامنے دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ اقبال تو ویسے بھی سعادت مند بیٹے تھے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ جب گھر کے ماحول میں محبت اور شفقت کے ساتھ عزت و احترام کا پہلو ملحوظِ خاطر رکھنا ہو تو بزرگوں کے سامنے نوعمر لڑکوں کے لیے اختلاف رائے کا اظہار ممکن نہ تھا۔[۳۰] اقبال کی بیگم کا نام کریم بی بی تھا۔ امیر گھرانے کی یہ بیٹی عمر میں اقبال سے دو تین سال بڑی تھیں۔

حسنِ اتفاق دیکھیے کہ عین اس روز جب اقبال کی بارات گجرات جا رہی تھی، مئی ۱۸۹۳ء کی چار تاریخ تھی، انھیں میٹرک میں اپنی کامیابی کی خبر ملی۔ وہ ۶۷۰ میں سے ۴۲۴ نمبر لے کر درجہ اول میں کامیاب ہوئے تھے۔ اپنے سکول میں پہلی اور پنجاب یونی ورسٹی میں ان کی ۸ ویں پوزیشن تھی۔ بارہ روپے ماہوار وظیفہ جاری ہوا اور سکول کی طرف سے انھیں ایک تمغا بھی دیا گیا۔[۳۱]

اس اثنا میں سکاچ مشن ہائی سکول کو کالج کا درجہ مل گیا اور مولانا میر حسن کالج سے منسلک

ہو گئے۔ اقبال ۵ مئی ۱۸۹۳ء کو گیارھویں جماعت میں داخل ہو گئے۔ یوں ایف اے کے زمانے میں اقبال کی تعلیم بدستور میر حسن کی نگرانی میں جاری رہی۔ شعر گوئی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ گذشتہ صفحات میں ذکر آ چکا ہے کہ اقبال مقامی مشاعروں میں شرکت کرنے لگے تھے۔ داغ سے تلمذ کا یہی زمانہ تھا۔ اسی زمانے میں ان کی غزلیں رسالہ زبان دہلی میں شائع ہو رہی تھیں۔

ازدواجی زندگی کی مصروفیات، شعر و شاعری اور دیگر مشاغل کے باوجود، اقبال نے تعلیم پر پوری توجہ مرکوز رکھی۔ میر حسن نے یقینی طور پر خیال رکھا ہوگا کہ اقبال اپنی تعلیم سے کسی اعتبار سے بھی غفلت نہ برتیں۔

جوں جوں امتحان کا مرحلہ قریب آتا گیا، ان کی تیاری، توجہ اور محنت بڑھتی گئی۔ محنت کے وہ سدا کے عادی تھے۔ بیگم شیخ عطا محمد ماہتاب بی بی (م: ۱۳ر فروری ۱۹۵۹ء) کی روایت ہے کہ سکول کے ابتدائی زمانے میں رات کو نیند میں اُٹھ اُٹھ کر پڑھتے تھے۔ ایک بار نصف شب کو ان کی والدہ امام بی کی آنکھ اچانک کھلی تو دیکھا کہ اقبال دیے کی روشنی میں پڑھ رہے ہیں۔ دو ایک آوازیں دیں تو اقبال ٹس سے مس نہ ہوئے۔ انھوں نے شانوں سے پکڑ کر ہلایا اور کہا: ''اقبال! اس وقت آدھی رات کو کیا پڑھ رہے ہو؟ اٹھو، سو جاؤ، صبح کام کر لینا''۔ اقبال کسمسائے اور کہا: ''بے جی، سویا ہوا تو ہوں''۔ رات کو تادیر پڑھتے رہنے کی عادت آخر والدین کی توجہ سے ختم ہو گئی۔[۳۲]

ایف اے میں ان کے مضامین انگریزی، ریاضی، عربی اور فلسفہ تھے۔ انگریزی اور فلسفہ انھیں پروفیسر واخ پڑھاتے تھے۔ ریاضی کے استاد لالہ نرنجن داس اور عربی کے میر حسن تھے۔ اپریل ۱۸۹۵ء میں انھوں نے ایف اے کا امتحان درجہ دوم میں پاس کر لیا۔[۳۳]

اقبال مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ انھیں میر حسن کی تائید بھی حاصل تھی، مگر سیالکوٹ میں بی اے کی تعلیم کا انتظام نہ تھا۔ مزید تعلیم کے خواہش مند بالعموم لاہور جاتے تھے۔

حوالے اور حواشی

۱۔ دما دم رواں ہے ......، ص ۴۳

۲۔ روایاتِ اقبال، ص ۲۳؛ دما دم رواں ہے ......، ص ۴۳-۴۵

۳۔ زندہ رُود، ص ۸۳-۸۴

۴۔ دما دم رواں ہے ......، ص ۴۷۔ زندہ رُود، ص ۸۴

۵۔ ایضاً، ص ۴۶

۶۔ روایاتِ اقبال، ص ۲۶
۷۔ الزبیر، اقبال نمبر ۱۹۷۷ء، ص ۱۱
۸۔ بانگِ درا، ص ۹۷
۹۔ کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال، ص ۲۹۲
۱۰۔ سید میر حسن، ص ۴۷
۱۱۔ عروجِ اقبال، ص ۲۳
۱۲۔ ایضاً، ص ۲۴
۱۳۔ ایضاً، ص ۳۷
۱۴۔ زندہ رود، ص ۱۰۷
۱۵۔ روز گارِ فقیر [اول]، ص ۵۸
۱۶۔ عروجِ اقبال: ص ۳۸
۱۷۔ اقبال کی ابتدائی زندگی، ص ۲۷، ۲۸، ۱۲۵، نذرِ اقبال، ص ۳۵۔
۱۸۔ ایضاً، ص ۱۲۸، ۱۳۵
۱۹۔ کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال، ص ۲۳۷-۲۳۸
۲۰۔ دیباچہ: بانگِ درا، ص ۱۱
۲۱۔ دمادم رواں ہے ......، ص ۱۰۱
۲۲۔ عروجِ اقبال، ص ۶۲
۲۳۔ کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال، ص ۲۳۸
۲۴۔ ایضاً، ص ۲۴۲
۲۵۔ دیباچہ: بانگِ درا، ص ۱۱
۲۶۔ ۱۹۵۴ء تک یہی معمول قائم رہا۔ ۱۹۵۵ء میں لاہور میں پہلا ثانوی تعلیمی بورڈ قائم ہوا، اور میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات بورڈ کے تحت منعقد ہونے لگے۔
۲۷۔ اقبال کی ابتدائی زندگی، ص ۱۳۶-۱۳۷
۲۸۔ اقبال اور گجرات کے مصنف نے برات اور نکاح کی تفصیل بیان کی ہے۔ نکاح نامے کا متن بھی دیا گیا ہے (ص ۶۱)۔ گواہوں میں سید میر حسن کا نام بھی شامل ہے۔ اقبال کے تمام سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ میٹرک میں کامیابی کی اطلاع اقبال کو بذریعہ تار ۴ رمئی کو ملی۔ ہمارے خیال میں تار والی بات محلِ نظر ہے۔ سوال یہ ہے کہ تار کس نے دیا تھا اور کہاں سے بھیجا گیا تھا؟
۲۹۔ ایضاً
۳۰۔ زندہ رُود، ص ۹۴
۳۱۔ اقبال کی ابتدائی زندگی، ص ۱۳۷، روز گارِ فقیر: دوم، ص ۱۹
۳۲۔ اقبال درون خانہ [دوم]، ص ۹۰۸
۳۳۔ پنجاب یونی ورسٹی کیلنڈر، بحوالہ اقبال کی ابتدائی زندگی، ص ۱۴۸-۱۴۹

(۳)

سودائے علم......

خوش قسمتی سے شیخ نور محمد کا گھرانا قدرے آسودہ حال ہو چکا تھا۔ اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کو سرکاری ملازمت مل گئی تھی اور اب وہی اقبال کے تعلیمی اخراجات کے کفیل تھے۔ ان دنوں گورنمنٹ کالج لاہور پنجاب میں جدید تعلیم کا ایک معیاری اور اعلیٰ ادارہ سمجھا جاتا تھا۔ اقبال نے بھی مزید تعلیم کے لیے لاہور جانے کا عزم کر لیا۔

۱

بعض وجوہ سے اقبال کو لاہور آنے میں تاخیر ہوگئی۔ ممکن ہے، گھریلو یا خانگی مسائل تاخیر کا باعث بنے ہوں، بہر حال وہ ستمبر ۱۸۹۵ء میں لاہور پہنچے اور اندرونِ بھاٹی دروازہ اپنے دوست شیخ گلاب دین کے ہاں مقیم ہوئے۔ بی اے کی جماعت میں داخلہ مل گیا، لیکن تاخیر سے آنے کی وجہ سے فوری طور پر ہوسٹل میں داخلہ نہ مل سکا۔ چند ماہ بعد ۱۸۹۶ء میں جب وہ بی اے کے سالِ دوم میں پہنچے تو انھیں کواڈرینگل ہوسٹل (موجودہ نام: اقبال ہوسٹل) میں قیام کے لیے کمرہ نمبر ایک دیا گیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اقبال بیک وقت گورنمنٹ کالج اور اورینٹل کالج دونوں کے طالب علم تھے۔ ان کے مضامین انگریزی، فلسفہ اور عربی تھے۔ چونکہ گورنمنٹ کالج میں عربی کی تدریس کا الگ انتظام نہ تھا، اس لیے وہ اورینٹل کالج کی عربی کلاس میں شریک ہوتے تھے۔ اس زمانے میں اورینٹل کالج، گورنمنٹ کالج ہی کی عمارت میں چل رہا تھا۔ ۱۸۹۷ء میں انھوں نے درجہ دوم میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ عربی میں اول آنے پر طلائی تمغا (خان بہادر، فقیر سید جمال الدین میڈل) بھی حاصل کیا۔ ایم اے کے لیے انھوں نے نسبتاً مشکل مضمون فلسفے کا انتخاب کیا۔ غالباً اس لیے کہ وہ فلسفے کی جانب ایک طبعی رجحان رکھتے تھے۔ بی اے اور ایم اے کے زمانۂ طالب علمی میں انھیں متعدد نامور اور قابل اساتذہ سے اکتسابِ علم کا موقع ملا تھا۔ تقریباً چار سالہ طالب علمانہ زندگی کا یہ زمانہ اقبال کی ذہنی اور فکری نشوونما اور شاعرانہ ارتقا کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔

ان دنوں گورنمنٹ کالج کا اندرونی ماحول اور کیمپس کی فضا کا ایک نقشہ کالج کے مؤرخ گیرٹ نے پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال، گیرٹ کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''اس زمانے میں گورنمنٹ کالج میں طلبہ کی تعداد دو ڈھائی سو سے زیادہ نہ تھی، اس لیے طلبہ کا ایک دوسرے کو جاننا اور اپنے اساتذہ کے ساتھ قریبی روابط پیدا کرنا آسان تھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور کی عمارت کے سامنے نچلے قطعۂ اراضی میں، جسے اب ''اوول'' کہا جاتا ہے، سنگترے اور لیموں کے بے شمار پودوں کے علاوہ بڑے بڑے درخت تھے، جن پر شہد کی مکھیوں نے چھتے لگا رکھے تھے۔ موسمِ گرما کی طویل دو پہروں میں یہ جگہ لڑکوں اور شہد کی مکھیوں کی آماج گاہ ہوتی۔ لڑکے طویل درختوں کے گھنے سائے میں گھاس میں اپنی اپنی صفیں بچھا کر، یہاں گھنٹوں لیٹے کتابیں پڑھتے اور ان کے سروں پر شہد کی مکھیاں بھنبھناتی رہتیں۔ کالج کے چھوٹے ٹاور کے عین سامنے، قدرے شمال کی طرف ایک پرانا برگد کا درخت تھا جس کے تنے کے اردگرد لکڑی کے ڈائس پر لڑکے بیٹھ کر پڑھتے یا خوش گپیاں لگاتے۔ کالج کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ مختلف قسموں کی سوسائٹیوں، انجمنوں، میٹنگوں یا سالانہ اجتماعوں کا رواج ابھی نہ چلا تھا۔ اساتذہ اور طلبہ کو ایک دوسرے سے ملنے یا قریب سے جاننے کے مواقع اکثر ملتے رہتے۔ اس طرح ہونہار طلبہ اساتذہ کی نگاہوں میں رہتے اور اپنے اساتذہ سے پورا پورا فائدہ اُٹھاتے یا ان سے اثر قبول کرتے۔''[۱]

گورنمنٹ کالج میں اقبال کو نہایت قابل، سادہ مزاج اور شریف النفس اساتذہ سے کسبِ علم کا موقع ملا، مثلاً: لالہ جیارام جن کا ذکر اقبال نے ایک جگہ فرطِ عقیدت سے اس طرح کیا ہے: ''اُستاذی جناب قبلہ لالہ جیارام صاحب''۔[۲] اسی طرح مولانا محمد دین فوقی کشمیری ایسے فاضل جو سیرت النبیؐ، فقہ، عربی ادب اور منطق و فلسفہ جیسے علوم پر متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ اسی طرح مولانا ابوسعید محمد شعیب جو ڈاکٹر سٹراٹن (پرنسپل اورینٹل کالج) کے بقول A Splendid Fellow [ایک نفیس انسان] تھے۔[۳] اقبال کو، مولانا فیض الحسن سہارن پوری سے بھی استفادے کا موقع ملا ہو گا۔ ایک زمانے میں شبلی نعمانی نے ان سے فیض اٹھایا تھا۔ اردو کے صاحب اسلوب اور بے مثل ادیب محمد حسین آزاد بھی اس زمانے میں گورنمنٹ کالج میں استاد تھے۔

۲

لیکن اقبال نے سب سے زیادہ اکتسابِ علم اس ''ذروۂ سینائے علم'' سے کیا، جس کا نام نامی تھا: پروفیسر تھامس واکر آرنلڈ (T.W Arnold ۱۸۶۴ء-۱۹۳۰ء)۔ اگرچہ ان کی شاگردی کا

موقع اقبال کو ایم اے کے آخری سال (۹۹-۱۸۹۸ء) میں فقط چند ماہ تک ہی ملا تاہم آرنلڈ جیسے ''شفیق اور کردار ساز استاد'' سے کسبِ فیض کا یہ مختصر زمانہ بھی اقبال کے لیے ایک یادگار سرمایۂ افتخار ثابت ہوا۔

پروفیسر آرنلڈ ۱۱ر فروری ۱۸۹۸ء کو گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے استاد مقرر ہوئے۔ اس سے پہلے، وہ علی گڑھ کالج میں معلم رہے تھے، جہاں وہ ایک مسلم دوست عالم اور منصف مزاج مستشرق کی حیثیت سے معروف تھے۔[۴] ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی لکھتے ہیں: ''آرنلڈ میں ایک طرف تو انسانی خوبیاں؛ دوست داری، محبت و ہمدردی پائی جاتی تھی، دوسری طرف وہ ایک بے مثال علمی لگن رکھتے تھے۔ ان کی مشرقیت، سادگی اور انکسار نے علی گڑھ کے تعلیمی اور علمی حلقوں میں انھیں بہت عزت بخشی تھی اور طلبہ و اساتذہ میں محترم اور مقبول بنا دیا تھا۔''[۵]

پروفیسر آرنلڈ سرتاپا ایک علم دوست انسان تھے۔ وضع داری اور اپنے کام سے لگن ان کے مزاج کا حصّہ تھی۔ علی گڑھ کالج میں وہ بالعموم عربی لباس پہنتے اور مولوی عبدالحق کے بقول کسی ''مسجد کے مُلّا جی'' معلوم ہوتے تھے۔ ان کے مزاج میں ایک گونہ فقر اور درویشی بھی تھی۔ چنانچہ قیامِ لاہور میں انھیں بعض احباب The Saint (ولی) کہا کرتے تھے۔ پروفیسر آرنلڈ اپنے طالب علموں کو کتب بینی کی رغبت دلاتے، مطالعے کے لیے کتابیں تجویز کرتے، بعض موضوعات سُجھاتے اور پھر ان موضوعات پر اپنے شاگردوں سے تبادلۂ خیال بھی کرتے۔ مولانا ظفر علی خاں بھی اسی زمانے میں علی گڑھ کالج کے طالب علم تھے، وہ لکھتے ہیں: ''آرنلڈ وقتاً فوقتاً اپنے شاگردوں کو ایسی قیمتی نصیحتیں فرماتے رہتے تھے، جو آپ ہی کے وسیع تجربے اور صحیح ذوقِ علمی کا حصّہ ہیں۔''[۶]

بحیثیت مجموعی وہ طلبہ کے اندر ایک قومی اور ملی حساس اور ایک تعمیری سوچ پیدا کرنے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ سرسید احمد خاں، مولانا حالی اور شبلی نعمانی بھی آرنلڈ سے بہت متاثر تھے۔ آرنلڈ نے شبلی سے عربی اور فارسی زبان و ادب کے سلسلے میں اکتساب کیا اور شبلی نے آرنلڈ سے فرانسیسی زبان سیکھی۔ علی گڑھ کالج میں ۲۵ فروری ۱۹۰۴ء کو منعقدہ ان کی الوداعی تقریب میں حالی اور شبلی نے انھیں منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔[۷]

ہم اِسے حسنِ اتفاق کا نام ہی دیں گے کہ اقبال کو گورنمنٹ کالج لاہور کے زمانۂ طالب علمی کے آخر میں آرنلڈ کے سامنے زانوائے تلمذ تہ کرنے کا موقع مِلا۔ بعض روایات کے مطابق اس

زمانے میں ایم اے ایک سال ہی میں ہوتا تھا۔ اگر اسے درست سمجھا جائے تو اقبال نے اپریل ۱۸۹۸ء میں ایم اے فلسفہ میں داخلہ لیا ہوگا۔ آرنلڈ دو ماہ پہلے گورنمنٹ کالج لاہور میں استاد مقرر ہوئے تھے۔ اگرچہ اقبال خود بھی فلسفے کی طرف ایک طبعی میلان رکھتے تھے، وہ بی اے میں فلسفے کے مضمون کا مطالعہ کر چکے تھے، تاہم قرین قیاس ہے کہ اپریل میں جب آرنلڈ سے ان کا تعارف ہوا تو آرنلڈ نے اس ذہین طالب علم کو آمادہ کیا ہوگا کہ وہ ایم اے کے لیے فلسفے کا مضمون انتخاب کرے۔ بہرحال یہ امر یقینی ہے کہ آرنلڈ کی ''شفیقانہ راہبری'' کا آغاز مئی ۱۸۹۸ء میں ہوگیا تھا۔

پروفیسر آرنلڈ خالص ایک علمی مزاج کے حامل شخص (Academician) تھے۔ اقبال سے ان کا برتاؤ استاد کے ساتھ ساتھ ایک دوست کی سطح کا بھی تھا۔ بقولِ شیخ عبدالقادر: وہ علمی جستجو اور تلاش کے طریق جدید سے خوب واقف تھے۔ انھوں نے چاہا کہ اپنے شاگردکو اپنے مذاق اور طرزِ عمل سے حصہ دیں اور اس ارادے میں بہت کچھ کامیاب بھی ہوئے۔[۸] انھوں نے اقبال جیسے جوہرِ قابل کو اس طرح چمکایا کہ خود آرنلڈ کو کہنا پڑا کہ ایسا شاگرد استاد کو محقق اور محقق کو محقق تر بنا دیتا ہے۔[۹] اورینٹل کالج میں بھی انھیں آرنلڈ کی علمی صحبت میسر رہی اور پھر انگلستان کے زمانہ قیام میں بھی آرنلڈ سے ان کا رابطہ برابر قائم رہا۔ علمی تبادلہء خیال ہوتا رہا اور جیسا کہ شیخ عبدالقادر نے بانگِ درا کے دیباچے میں لکھا ہے کہ اس زمانے میں اقبال نے شاعری کو ترک کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا تھا مگر ان کی وجہ سے وہ ترکِ شعر کے ارادے سے باز آ گئے۔ قیامِ یورپ کے آخری سال، لندن یونی ورسٹی میں اقبال کو چھے ماہ تک آرنلڈ کی جگہ عربی پروفیسر کے طور پر تدریس کا موقع ملا۔

بہرحال لاہور میں پروفیسر آرنلڈ اور ان کے شاگرد اقبال میں باہمی قربت بڑھتی گئی۔ استاد کی حوصلہ افزائی پر کبھی کبھی، وہ آرنلڈ کے گھر بھی جانے لگے تھے۔ ''آرنلڈ کا گھرانا، اقبال کو 'حقیقی خوشیوں کا نمونہ' نظر آتا تھا۔ مسز آرنلڈ ایک خوش اخلاق خاتون تھیں اور ان کی چھوٹی سی بچی نینسی بھی ہنستی کھیلتی دکھائی دیتی تھی۔''[۱۰]

۲۲/ اپریل ۱۸۹۹ء کو ایم اے کا نتیجہ آیا، اقبال تیسرے درجے میں پاس ہوگئے۔ وہ ایم اے فلسفہ پاس کرنے والے واحد طالب علم تھے، اس لیے حسب ضابطہ پنجاب یونی ورسٹی کی طرف سے انھیں طلائی تمغا دیا گیا۔

ہندستان میں یہ جدید تعلیم کی سب سے اعلیٰ ڈگری تھی۔ اس مہم کو سر کرنے کے بعد ان کے والدین اور بڑے بھائی شیخ عطا محمد بھی جو اقبال کے مالی سرپرست تھے، قدرتی طور پر یہ توقع کر رہے تھے کہ اقبال ایم اے کی اعلیٰ ڈگری کے ساتھ کسی اچھے، اونچے اور باعزت منصب پر مقرر ہو جائیں گے۔ خود اقبال بھی کسی معقول ملازمت کے بارے میں سوچتے رہے ہوں گے۔ وکالت کا آزادانہ پیشہ اُن کی پہلی ترجیح تھی اور اسی لیے، ایک روایت کے مطابق، انھوں نے ۱۸۹۸ء میں قانون کے پرچوں کا امتحان دیا، مگر فقہ (Jurisprudence) کے پرچے میں فیل ہو گئے۔[۱۱] [اقبال کی یہ ترجیح بدستور قائم رہی اور انھوں نے ۸ سال بعد لندن کے لنکنز اِن سے قانون کی اعلیٰ ڈگری حاصل کر کے یہ معرکہ سر کر لیا۔]

قانون کے ایک پرچے میں فیل ہونے پر وکالت کی طرف جانے کی بات نہ بن سکی تو اقبال نے مقابلے کا امتحان برائے Extra Assistant Commissioner دینے کا عزم کیا۔ عین ممکن تھا کہ وہ ہندستان کی انگریزی انتظامیہ میں شامل ہو جاتے مگر امتحان سے ایک روز قبل حسبِ ضابطہ تمام امیدواروں کا معائنہ ہوا تو معلوم ہوا کہ اقبال کی دائیں آنکھ میں بینائی نہ ہونے کے برابر ہے، غالباً اس لیے کہ بچپن میں انھیں جونکیں لگوائی گئی تھیں،[۱۲] چنانچہ وہ طبّی بنیادوں پر امتحان کے نااہل قرار پائے۔

۳

ایم اے کا نتیجہ آنے کے تین ہفتے بعد ۱۳ مئی ۱۸۹۹ء کو وہ اورینٹل کالج میں میکلوڈ عریبک ریڈر مقرر ہو گئے۔ تنخواہ ۷۳ روپے، ۱۴ آنے اور ۸ پیسے تھی۔ اس زمانے میں یہ ایک معقول رقم تھی۔ بنیادی طور پر یہ تدریسی منصب نہ تھا، تاہم ریڈر کو تحقیق، تصنیف و تالیف اور ترجمے کے علاوہ تدریسی کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ حسنِ اتفاق سے اس زمانے میں پروفیسر آرنلڈ اورینٹل کالج کے قائم مقام پرنسپل تھے۔ شاگرد اور استاد، دونوں کے لیے یہ تقرر باعثِ مسرت و طمانیت تھا۔

میکلوڈ عریبک ریڈر کے طور پر اقبال تقریباً چار سال تک کالج سے وابستہ رہے۔ اس درمیان وہ کئی بار رخصت لے کر گورنمنٹ کالج لاہور میں ایڈیشنل پروفیسر اور اسسٹنٹ پروفیسر کی عارضی اسامیوں پر کام کرتے رہے۔ ان کی مدتِ ملازمت میں مسلسل توسیع ہوتی رہی۔ یہاں ان کی تنخواہ دو سو روپے تھی، پھر ۲۵۰ روپے ہو گئی۔[۱۳]

۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۴ء تک کا زمانہ معلّمی، علمی اور تحقیقی تحصیلات کے لحاظ سے اقبال کی زندگی

میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔اورینٹل کالج میں وہ فلسفہ، منطق، اقتصادیات اور تاریخ کے مضامین پڑھاتے تھے۔گورنمنٹ کالج میں وہ انگریزی اور فلسفے کا درس دیتے تھے۔فلسفے کی تدریس کے لیے انھیں کچھ زیادہ مشکل نہ پیش آتی ہوگی کیونکہ انھوں نے انٹرمیڈیٹ اور بی اے میں فلسفے کا بطور ایک مضمون کے باقاعدہ مطالعہ کیا تھا۔انگریزی کی تدریس بھی ان کے لیے آسان تھی لیکن معاشیات اور تاریخ پر ہر روز لیکچر دینے کے لیے اقبال کو اچھی خاصی تیاری کرنی پڑتی تھی۔ ذمہ دار اور کامیاب اساتذہ کی طرح، غالباً ہر روز لیکچر کے اشارات (notes) تیار اور مرتب کرتے ہوں گے۔[۱۴]

اقبال کے ایک شاگرد اور معروف ناول نگار ایم اسلم (۱۸۸۵ء-۱۹۸۳ء) لکھتے ہیں: ''ان کے پڑھانے کا طریقہ اتنا دل کش تھا کہ غالباً ان کے گھنٹے میں تمام اساتذہ کے مقابلے میں زیادہ حاضری ہوتی جوان کی مقبولیت اور لیاقت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔وہ پنجابی طلبہ کی کمزوریوں سے پوری طرح واقف تھے اس لیے انگریزی الفاظ کی ادائیگی میں بہت احتیاط برتتے تھے جس سے ایک ایک لفظ آسانی سے سمجھ میں آجاتا۔ان کے پڑھانے کا طریقہ اتنا موثر ہوتا کہ سبق کلاس ہی میں یاد ہو جاتا۔''[۱۵]

اسی زمانے میں اقبال نے انجمن حمایت اسلام کی درخواست پر، شیخ عبدالقادر کی چندروزہ رخصت کے دوران، اسلامیہ کالج میں انگریزی کی تدریس کی تھی۔خلیفہ شجاع الدین (۱۸۸۷ء-۱۹۵۵ء) اسلامیہ کالج لاہور میں اقبال کے شاگرد رہے۔ان کا بیان ہے کہ ''اسلامیہ کالج کی چندروز کی پروفیسری نے ہی آپ کی تبحر علمی کا سکہ بٹھا دیا''۔[۱۶]

پروفیسر خادم محی الدین، گورنمنٹ کالج لاہور میں زیر تعلیم رہے۔انھوں نے اقبال سے فلسفے کا اَدق مضمون پڑھا۔وہ لکھتے ہیں کہ: ''علامہ اقبال؛ اخلاقیات اور الٰہیات پر نہایت سہولت سے لیکچر دیا کرتے تھے،اس کے علاوہ انگریزی نثر بھی پڑھاتے رہے لیکن ان کا خاص مضمون تو فلسفہ ہی تھا اور اس کے اَدق نکات ایسی وضاحت سے بیان فرماتے تھے کہ مضمون آئینہ ہو جاتا تھا۔چونکہ [پروفیسر] بریٹ کی طرح تیز رفتار نہ تھے، ہماری ذہنیت سے واقف تھے،اس لیے میں ان کے لیکچروں کا بیشتر حصہ کلاس ہی میں قلمبند کر لیتا تھا۔گھر جا کر ہر لیکچر کے نوٹ دوبارہ صاف کر کے لکھ لیتا۔کورس پورا ہوا تو میں فلسفے میں امتحان دینے کے لیے بالکل تیار تھا۔''[۱۷]

اقبال کے ایک اور شاگرد محمد علی قصوری نے بھی اقبال کے طرزِ تدریس کی تعریف کی ہے۔[۱۸]

۴

مطالعہ، معلم کی گفتگو کو زیادہ بامعنی اور اس کے اندازِ تدریس کو دل کش اور خوب صورت بناتا ہے۔ اقبال بچپن ہی سے مطالعے کے رسیا تھے۔ لاہور آئے تو ہاسٹل میں قیام کے زمانے میں ان کے کمرے میں محفل آرائی ہوتی، مگر جب دوست احباب اٹھ کر چلے جاتے تو وہ مطالعے میں محو ہو جاتے۔ ان کے پاس حقہ بھی دھرا رہتا۔ دورانِ مطالعہ وہ حقّہ گڑگڑاتے رہتے۔

ایم اے کرنے کے بعد اقبال اندرونِ بھاٹی گیٹ کے علاقے میں کرائے کے متعدد مکانوں میں مقیم رہے۔ اگرچہ وہ جدید علوم کی اعلیٰ ڈگری (ایم اے) حاصل کر چکے تھے لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے علوم وفنون اور شعر و ادب کا اصل مطالعہ اب شروع کیا ہے۔ درسی ضروریات کے علاوہ بھی وہ اپنے ذوق کی تسکین کے لیے مختلف علوم سے متعلق کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے۔ مطالعہ ان کی عادتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ ان کے دیرینہ خادم علی بخش (۱۸۸۳ء-۱۹۶۹ء) کا بیان ہے کہ ان کے کمرے میں میز پر ڈھیروں کتابیں بے ترتیبی سے پڑی رہتی تھیں۔ علی بخش کو تاکید تھی کہ وہ کمرہ صاف کرتے وقت بکھری کتابوں کو نہ چھیڑے بلکہ انھیں اپنی جگہ جوں کا توں رہنے دے۔ مطالعے میں ان کے استغراق اور محویت کی یہ کیفیت ہمیں پروفیسر آرنلڈ کی یاد دلاتی ہے۔

۱۹۰۵ء کے اوائل میں کانگڑے کا مشہور زلزلہ آیا، جس کے جھٹکے لاہور میں بھی بڑی شدت سے محسوس کیے گئے۔ اس زمانے میں اقبال اندرونِ بھاٹی گیٹ کے محلّہ جلوٹیاں میں واقع ایک مکان کی بالائی منزل میں رہتے تھے۔ زلزلہ آیا تو اقبال پلنگ پر لیٹے ایک کتاب پڑھ رہے تھے۔ علی بخش گھبراہٹ کے مارے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں بھاگا بھاگا پھرنے لگا۔ اس کی بدحواسی دیکھ کر، اقبال نے کتاب سے نظر ہٹائے بغیر اسے کہا: ''علی بخش، اِدھر اُدھر نہ بھاگو، زینے میں جا کر کھڑے ہو جاؤ۔'' پھر کتاب کے مطالعے میں غرق ہو گئے۔ [۱۹]

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ میکلوڈ عربک ریڈر کی اصل ذمہ داری تحقیق، تصنیف و تالیف اور ترجمہ تھا، چنانچہ تدریس کے ساتھ ساتھ اقبال نے متعدد تحریری کام بھی انجام دیے، مثلاً:

۱۔ ایک تحقیقی مضمون The Doctrine of Absolute Unity as Expounded by Al-Jili۔ یہ سب سے پہلے *Indian Antiquary* میں شائع ہوا، بعد ازاں قدرے ترمیم کے بعد، اقبال کے پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے کا حصہ بنا۔ [۲۰]

۲۔ انگریزی کتاب *Political Economy* کا اردو ترجمہ و تلخیص۔

۳۔ اسٹبس کی انگریزی تصنیف Early Plantagents کا اردو ترجمہ و تلخیص۔

۴۔ علم الاقتصاد کی تالیف، ۱۹۰۴ء۔

نمبر۲ اور نمبر۳ کا کچھ علم نہ ہوسکا۔ نمبر۴ مطبوعہ صورت میں موجود ہے۔ اس طرح اورینٹل کالج کی ملازمت کا زمانہ اقبال کے لیے اچھی خاصی مصروفیات اور ذمہ داری کا زمانہ تھا۔ وہ اپنی ذہانت، محنت کی عادت اور علمی لگن کی وجہ سے اس ذمہ داری سے بخوبی اور خاصی کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوتے رہے۔

گورنمنٹ کالج کے زمانۂ معلمی کی ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ صوفی منش پروفیسر سوامی رام تیرتھ (۱۸۷۳ء-۱۹۰۶ء) ان کے رفیق کار تھے۔ سوامی رام، صاحبِ حال ویدانتی صوفی اور بڑی دلچسپ اور مسحور کن شخصیت کے مالک تھے۔ فارسی زبان سے آشنا اور کلام حافظ کے دلدادہ تھے اور مشرقی و مغربی ادبیات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اقبال کی طرح انھیں بھی مناظرِ قدرت سے گہرا لگاؤ تھا۔ سکونِ قلب کے لیے اکثر اوقات پہاڑوں پر چلے جاتے تھے۔ دونوں کے درمیان گہرے مراسم قائم ہوگئے تھے۔ سوامی رام نے، اقبال کی راہ نمائی میں مثنوی رومی کا مطالعہ کیا اور اقبال نے ان سے سنسکرت زبان سیکھی، ان کی صحبت میں شنکرا چاریہ کے ویدانتی فلسفے کا مطالعہ کیا، اور اس سے خاصے متاثر ہوئے۔ سوامی رام تیرتھ کی اردو شاعری کے جو نمونے ملتے ہیں، ان میں وہ اقبال سے بہت متاثر بلکہ ان کے مقلد نظر آتے ہیں۔ وہ دریائے گنگا میں ڈوب کر سورگ باش ہوئے۔ بانگِ درا کی نظم ''سوامی رام تیرتھ'' اسی حوالے سے لکھی گئی۔[۲۱]

حوالے اور حواشی

۱۔ زندہ رود، ص۱۰۰

۲۔ عروج اقبال، ص۴۳

۳۔ ایضاً، ص۴۳-۴۴

۴۔ اقبال یورپ میں، ص۹۴

۵۔ عروج اقبال، ص۴۷-۴۸

۶۔ ایضاً، ص۴۸

۷۔ ایضاً، ص۴۷-۴۸

۸۔ دیباچہ بانگِ درا، ص۱۱

۹۔ ذکرِ اقبال، ص ۱۷۔ عروجِ اقبال، ص ۵۰
۱۰۔ دما دم رواں ہے ......، ص ۱۵۵
۱۱۔ ایضاً، ص ۱۴۸۔ عروجِ اقبال، ص ۱۴۲
۱۲۔ اقبال نے یہ بات پروفیسر حمید احمد خاں کو خود بتائی تھی۔ اقبال کی شخصیت اور شاعری: ص ۵۰
۱۳۔ اورینٹل کالج کے زمانۂ معلمی کی تفصیلات کے لیے دیکھیے: ۱۔ ڈاکٹر وحید قریشی کا مضمون "اقبال کی تعلیمی زندگی کے کچھ تفصیلات" در کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ ۲۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کا مضمون: "اقبال، اورینٹل کالج میں"، در: مطالعۂ اقبال ۳۔ ڈاکٹر محمد باقر کا انگریزی مضمون: شیخ محمد اقبال: اے میکلوڈ عریبک ریڈر ایٹ یونی ورسٹی اورینٹل کالج لاہور، در: احوال و آثارِ اقبال، دوم، ص ۱-۱۲
۱۴۔ دمادم رواں ہے ......، ص ۱۵۲
۱۵۔ اوراقِ گم گشتہ، ص ۱۶۲
۱۶۔ بحوالہ عروجِ اقبال، ص ۱۰۵،
۱۷۔ صحیفہ، ستمبر ۱۹۵۸ء بحوالہ اوراقِ گم گشتہ، ص ۲۶۵
۱۸۔ روایاتِ اقبال، ص ۱۷۰
۱۹۔ عروجِ اقبال، ص ۱۰۴۔ مطالعے میں آرنلڈ کے استغراق کا قصہ شبلی نے سفرنامۂ مصر و روم و شام میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک بار آرنلڈ اور مَیں بحری جہاز میں ہم سفر تھے۔ طوفان آیا، جہاز ڈولنے لگا۔ آرنلڈ عرشے پر محوِ مطالعہ تھے۔ مَیں نے کہا: آپ کو پتا ہے، ہم طوفان میں گھر چکے ہیں۔ کہنے لگے: جانتا ہوں اور یہ بھی کہ جہاز کے ڈوب جانے کا امکان ہے، مگر اس وقت کو رونے دھونے کے بجائے کیوں نہ مطالعے میں صرف کیا جائے۔
۲۰۔ ظ انصاری لکھتے ہیں: اس مقالے کو غور و شوق سے پڑھنے والا دنگ رہ جائے گا کہ ہندو فلسفۂ ویدانت اور اسلامی فلسفے پر ایسی وسیع نظر ۲۲ برس کی عمر میں میسر آ سکتی ہے؟ اس مقالے سے بھی ہمارے اندازے کو تقویت ملی کہ اقبال کا سنہ پیدائش ۱۸۷۷ء نہیں بلکہ ۱۸۷۳ء ہی ہوگا۔ (اقبال کی تلاش، ص ۱۰۸)
۲۱۔ زندہ رود، ص ۱۲۰۔ عروجِ اقبال، ص ۹۷۔ اقبالیات، لاہور، جنوری تا مارچ ۱۹۹۴ء

❖......❖......❖

(۴)

......دیدۂ بینائے قوم

گذشتہ باب میں ذکر آ چکا ہے کہ لاہور پہنچ کر اقبال پہلے پہل اندرون بھاٹی دروازے میں اپنے دوست شیخ گلاب دین کے ہاں مقیم ہوئے۔ اس زمانے میں بھاٹی دروازے کے بازارِ حکیماں میں انجمنِ اتحاد کے مشاعرے منعقد ہوتے تھے جن کا آغاز، انجمنِ پنجاب کے مشاعرے بند ہونے پر ۱۸۹۰ء میں حکیم شجاع الدین محمد نے کیا تھا۔[۱]

۱

ابھی اقبال کو لاہور آئے دو ماہ ہی ہوئے تھے کہ دسمبر ۱۸۹۵ء کی ایک شام ان کے بعض دوست انھیں حکیم شجاع الدین محمد کے مکان پر برپا ہونے والی مجلسِ مشاعرہ میں لے گئے۔[۲] بعض روایات کے مطابق یہ مشاعرہ نومبر ۱۸۹۶ء میں ہوا تھا۔ ان مشاعروں میں اپنے دور کے نامور شعرا میر ناظم حسین لکھنوی اور مرزا ارشد گورگانی اپنے شاگردوں کے ساتھ بالالتزام شریک ہوتے تھے۔ سامعین کی تعداد بعض اوقات کئی سو تک پہنچ جاتی۔ اقبال اگرچہ پہلی مرتبہ اس مشاعرے میں شریک ہوئے تھے لیکن انھوں نے بڑے اعتماد سے اپنی وہ غزل پیش کی جس کا معروف شعر ہے:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے[۳]

اس شعر پر ارشد گورگانی نے دل کھول کر انھیں داد دی اور ایک روایت کے مطابق کہا: ''اس عمر میں اور یہ شعر!''[۴]

اقبال ایک ذہین نوجوان تھے۔ انھوں نے لاہور آتے ہوئے ہی یہاں کی شعری محفلوں کا رنگ بھانپ لیا اور بڑی دانش مندی سے یہ فیصلہ کیا کہ ناظم لکھنوی کا حلقہ ہو یا ارشد گورگانی کا، کسی ایک دبستانِ شعر و ادب سے وابستگی مفید نہیں ہوگی۔ چنانچہ انھوں نے نہایت واشگاف انداز میں اعلان کر دیا:

اقبال لکھنؤ سے ، نہ دلی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلف کمال کے [۵]

یوں بھی اقبال یک رخے نہیں تھے، انھوں نے کسی ایک مکتبِ شعر سے ایسی وابستگی سے ہمیشہ گریز کیا جو پابستگی کا سبب بن جائے۔ ابتدائی دور میں انھوں نے داغ دہلوی کا تلمذ اختیار کیا اور اس پر انھیں فخر بھی تھا مگر داغ کا رنگ ان کے ہاں زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہا۔ اس زمانے کی بیشتر غزلوں کو انھوں نے اپنے مستقل کلام میں شامل کرنے سے گریز کیا۔ ابتدائی دور کی روایتی اور رسمی غزل گوئی میں داغ کے ساتھ ساتھ امیر مینائی کے اثرات بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ بازار حکیماں کے مشاعروں میں شرکت کے ساتھ ساتھ، انھوں نے لاہور کے دونوں دبستانوں سے اکتساب کیا اور دونوں سے فیض یاب ہوتے رہے۔ اس سے اقبال کی ذہنی بالیدگی اور وسعت کے ساتھ ان کے مزاج کے انتخابی میلان بھی کا اندازہ ہوتا ہے۔ [۶]

لاہور کی شعری محفلوں میں شمولیت کے باوجود، اقبال کانِ نمک نہیں بنے۔ انھوں نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی۔ یوں اقبال کا شعری ارتقا برابر جاری رہا۔ اب وہ روایتی غزل سے دست کش ہوتے ہوئے رفتہ رفتہ نظم گوئی کی طرف مائل ہو رہے تھے، جس کا مزاج قومی و ملّی اور حکیمانہ تھا۔ اس تبدیلی اور تدریجی سفر کے پسِ پشت متعدد عوامل کام کر رہے ہیں۔

۲

لاہور آنے کے چند ماہ بعد ہی، اقبال انجمن کشمیری مسلمانان سے وابستہ ہو گئے تھے اور بڑی دلچسپی سے انجمن کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے تھے۔ یہ انجمن، کشمیری برادری کے چند بزرگوں نے، سماجی و معاشرتی اصلاح اور باہمی اتحاد و ترقی کے لیے قائم کی تھی۔ اقبال وقتاً فوقتاً مجلس میں نظمیں یا قطعات بھی پیش کرنے لگے۔ فروری ۱۸۹۶ء کی ایک مجلس میں انھوں نے ۲۷ اِشعار کی ایک نظم ''فلاحِ قوم'' پیش کی، [۷] جس میں انھوں نے کشمیریانِ لاہور کو عزم و عمل، اجتماعی جدوجہد اور جدید علوم کی تحصیل کا پیغام دیا۔ بعد ازاں اسی تسلسل میں انھوں نے کچھ قطعات بھی کہے، [۸] مثلاً: ایک قطعہ ہے:

سو تدابیر کی اے قوم! یہ ہے اک تدبیر
چشمِ اغیار میں بڑھتی ہے اسی سے توقیر

دُرِ مطلب ہے اخوت کے صدف میں پنہاں
مل کر دنیا میں رہو مثلِ حروفِ کشمیر [۹]

نظم گوئی کی طرف اقبال کی رغبت میں ''مشاعرۂ اتحاد'' کو بھی دخل ہے، جس میں ۱۸۹۸ء کے لگ بھگ موضوعاتی نظموں کا سلسلہ شروع ہوا۔ محمد عبداللہ قریشی کے مطابق بعض نظمیں (ہمالہ، دردِ عشق، موجِ دریا، انسان اور بزمِ قدرت وغیرہ) اسی دور کی یادگار ہیں۔ [۱۰]

۳

اس کے ساتھ ساتھ وہ حکیم شہباز الدین کی بیٹھک میں جمع ہونے والے ''آسمانِ ادب کے درخشاں ستاروں'' کی اس محفل میں بھی شریک ہونے لگے جس کا سلسلہ حکیم شجاع الدین محمد کی وفات (۱۸۹۶ء) اور حکیم امین الدین بیرسٹرایٹ لا کی پشاور منتقلی کے بعد شروع ہوا تھا۔ حکیم شہباز الدین کی بیٹھک میں ہر روز شام کو شہرِ لاہور کے متعدد ادیب اور شعرا جمع ہو کر باہم تبادلۂ خیال کرتے اور شعر و شاعری بھی کی جاتی۔

دانش وروں کی اس محفل میں اقبال بیا قاعدگی کے ساتھ حاضر ہوتے تھے۔ ان باذوق، علم دوست، ادب نواز اور عالم فاضل حضرات میں شمس العلماء مولانا عبدالحکیم کلانوری، مولوی احمد دین وکیل، مولوی سراج الدین احمد، مفتی محمد عبداللہ ٹونکی، منشی محمد دین فوق، مولانا اصغر علی روحی، خان احمد حسین خاں، شیخ عبدالقادر، خواجہ کریم بخش اور شاہ دین ہمایوں جیسے لوگ شامل تھے۔ اقبال نے اپنی متعدد نظمیں اِنھی باذوق فاضلینِ کرام کی مجلس میں پڑھیں اور داد وصول کی۔ محمد عبداللہ قریشی لکھتے ہیں کہ ان بزرگوں میں سے بعض کی جراتِ تنقید اور جوہر شناسی نے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی تربیت میں بڑا حصہ لیا۔ خود اقبال بھی جب تک ان بزرگوں کو اپنا کلام سنا نہ لیتے، ان کی تسلی نہ ہوتی تھی۔ [۱۱] اقبال کی یہ نظمیں اتنی متاثر کن تھیں کہ متعدد اصحاب نے، جو کسی نہ کسی حیثیت میں انجمن حمایتِ اسلام سے تعلق رکھتے تھے، تجویز پیش کی کہ اقبال جیسے باصلاحیت شاعر کو انجمن حمایتِ اسلام سے وابستہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ ۱۲ نومبر ۱۸۹۹ء کو اقبال کو انجمن کی مجلسِ منتظمہ کا رُکن منتخب کر لیا گیا۔ پھر اِنھی بزرگوں کی فرمائش پر اقبال نے ۲۴ فروری ۱۹۰۰ء کو پہلی مرتبہ انجمن حمایت اسلام کے پلیٹ فارم سے ایک طویل نظم ''نالۂ یتیم'' پیش کی جسے سن کر ڈپٹی نذیر احمد دہلوی نے اقبال کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا: ''میں نے ان کانوں سے انیس اور دبیر کے مرثیے سنے، مگر جس پائے کی نظم آج سننے میں آئی، اور جو اثر اس نے میرے دل پر کیا، وہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا ــــــ [۱۲]

۴

یہ واقعہ اقبال کی ملک گیر شہرت کے لیے نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔ اب وہ ہر سال انجمن کی فرمائش پر ایسی قومی اور ملی نظمیں پیش کرنے لگے جو انجمن حمایتِ اسلام کے مقاصد، نصب العین اور اس کی سرگرمیوں سے مطابقت رکھتی تھیں۔ ان نظموں میں ''یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے'' (۱۹۰۱ء) ''اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب سے'' (۱۹۰۲ء) ''ابرِ گوہر بار یعنی فریادِ امت'' (۱۹۰۳ء) اور ''تصویرِ درد'' (۱۹۰۴ء) شامل ہیں۔

ابتدا میں تو اقبال یہ نظمیں تحت اللفظ سناتے تھے، لیکن جب ان کی خوش الحانی کا چرچا ہوا تو وہ ترنم سے پڑھنے لگے۔ اقبال کا ترنم دل گداز، ان کی آواز پُر سوز اور موضوع ہر بار ایسا ہوتا تھا، جسے ''عوام کے دل کی آواز'' کہہ سکتے ہیں، چنانچہ دس دس ہزار کا مجمع، ان کی نظمیں سن کر سر دھنتا۔[۱۳] یوں منظومات کے ذریعے اقبال نے عوام و خواص سے بے پناہ خراجِ تحسین پایا۔ سامعینِ جلسہ، منظوماتِ اقبال کے مطبوعہ نسخوں کو، گراں قدر رقوم کے عوض ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔[۱۴]

گورنمنٹ کالج کے زمانہء طالب علمی میں اقبال تین چار سال تک ہوسٹل میں مقیم رہے۔ حسنِ اتفاق سے ہوسٹل میں انھیں مرزا جلال الدین اور میر غلام بھیک نیرنگ جیسے باذوق اور سخن شناس احباب سے واسطہ رہا۔ ان کا کمرہ، شعری و ادبی ذوق رکھنے والے طلبہ کی توجہ اور مجلس آرائی کا مرکز ہوتا تھا۔ اقبال کے بعض دوست، شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ نقدِ شعر کا عمدہ ذوق بھی رکھتے تھے۔ غلام بھیک نیرنگ کو اقبال کی ذات میں ''مستقبل کا غالب'' نظر آیا اور انھوں نے کلامِ اقبال کو جمع و محفوظ کرنا شروع کر دیا۔ اقبال کے مذاقِ سخن کے ارتقا میں ہوسٹل کی بے تکلفانہ شعری و ادبی محفلوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔[۱۵]

۲۲ر جنوری ۱۹۰۱ء کو ملکہ وکٹوریا فوت ہو گئیں۔ ہندستانی عوام، خصوصاً عام مسلمانوں میں اُن کے بارے میں ایک نرم گوشہ پایا جاتا تھا، کیونکہ ''مادرِ مہربان'' کے عفوِ عام کے فرمان سے ۱۸۵۷ء کے بہت سے ''باغیوں'' کو فائدہ پہنچا تھا۔ جگہ جگہ ماتمی جلسے منعقد ہوئے۔ سیالکوٹ کے جلسے منعقدہ ۲۶ر جنوری میں اقبال نے بھی تقریر کی۔ بعد ازاں لاہور کے جلسے میں ۱۱۰ر اشعار پر مشتمل ترکیب بند نظم بعنوان: ''اشکِ خوں'' پڑھی۔ اس کے ساتھ اس نظم کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کیا گیا۔[۱۶] گذشتہ صفحات میں ''مشاعرہ اتحاد'' کا ذکر ہو چکا ہے۔ ایک بار اقبال نے مشاعرے میں نظم ''ہمالہ'' پیش کی، جسے شیخ عبدالقادر نے باصرار، اقبال سے حاصل کر کے مخزن

کے شمارہ اول (اپریل ۱۹۰۱ء) میں شائع کر دیا، اس کے بعد بھی ان کا کلام مخزن میں شائع ہوتا رہا۔ انجمن کے سالانہ جلسوں کے بعد مخزن دوسرا ذریعہ تھا، جس سے اقبال کا نام اور کلام ملک کے دور دراز گوشوں تک پہنچا اور ان کی شہرت و مقبولیت میں اضافہ ہوا۔

اقبال نے انگریزی شعر و ادب کے مطالعے کا آغاز تو ایف اے اور بی اے کے زمانے سے شروع کیا تھا، اب گورنمنٹ کالج میں انگریزی کے ایڈیشنل پروفیسر مقرر ہوئے تو اس مطالعے میں اور وسعت آئی جس نے ان کی شاعری پر باعتبارِ خیالات اور باعتبارِ فن، دونوں طرح گہرا اثر ڈالا۔ اس دور کی متعدد نظمیں کسی نہ کسی حیثیت میں بعض مغربی شعرا (ٹینی سن، لانگ فیلو، ایمرسن اور ولیم کوپر وغیرہ) سے ماخوذ ہیں۔

اقبال کے ذاتی ذخیرۂ کتب میں، جو بعد میں اسلامیہ کالج لاہور کو منتقل کر دیا گیا، ورڈز ورتھ، ٹینی سن، براؤ ننگ، شیلے، تھامس گرے وغیرہ کے شعری مجموعے موجود تھے۔ ان میں سے بیشتر انیسویں صدی کے مطبوعہ ہیں۔ قرین قیاس ہے کہ دورانِ تعلیم و تدریس، یہ سب ان کے زیرِ مطالعہ رہے ہوں گے۔ بانگِ درا کی بہت سی نظموں پر "ماخوذ" کی صراحت موجود نہیں، مگر تشبیہوں، استعاروں اور تراکیب کے علاوہ اپنے اسلوبِ بیان کے لحاظ سے بھی، یہ انگریزی شاعری سے متاثر معلوم ہوتی ہے۔[۱۷] یورپی شعرا سے اقبال کی اثر پذیری کا اندازہ ان کے اس اعتراف سے لگایا جا سکتا ہے: Wordsworth saved me from atheism in my student days[۱۸] اسی لیے مظاہرِ فطرت کو اقبال کے دورِ اول کی شاعری میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ وہ مخزن کے مستقل لکھنے والوں میں سے تھے اور انھوں نے سر عبدالقادر سے مستقلاً "نئے رنگ کی نظمیں" لکھ کر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ مغربی ادب کے مطالعے، اور مخزن کے مقاصد و مزاج کے پیشِ نظر انھوں نے مغربی شعرا سے اثرات تو ضرور قبول کیے تاہم مشرقیت کی روح، اقبال کے ہاں ہمیشہ غالب رہی۔

۵

اقبال کی ۱۹۰۵ء تک کی شاعری پر مجموعی نظر ڈالیں، تو اس میں ہمیں کئی طرح کے رجحانات نظر آتے ہیں، مثلاً:

۱۔ قومی اور ملی نظموں میں وہ ہمیں ترجمانِ قوم و ملت نظر آتے ہیں۔ طویل نظموں میں سر سید احمد خاں کی تحریک علی گڑھ کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ان نظموں میں عشقِ رسولؐ

کا جذبہ، وطن کی محبت، ابنائے وطن کی فلاح و بہبود کا خیال، مذہبی فرقہ بندی کی مذمت، باہمی نفاق و افتراق اور مولویوں کی تنگ نظری اور تعصب پر اظہارِ افسوس، طبقہ اُمرا کی بے حسی اور بے دردی، اپنی وسیع المشربی اور دوسری قوموں کے ساتھ فراخ دلی اور رواداری کے ساتھ پیش آنے کی تلقین موجود ہے۔

۲۔ اس دور میں اقبال کی مفکرانہ اور فلسفیانہ حیثیت کے ابتدائی آثار بھی نظر آتے ہیں۔ بقول افتخار احمد صدیقی: ''تفکر، اقبال کی شخصیت کا ایک بنیادی عنصر ہے۔''[۱۹]

وہ ایک حساس دل رکھنے والے شاعر تھے۔'' حقائق حیات کی جستجو میں مسلسل غور و فکر اور ایک مستقل ذہنی کاوش و خلش، غالباً اس دور کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ وہ اپنے ماحول کی ہر چیز کو ایک گہری فلسفیانہ اور متجسسانہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مئی ۱۹۰۱ء کی ایک نظم ''گلِ رنگین'' (بانگِ درا، ص۴۴) کا یہ مصرع، اس دور کے اقبال کو سمجھنے میں ایک کلید کی حیثیت رکھتا ہے:

زخمیِ شمشیرِ ذوقِ جستجو رہتا ہوں میں

یا اس سے متصل نظم ''عہدِ طفلی'' کا یہ مصرع:

دل نہ تھا میرا سراپا ذوقِ استفسار تھا

اقبال کا اندازِ نظر عام شاعروں سے مختلف تھا۔ روزمرہ کے ایسے مشاہدات جنھیں عام انسان اہمیت نہیں دیتا، اقبال کی نظر میں کئی وجوہ سے قابلِ توجہ بن جاتے تھے۔ بانگِ درا کی نظمیں ''بچہ اور شمع'' یا ''شیر خوار'' یا ''کنارِ راوی'' سے اقبال کا ذہن معمولی باتوں سے بعض ایسے نتائج اخذ کرتا تھا، جن تک پہنچنے کے لیے برسوں کی فلسفیانہ ریاضت درکار ہوتی ہے ''شمع و پروانہ'' کا یہ شعر دیکھیے:

پروانہ اور ذوقِ تماشائے روشنی ،
کیڑا ذرا سا اور تمنائے روشنی[۲۰]

ایک اور نظم ''کنارِ راوی'' کو دیکھیے۔ شام کے وقت شاعر دریائے راوی کے کنارے کھڑا بہتے دریا کو دیکھ رہا ہے۔ سورج رفتہ رفتہ مغربی افق پر ڈوب جانے کو ہے۔ اچانک سینۂ دریا پر تیرتی ہوئی ایک کشتی سامنے سے گزرتی ہے اور چلتے چلتے، آہستہ آہستہ مشاہدۂ نگاہ کی حد سے باہر نکل کے غائب ہو جاتی ہے لیکن اس کا سفر برابر جاری ہے۔'' مفکر شاعر کے لیے یہ منظر، حیاتِ انسانی کے سفر کی علامت بن جاتا ہے اور وہ حیات و ممات مسئلے کو اس دل نشین پیرائے میں بیان کرتے ہیں:

جہازِ زندگیِ آدمی رواں ہے یونہیں
ابد کے بحر میں پیدا یوں ہی، نہاں ہے یونہیں
شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے، لیکن فنا نہیں ہوتا[۲۱]

اسی تفکر، تجسس اور فلسفیانہ نگاہ اور جستجو کا ایک پہلو تصوف اور متصوفیانہ نظریات کی جھلکیاں بھی ہیں، جو اس دور میں کئی طرح سے سامنے آتی ہیں، مثلاً: نظم ''شمع'' اُن کے متصوفانہ نظریات کی ترجمانی کرتی ہے۔ ایک تو تصوف کی طرف اقبال کا آبائی رجحان، دوسرے اقبال نے گورنمنٹ کالج لاہور کے زمانۂ طالب علمی میں سوامی رام تیرتھ سے سنسکرت سیکھی اور ویدانت کا مطالعہ کیا چنانچہ مختلف نظموں میں وحدت الوجود کے اثرات اپنی جھلک دکھاتے ہیں اور شاعر کو اِسی کے نتیجے میں وحدتِ اسلامی اور مذہب و ملت کے امتیازات کی نفی کے پہلو نظر آتے ہیں جو بالآخر عظمتِ آدم کے تصور کو اجاگر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کا خیال ہے کہ یہی تصور مستقبل میں ان کے فلسفہ خودی کی بنیاد بنا۔[۲۲]

۳۔ انسان دوستی اور عظمتِ آدم کا رجحان اقبال کی رومانیت سے جڑا ہوا نظر آتا ہے۔ ذوقِ تجسس اور جستجو کا رجحان تو پہلے بھی موجود ہی تھا، اب ان کی رومانیت ''خوب سے خوب تر کی آرزو میں نئی راہوں کی تلاش'' میں سرگرداں نظر آتی ہے۔ مناظر فطرت سے متعلق بانگِ درا میں شامل متعدد رومانی نظموں کی تخلیق میں ''مشاعرہ اتحاد'' کے تقاضوں کے علاوہ، گورنمنٹ کالج کے زمانۂ معلمی میں انگریزی رومانوی شاعری کے مطالعے کو بھی دخل ہے۔

۴۔ ۱۹۰۵ء تک کی شاعری میں حب وطن کا ایک گہرا جذبہ غالباً سب سے نمایاں ہے۔ وطن سے شاعر کی یہ محبت نظموں میں طرح طرح سے ظاہر ہوتی ہے، مثلاً: کہیں تو وطن کی سرزمین اور اس کے فطری مناظر کی عکاسی ملتی ہے، کہیں ہندوستان کی تاریخی عظمت کا ذکر ہے اور کہیں وطن کے پہاڑوں، میدانوں، مرغزاروں، دریاؤں اور صحراؤں کا تذکرہ ہے اور ان کے حسن و جمال کی تحسین کی گئی ہے۔ ''ہندستانی بچوں کا قومی گیت''، ''ترانۂ ملی'' اور ''نیا شوالہ'' جیسی نظموں کو قوم پرستانہ شاعری کا بہترین نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے حتیٰ کہ بعض اشعار میں شاعر کی وطنی عصبیت اس کے جذبۂ ملی پر غالب آ گئی ہے اور کہیں تو نشۂ وطنیت نے شاعر کے ملی اور تاریخی شعور کو بھی دھندلا دیا ہے۔[۲۳] مگر یہ ایک قدرتی بات تھی کیونکہ اقبال اس زمانے میں اپنے بقول ایک Zealous

Nationalist[۲۴] (پرجوش قوم پرست) تھا، جو سماجی اتحاد کو وطن کی ایک بنیاد سمجھتا تھا۔ ان کے الفاظ میں: ''خاکِ وطن کا ہر ذرہ مجھے دیوتا دکھائی دیتا تھا [کیونکہ] اس وقت میرے خیالات بہت کچھ مادیت کی طرف مائل تھے۔ سوائے وطن کے، انسانوں میں اتحاد کے لیے کوئی دوسرا ذریعہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔'' اسی دور کی نظم ''تصویرِ درد'' بھی قابلِ ذکر ہے جس میں ہندو مسلم اتحاد کی تلقین کے ساتھ، فرقہ آرائی، مذہبی تعصب اور باہمی انتشار و افتراق سے اجتناب پر زور دیا گیا ہے۔ خزاں آشنا وطن اور پریشاں حال اہلِ وطن کا سارا درد اس نظم میں سمٹ آیا ہے:

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

۵۔ لیکن اس ''قوم پرست'' شاعر کے ہاں جذبۂ حبِ وطن کے ساتھ ساتھ اپنی ملت سے ہمدردی، یک جہتی اور وابستگی کا جذبہ بھی موجود ہے۔ انجمن کشمیری مسلمانان لاہور کے جلسوں میں پیش کردہ رباعیات اور انجمن حمایتِ اسلام کے سٹیج سے پیش کردہ متذکرہ بالا نظموں میں وہ امتِ مسلمہ ہی کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ جذبۂ عشقِ رسول کا والہانہ اظہار ہے اور ''امتِ مرحوم'' کو تعصب، فرقہ بندی اور باہمی افتراق سے بچنے اور حصولِ علم نیز باہمی جذبۂ اخوت اور رواداری کے راستے پر گامزن ہونے کی تلقین ہے، مگر اس دَور کی ملی شاعری کا بیشتر حصہ متداول کلام میں شامل نہیں، اس لیے بانگِ درا میں شامل ۱۹۰۵ء تک کی شاعری میں اقبال ہمیں زیادہ تر رومان پسند، ایک فطرت دوست اور وطن پرست شاعر نظر آتے ہیں۔ خلیفہ عبدالحکیم نے اس دَور کی شاعری پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے: ''جدید وطنیت اور دردِ ملت کے ساتھ ساتھ گہرے فلسفیانہ مضامین و حکیمانہ افکار اور صوفیانہ واردات اثر انگیز شاعری کا جامہ پہن کر عالمِ ادب میں جلوہ افروز ہوئے۔ یہ تمام عناصر اور صفات اقبال کی ابتدائی دَور کی شاعری کی کتابوں میں بھی موجود ہیں۔ مصالحانہ اور مبلغانہ انداز کی جھلک اس دور میں بھی موجود ہے، لیکن ابھی مدھم ہے۔ حسن و عشق پر اعلیٰ درجے کی نظمیں موجود ہیں، ان میں عشقِ مجازی بھی موجود ہے اور عشقِ حقیقی بھی ـــــ خودی کا مضمون

____اس دَور کی شاعری میں کم نظر آتا ہے۔''[۲۵] ____ گویا ۱۹۰۵ء تک کی شاعری میں ان کے ہاں خاصا تنوع ہے۔

اس دَور کی نظم ''شاعر'' (بانگِ درا، ص ۶۱) میں اقبال نے نہایت اختصار و ایجاز کے ساتھ بتایا ہے کہ شاعر کا منصب کیا ہے یا کیا ہونا چاہیے؟ مناسب ہوگا؛ یہاں مذکورہ نظم پر ایک نظر ڈال لی جائے:

قوم گویا جسم ہے ، افراد ہیں اعضائے قوم
منزلِ صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم
محفلِ نظمِ حکومت ، چہرۂ زیبائے قوم
شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم
مبتلائے درد کوئی عضو ہو ، روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

یہاں اقبال کے شاعرانہ اور فکری ارتقا کا ایک دور ختم ہوتا ہے۔

حوالے اور حواشی

۱۔ حیاتِ اقبال کی گم شدہ کڑیاں، ص ۶۶
۲۔ روایت: احمد شجاع، لاہور کا چیلسی، ص ۴۵-۴۷؛ دما دم رواں ہے......، ص ۱۲۲
۳۔ کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال، ص ۲۴۴
۴۔ دما دم رواں ہے......، ص ۱۲۳
۵۔ کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال، ص ۲۴۶
۶۔ عروجِ اقبال، ص ۴۲
۷۔ کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال، ص ۳۲-۳۵
۸۔ ایضاً، ص ۳۱۳-۳۱۵
۹۔ ایضاً، ص ۳۱۴
۱۰۔ گم شدہ کڑیاں، ص ۹۷-۹۸
۱۱۔ ایضاً، ص ۷۹
۱۲۔ اقبال اور انجمن حمایتِ اسلام، ص ۷۰
۱۳۔ عروجِ اقبال، ص ۱۱۳

۱۴۔ تصانیفِ اقبال، ص۱۴
۱۵۔ میر غلام بھیک نیرنگ نے اپنے مضمون ''اقبال کے بعض حالات'' در: مجلّہ اقبال، لاہور، اکتوبر ۱۹۵۷ء میں اس کی تفصیل دی ہے۔
۱۶۔ نظم کا متن دیکھیے: صحیفہ، اقبال نمبر اول، اکتوبر ۱۹۷۳ء، ص ۲۱۰
۱۷۔ تصانیفِ اقبال، ص۱۵
۱۸۔ *Stray Reflections*، ص۵۴
۱۹۔ عروجِ اقبال، ص۱۴۴۔ اقبال کی شاعری پر اس تبصرے اور تجزیے میں زیادہ تر عروجِ اقبال: ص ۱۴۴-۱۷۸ سے استفادہ کیا گیا ہے۔
۲۰۔ بانگِ درا، ص۴۱
۲۱۔ ایضاً، ص۹۵
۲۲۔ عروجِ اقبال، ص۱۵۷
۲۳۔ ایضاً، ص۱۷۲
۲۴۔ *Letters & Writings of Iqbal*، ص۵۸
۲۵۔ فکرِ اقبال، ص۵۴-۵۵

❖......❖......❖

۵

......آسودگی نہیں ملتی

انسان کا سب سے قریبی تعلق بالعموم ''نصف بہتر'' سے ہوتا ہے۔ اس بحث سے قطع نظر کہ اقبال کی شادی ان کی رضا مندی سے ہوئی تھی یا اقبال سے تین سال بڑی[1] کریم بی بی ان کے ''سرمنڈھ'' دی گئی۔[2] یہ ایک حقیقت ہے کہ اقبال اور کریم بی بی کے درمیان دلی قربت اور مودّت و موانست کا وہ تعلق کبھی نہ قائم ہو سکا، جو زوجین کے درمیان ایک خوش گوار ازدواجی زندگی کے لیے ناگزیر ہوتا ہے۔

کریم بی بی کو بیاہ کر سیالکوٹ لایا گیا تھا۔ دونوں گھرانوں کی مالی حیثیت اور معاشرت میں تفاوت تھا (اور جیسا کہ بعد ازاں کھلا کہ) میاں بیوی کے طبائع میں مناسبت و موافقت نہ تھی۔ شادی کے بعد دو سال تک اقبال سیالکوٹ میں زیرِ تعلیم اور اپنے گھر میں مقیم رہے۔ کریم بی بی کبھی سیالکوٹ آ جاتیں اور کبھی اپنے میکے میں رہتیں۔ لاہور کے زمانۂ تعلیم میں ۱۸۹۹ء تک اقبال ہوسٹل میں رہے۔ یہاں بیوی کو ساتھ رکھنے کا کوئی سوال نہ تھا۔ چھٹیوں میں سیالکوٹ جاتے تو کریم بی بی کے ساتھ کچھ وقت رہنے کا موقع ملتا یا کچھ دنوں کے لیے وہ اس کے ساتھ گجرات بھی چلے جاتے۔ زمانۂ ملازمت کے آغاز (مئی ۱۸۹۹ء) سے انگلستان روانگی (ستمبر ۱۹۰۵ء) تک اقبال لاہور میں کرائے کے مختلف مکانوں میں مقیم رہے، مگر انھوں نے ''بیوی بچوں کو ساتھ نہ رکھا'' یا ''کریم بی بی نے اس مکان میں ان کے ساتھ قیام نہیں کیا۔''[3] اس زمانے میں اقبال کا ملازم علی بخش ہی کھانا بناتا۔ دیگر گھریلو کام کاج بھی اسی کے ذمے تھے۔

اس درمیان ۱۸۹۵ء میں کریم بی بی سے معراج بیگم (م: ۱۹۱۵ء) تولّد ہوئیں، پھر ۱۸۹۸ء میں اس کے بھائی آفتاب اقبال (م: ۱۹۷۹ء) پیدا ہوئے، مگر صاحبِ اولاد ہونے کے بعد بھی، میاں بیوی میں دلی قربت اور ذہنی ہم آہنگی پیدا نہ ہو سکی۔

انگلستان سے اقبال کی واپسی پر دونوں کے درمیان دُوری اَور بھی بڑھ گئی۔ اس زمانے میں

شیخ نور محمد اور شیخ عطا محمد کی کوششوں کے باوجود کریم بی بی اور اقبال ایک دوسرے کے قریب نہ آسکے۔ کریم بی بی اپنے بچوں سمیت زیادہ تر اپنے والدین کے ہاں رہنا پسند کرتی تھیں۔[۴]

۱

اس صورت حال میں لاہور کی شعری محفلیں اور علمی مجالس قلبِ حساس رکھنے والے شاعر کی ذہنی تسکین (intellectual satisfaction) کا سامان فراہم کرتی تھیں۔ بعض اوقات وہ خود، ان محفلوں میں جاکر شریک ہوتے تھے مگر کالج سے واپسی پر ان کا زیادہ تر وقت اپنے مکان ہی پر گزرتا۔ طلبہ اور دوست احباب ان سے ملنے وہیں آتے۔ جب احباب کی محفلیں جمتیں اور سلسلۂ شعر و سخن شروع ہوتا تو علی بخش چولھا گرم رکھتا، تاکہ وہ اقبال کا حقہ بار بار تیار کرتا رہے۔ وہ حقہ پیتے جاتے اور شعر کہتے جاتے۔[۵] اس طرح کی محفلوں کا ذکر شیخ عبدالقادر نے بھی کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''مَیں شام کو ان کے ہاں بیٹھتا۔ ان کے دو تین اَور دوست عموماً وہاں موجود ہوتے تھے۔ ان میں ایک تو ان کے استاد مولانا میر حسن کے فرزند سید محمد تقی تھے۔ ان کی دوستی پرانے تعلقات پر مبنی تھی۔ سیالکوٹ کے ایک اور صاحب سید بشیر حیدر بھی تھے جو اُس وقت طالب علم تھے، بعدازاں ڈپٹی ہوگئے۔ ایک اور طالب علم سردار عبدالغفور تھے جو ''ابا صاحب'' کہلاتے تھے۔ یہ سب اقبال کی شاعری کے مداح تھے۔ میں جاتا تو سلسلہ شعر و سخن شروع ہو جاتا۔ مَیں کوئی شعر یا مصرع اقبال کو سنانے کے لیے ڈھونڈ رکھتا جو ''طرح'' کا کام دیتا۔ وہ حقہ پیتے جاتے اور شعر کہتے جاتے۔''[۶]

لیکن ایسی محفلیں، ایک حد تک ہی ذہنی تسکین اور آسودگی کا مداوا بن سکتی تھی۔ ایک باطنی اضطراب اور اندرونی کشمکش (جو ازدواجی زندگی کے خلا کا نتیجہ بھی تھی) بدستور موجود تھی۔ ۱۹۰۵ء تک کی شاعری کے بعض حصے اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ:

ع تلاش جس کی ہے، وہ زندگی نہیں ملتی[۷]

۲

علامہ اقبال کی شاعرانہ شخصیت میں ابتدا ہی سے حسن و جمال کا ذوق موجود تھا۔ مناظرِ فطرت سے دلچسپی، آسمان پر کبوتروں کو اڑتے دیکھ کر اسی نظارے میں کھوئے رہنا، قصے کہانیوں کو گا گا کر پڑھنا، بعدازاں مشاعروں میں ترنم سے شعرگوئی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ ان کے کان موسیقی سے آشنا تھے اور طبیعت شاعرانہ تھی۔ ایک بار انھوں نے ستار خریدی، سیکھنے کے لیے

باقاعدہ سبق لیے اور ایک عرصے تک ساز بجانے کی مشق کرتے رہے۔[۸] ان کے دوست فقیر سید نجم الدین بھی موسیقی سے شغف رکھتے تھے۔ دونوں دوست کبھی کبھی نغمہ و طرب کی محفلیں منعقد کرتے تھے۔ اقبال موسیقی کی اچھی شناخت رکھتے تھے۔ قیامِ لاہور کے زمانے کا ایک شعر ہے:

لوگ کہتے ہیں مجھے، راگ کو چھوڑو اقبال
راگ ہے دین مرا، راگ ہے ایماں میرا[۹]

راگ رنگ کے اسی شوق اور موسیقی سے اسی دلچسپی کے سبب، اس زمانے میں وہ گانا سننے کے لیے بھاٹی دروازے ہی کے علاقے میں واقع بازارِ عیش و طرب کی طرف بھی چلے جاتے تھے۔ بعض روایات کے مطابق وہ امیر نامی ایک مغنیہ کی ''منفرد اور مہذب شخصیت''[۱۰] سے متاثر تھے۔ بعض اوقات وہ اس سے ملنے کے لیے مضطرب ہو جاتے۔ ۱۹۰۳ء میں جب وہ لاہور سے دُور فورٹ سنڈیمن (بلوچستان) کے علاقے میں ایک پُر مشقت سفر کر رہے تھے تو انھیں امیر کا خیال آیا۔ بچپن کے بے تکلف دوست سید تقی شاہ کو ایک خط میں لکھا: ''امیر کہاں ہے؟ خدا کے لیے وہاں ضرور جایا کریں۔ مجھے بہت اضطراب ہے۔ خدا جانے اس میں کیا راز ہے۔ جتنا دور ہو رہا ہوں اتنا ہی اس سے قریب ہو رہا ہوں۔''[۱۱]

ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ راقم کی تحقیق کے مطابق امیر بیگم کا تعلق گو طوائفوں کے ایک گھرانے سے تھا لیکن وہ اور اس خاندان کی دیگر خواتین تائب ہو چکی تھیں۔ اس خاندان کی بعض خواتین اپنے حسن و جمال کے ساتھ اردو اور فارسی ادب سے گہرے شغف کے سبب مشہور تھیں۔ اس دوران ان میں چند ایک کی شادیاں لاہور کی معزز شخصیات سے ہوئیں۔ امیر بیگم اردو اور فارسی اساتذہ کے کلام سے شناسا ہونے کے علاوہ خود بھی شعر کہتی تھیں۔ نہایت فصیح و بلیغ اردو میں بات چیت کرتیں۔ اس وجہ سے اقبال ان سے بے حد متاثر تھے،[۱۲] مگر موسیقی اور گانے سے اس شغف کے باوجود وہ ''ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں'' کی کیفیت میں گرفتار نہیں ہوئے۔ رات کو گانا سن کر آتے تو یہ نہیں کہ صبح مدہوش ہو کر پڑے ہوں، بلکہ صبح اپنے معمولات کے مطابق دن کا آغاز کرتے۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ: ''بزمِ طرب ہو یا محفلِ سماع، اقبال کے سحر انگیزی کے معمول میں فرق نہ آتا۔ نمازِ فجر کے بعد اُسی ذوق و شوق اور لحن و ترتیل کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت بھی کرتے۔'' بانگِ درا کی نظم ''زُہد اور رندی'' کا شعر ہے:

گانا ہے جو شب کو سحر کو ہے تلاوت

اس رمز کے اب تک نہ کھلے ہم پہ معانی

راگ رنگ کی ان محفلوں میں تو اقبال کبھی کبھار شریک ہوتے تھے، جیسے کبھی ہم مذاق دوستوں کے ساتھ ''وِیک اینڈ'' پر سیر و تفریح کا پروگرام بنا لیا جاتا ہے، لیکن جب لمبی تعطیلات ہوتیں تو وہ سیالکوٹ چلے جاتے۔

۳

لاہور کی مصروف ثقافتی قسم کی زندگی سے الگ ہو کر، ماں باپ اور بہن بھائیوں اور بچپن کے بے تکلف دوستوں کے درمیان چھٹیاں گزارنے کی خواہش بالکل ایک فطری بات تھی۔ گوشت پوست کا انسان وقتی طور پر اپنی فلسفیانہ سوچوں کو تج کر اپنوں کے درمیان کتنا خوش ہوتا ہوگا۔

سیالکوٹ پہنچ کر اقبال محسوس کرتے جیسے کسی لمبے سفر سے واپس آئے ہیں، بابا لول حج کی سالہا سال کی جہاں گردی کی طرح ـــــ اقبال، شیخ نور محمد سے گفتگو کرتے اور ''صحبتِ مادر'' کا لطف اُٹھاتے:

ع صحبتِ مادر میں طفلِ سادہ رہ جاتے ہیں ہم

اگر بڑے بھائی شیخ عطا محمد ملازمت سے رخصت پر گھر آئے ہوتے تو اُن سے تبادلہ خیال ہوتا۔ ان کی ملازمت، ان کے محکمے کے احوال، انگریزوں کی حکمرانی کی باتیں وغیرہ۔ اقبال کی بیگم کریم بی بی بھی چھٹیوں میں دونوں بچوں (آفتاب اقبال اور معراج بیگم) کے ساتھ گجرات سے سیالکوٹ آ جاتیں۔ اقبال کی چار بہنیں تھیں: فاطمہ بی اور طالع بی اُن سے بڑی تھیں اور کریم بی اور زینب بی اُن سے چھوٹی ـــــ اگر کبھی چھٹیوں میں بہنیں بھی، اپنے بچوں کے ساتھ آ جاتیں تو خوب رونق اور ہنگامہ رہتا۔ بہرحال چھٹیوں میں اقبال زیادہ تر وقت گھر میں اہل و عیال کے ساتھ گزارتے۔ کبھی کبھی گھریلو محفل بھی جمتی اور آپس میں دنیا جہان کی باتیں ہوتیں۔

تعطیلات کے زمانے میں اقبال کو بعض پرانے دوستوں اور ہم جماعتوں سے بھی تجدیدِ ملاقات کے مواقع ملتے۔ فرصت کے ان ایام میں یقینی طور پر وہ سید میر حسن کی صحبت بھی اُٹھاتے ہوں گے۔ گھر میں شیخ محمد اقبال کی وجہ سے تعطیلات کا زمانہ شیخ نور محمد اور امام بی کے لیے یقیناً موسمِ بہار کی طرح خوش گوار اور پُر مسرت رہتا ہوگا۔

اقبال کبھی کبھی اپنے سسرال گجرات بھی چلے جاتے۔ وہاں ڈاکٹر شیخ عطا محمد کا ذخیرۂ کتب بھی، ان کی دل چسپی کا باعث تھا۔ (۱۹۰۳ء میں اقبال کو فورٹ سنڈیمن کا جو سفر درپیش ہوا، اس کا

ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔)

۴

۱۹۰۴ء کی تعطیلات میں غالباً کچھ دنوں کے لیے اقبال اپنے بڑے بھائی کے پاس ایبٹ آباد چلے گئے۔ شیخ عطا محمد ملٹری ورکس میں ملازم تھے، اور اُن کا تبادلہ مختلف چھاؤنیوں میں ہوتا رہتا تھا۔ ایبٹ آباد میں ایک تو؛ سیالکوٹ اور لاہور کے مقابلے میں موسم انتہائی خوش گوار تھا، دوسرے اقبال کو وہاں کچھ ہم خیال اور ہم ذوق احباب مل گئے۔ (انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں میں پیش کردہ نظموں اور مخزن میں مطبوعہ نظم ونثر نے اقبال کو ہر جگہ غائبانہ متعارف کرا دیا تھا۔) انھی احباب کی تجویز اور اصرار پر اقبال نے ''قومی زندگی'' کے موضوع پر ایک لیکچر دیا جو بعد ازاں مخزن میں شائع ہوا۔

۲۶ صفحات کے اس طویل مقالے میں اقبال نے بتایا ہے کہ تلوار کی طاقت اور باہمی معرکہ آرائیوں کے بل پر قوموں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا وقت گزر گیا۔ اب مسابقت؛ دماغ اور تہذیب وتمدن کی بنیاد پر ہوگی اور علمی فتوحات ہی کارگر ہوں گی۔ اس تغیّر کے لحاظ سے اقوامِ ہندستان خصوصاً مسلمانوں کی موجودہ حالت کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اس کے بعد انھوں نے مختلف اقوام کی مثالیں دی ہیں، پھر ہندستان، خصوصاً مسلمانوں کی پستی اور حالتِ زار کا ذکر کیا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے نبی عربؐ نے انسان کو فطری آزادی کی تعلیم دی اور اس تمدنی انقلاب کی بنیاد دکھی، جس کے نتائج کو اس وقت تمام دنیا محسوس کر رہی ہے۔ مگر ہندستان کی حالتِ زار کو دیکھیں تو ایک مایوس کر دینے والا نظارہ سامنے آتا ہے۔ خاص طور پر مسلمانوں کی حالت اور بھی مخدوش ہے۔ افلاس، وقت کے تقاضوں سے غافل راہ نما، نمود ونمائش، فضول خرچیاں، ''دماغ شاہ جہانی، آمدنیاں قلیل'' اس صورت میں جب تک قوم اپنی حالت پر غور نہ کرے، خدا بھی اس کی حالت نہیں بدلے گا۔

اس پُرمغز مقالے میں آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ قومی ترقی کے لیے فرد کی ذاتی اصلاح ناگزیر ہے۔ پھر انھوں نے اصلاحِ تمدن، تعلیم عام، حقوقِ نسواں اور صنعت وتجارت کی ضرورت پر زور دیا ہے۔[۱۳]

یہ مقالہ اقبال کی وسعتِ مطالعہ، عمرانی بصیرت، حبِ وطن، ان کی مفکرانہ سوچ اور ان کی

شخصیت میں موجود ایک گہرے دردمندانہ عنصر کی نشان دہی کرتا ہے۔

بانگِ درا میں شامل نظم ''ابر'' بھی اسی زمانے کی یادگار ہے۔ روایت ہے کہ یہ نظم انھوں نے ایبٹ آباد کے میونسپل باغ میں بیٹھ کر لکھی تھی، جس کے عین سامنے ''سربن'' پہاڑ ایستادہ ہے۔

۵

اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کے حوالے سے، اس زمانے کے ایک واقعے کا ذکر ضروری ہے۔ گذشتہ اوراق میں ہم بتا چکے ہیں کہ شیخ عطا محمد، ملٹری ورکس میں ملازم تھے اور اس حیثیت میں ان کا تبادلہ مختلف چھاؤنیوں (کیمبل پور، پاراچنار، کوئٹہ، پشاور، ایبٹ آباد وغیرہ) میں ہوتا رہا۔

نظم ''التجائے مسافر''[۱۴] میں اپنے بڑے بھائی کا ذکر کرتے ہوئے اقبال نے کہا ہے:

وہ میرا یوسفِ ثانی، وہ شمعِ محفلِ عشق ہوئی ہے جس کی اخوت قرارِ جاں مجھ کو
جلا کے جس کی محبت نے دفترِ من و تو ہوائے عیش میں پالا، کیا جواں مجھ کو
ریاضِ دہر میں مانندِ گل رہے خنداں کہ ہے عزیز تر از جاں وہ جانِ جاں مجھ کو

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اقبال کو اپنے بڑے بھائی سے کتنی محبت تھی۔ جس زمانے میں وہ کوئٹہ میں سب ڈویژنل افسر تھے ''ایک خوفناک فوجداری مقدمے'' میں پھنس گئے۔ کہا جاتا ہے کہ مخالفین نے شیخ عطا محمد کے خلاف کسی عداوت کی بنا پر سازش کی اور ان پر جھوٹا مقدمہ بنوا کر انھیں گرفتار کرا دیا۔ اقبال کو بھائی کی مصیبت کا علم ہوا تو سخت پریشان ہوئے۔ ایک طرف تو انھوں نے لارڈ کرزن وائسرائے ہند کو سارے حالات سے مطلع کیا، دوسری طرف علی بخش کو ساتھ لے کر، کوئٹہ کے دشوار گزار سفر پر نکل کھڑے ہوئے۔ سفر کا کچھ حصہ اونٹوں پر اور کچھ گھوڑے پر طے کیا۔ ایک دن تو گھوڑے پر ۳۷ میل کا سفر کیا۔ (علی بخش کا بیان ہے کہ ''بلبل کی فریاد'' [پرندے کی فریاد] انھوں نے راستے میں ہی لکھی تھی۔[۱۵]) اقبال نے یہ مشقت اپنے بھائی کی محبت میں اٹھائی تھی۔ ان کی مشقت اور محبت بار آور ہوئی۔ لارڈ کرزن کی ہدایت پر تحقیق کی گئی اور جھوٹا مقدمہ بنانے والے افسر کا تبادلہ کر دیا گیا۔ شیخ عطا محمد رہا ہوئے، پھر باعزت طور پر بری کر دیے گئے[۱۶]۔ اقبال کا اضطراب ختم ہوا۔ اثنائے سفر، فورٹ سنڈیمن سے سید تقی شاہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں: ''آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مجھے کس قدر تکلیف ہوئی ہو گی، لیکن جو تکلیف محبت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو، وہ لذیذ ہو جاتی ہے۔''[۱۷]

اقبال اس زمانے میں، اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت جانے کا عزم کیے ہوئے تھے۔ علی بخش کا خیال ہے کہ "شاید اسی مقدمے کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کو قانون کی طرف توجہ ہوئی اور انھوں نے بیرسٹری کی تعلیم کے لیے ولایت جانے کا ارادہ کیا۔"[۱۸] قانون کی طرف توجہ تو پہلے بھی تھی، اب اس مقدمے کی وجہ سے قانون کی ڈگری حاصل کرنے کا عزم تازہ اور مزید پختہ ہو گیا ہو گا۔ ۱۹۰۴ء کی تعطیلات میں ایبٹ آباد کے قیام میں بڑے بھائی سے اس موضوع پر تبادلۂ خیال ہوا ہو گا، مگر اول تو ولایت کے سفر اور تین سال تک تعلیم کے اخراجات کے لیے اچھی خاصی رقم درکار تھی۔ دوسرے: دُور دراز اور اجنبی دیار کا سفر اور عیسائی حکمرانوں کا ملک ___ نوجوان اقبال کو وہاں بھیجنا خطرے سے خالی نہ تھا، شیخ عطا محمد کو اندیشہ ہاے دور دراز نے گھیر لیا، مگر اقبال نے طے کر لیا تھا کہ انگلستان جاؤں گا:

ع توڑ کر پہنچوں گا مَیں پنجاب کی زنجیر کو[۱۹]

حوالے اور حواشی

۱۔ زندہ رود، ص ۲۰۰

۲۔ ایضاً، اگرچہ قرائن یہ ہیں کہ اقبال رضامند نہ تھے، مثلاً عطیہ فیضی کے نام ۱۹ ر اپریل ۱۹۰۹ء کے خط میں لکھا کہ مَیں نے دوٹوک انکار کر دیا تھا۔ (اقبال از عطیہ بیگم، ص ۳۶)

۳۔ زندہ رود، ص ۱۹۹

۴۔ ایضاً، ص ۲۰۰۔ ایک دوسرے کے قریب نہ آسکنے کا ایک سبب یہ ہو سکتا تھا کہ کریم بی بی کو، معراج بیگم کے بقول: ابا کے خلاف "بدزبانی" کی عادت تھی۔ اپنے خالو خواجہ فیروزالدین کے نام ایک خط میں معراج بیگم نے لکھا: مہربانی کر کے آپ جب خط لکھا کریں تو اباجان کی کوئی بات، خواہ اچھی ہو یا بری، بالکل نہ لکھا کریں، کیونکہ والدہ صاحبہ کی زبان پھر قابو میں نہیں رہتی۔ جو کچھ آتا ہے، گیت بنائے رکھتی ہے اور ان کو ہر وقت بدزبانی سے یاد کرتی ہے۔ (ماہ نامہ شاعر بمبئی، اقبال نمبر ۱۹۸۸ء، ص ۵۴۸) اس لیے اقبال نے لکھا کہ مَیں اس کی کفالت کرنے کو تیار ہوں، مگر اسے اپنے ساتھ رکھ کر زندگی کو اجیرن بنانے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔ (اقبال از عطیہ بیگم، ص ۳۶-۳۷)

۵۔ نذرِ اقبال، ص ۸۸

۶۔ ایضاً، ص ۳

۷۔ بانگِ درا، ص ۱۹۷

۸۔ زندہ رود، ص ۱۰۷

۹۔ کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال، ص ۵۳۳
۱۰۔ عروجِ اقبال، ص ۱۲۰
۱۱۔ خطوطِ اقبال، ص ۶۸
۱۲۔ زندہ رود، ص ۲۱۳-۲۱۴
۱۳۔ مخزن، اکتوبر ۱۹۰۴ء بحوالہ مقالاتِ اقبال، ص ۷۴-۹۹
۱۴۔ بانگِ درا، ص ۹۷
۱۵۔ اقبال نامہ از حسرت، ص ۲۹
۱۶۔ زندہ رود، ص ۱۱۸
۱۷۔ خطوطِ اقبال، ص ۶۷
۱۸۔ اقبال نامہ از حسرت، ص ۲۹
۱۹۔ بانگِ درا، ص ۷۸

❖......❖......❖

(۶)

شرابِ علم کی لذّت ......

۱

اقبال، دسمبر ۱۹۰۰ء میں ہونے والے، قانون کے امتحان میں، ایک بار پھر شرکت کے خواہش مند تھے، مگر تدریسی مصروفیات کی وجہ سے ان کے لیے لیکچروں میں حاضری کی شرط پوری کرنا ممکن نہ تھا۔ استثنےٰ کے لیے ان کی درخواست چیف کورٹ کے جسٹس چیٹر جی نے نامنظور کر دی۔[۱] قدرتی طور پر اقبال کو رنج اور مایوسی ہوئی ہوگی۔ انھیں ولایت جانے کا خیال، ممکن ہے، پہلے پہل اسی موقع پر آیا ہو۔ ہندستانی طلبہ کے لیے سمندر پار جا کر، بیرسٹری کی سند حاصل کرنے کی ایک روایت موجود تھی، اقبال نے سوچا ہوگا: کیوں نہ انگلستان سے بار ایٹ لا کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس اعتبار سے جون ۱۹۰۰ء میں دوبارہ امتحان کی اجازت نہ ملنے کا یہ واقعہ، اقبال کی زندگی میں ایک اہم موڑ (turning point) کی حیثیت رکھتا ہے۔[۲]

اگلے تین چار برسوں میں اقبال کو اپنے محبوب استاد پروفیسر آرنلڈ کی قربت میسّر رہی۔ آرنلڈ کی صحبتوں نے اقبال کے دل میں مزید تعلیم کے لیے ایک چینک سی لگا دی تھی۔ ۱۹۰۴ء کے اوائل میں جب آرنلڈ ہندستان سے رخصت ہو کر واپس وطن جا رہے تھے تو انھیں بڑی گرم جوشی سے رخصت کیا گیا۔ اس موقع پر اقبال نے ''نالۂ فراق'' کے عنوان سے جو الوداعی نظم پیش کی[۳] اس کا ایک مصرع ہے:

توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر آرنلڈ نے اس نوجوان شاگرد کے دل و دماغ میں ایسا ''سودائے علم'' بھر دیا تھا کہ اس نے اسی زمانے سے یورپ جانے کا عزم کر لیا۔ بیگم ڈاکٹر سٹراٹن کے نام اقبال کے ایک خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ یا کینیڈا جانے کا خیال ان کے ذہن میں ۱۹۰۲ء میں بھی موجود تھا۔[۴]

اقبال کو ۱۸۹۹ء میں اورینٹل کالج کی معلّمی کی ملازمت مل گئی تھی۔ اب وہ ۴، ۵ سال سے

صاحب روزگار تھے۔ تنخواہ سے کچھ نہ کچھ رقم پس انداز بھی کرتے تھے۔[۵] مگر انگلستان کے سفر، وہاں کے تین سالہ قیام اور تعلیمی اخراجات کے لیے اچھی خاصی رقم درکار تھی۔ اقبال کے بے تکلف دوست شیخ عبدالقادر نے مئی ۱۹۰۴ء میں انگلستان کے لیے رختِ سفر باندھا۔ اس سے اقبال کا عزم سفر پھر تازہ ہو گیا[۶] بلکہ ان کے "سمندِ شوق کے لیے ایک اور تازیانہ" بن گیا[۷] یہ ذکر آ چکا ہے کہ ۱۹۰۴ء کی تعطیلاتِ گرما میں اقبال بڑے بھائی کے پاس ایبٹ آباد گئے اور ان سے اپنے ارادے کا ذکر کیا مگر وہ رضامند نہ ہوئے، مگر اقبال کی نیّت بخیر اور عزم صمیم تھا۔ سیّد میر حسن کی سفارش کام آئی۔ اقبال کے ایک بھانجے پروفیسر منظور احمد راوی ہیں کہ شیخ عطا محمد "اقبال کو ولایت بھیجنے کے حق میں نہ تھے۔ مولوی میر حسن کے اصرار نے راضی کیا۔ وہ بار بار کہتے کہ تو نہیں جانتا، اقبال کیا ہے۔ میں جانتا ہوں۔"[۸] چنانچہ شیخ عطا محمد انگلستان میں اقبال کی اعلیٰ تعلیم کے اخراجات اُٹھانے کے لیے تیار ہو گئے۔

اس دوران میں شیخ عبدالقادر اپنے خطوں کے ذریعے اقبال کے عزم سفر کو مہمیز دیتے رہے، مثلاً وہ خطوں میں لکھتے کہ آرنلڈ سے ملاقات رہتی ہے اور ان سے فرانسیسی زبان سیکھ رہا ہوں۔[۹] اس طرح کی باتوں سے اقبال کا "سودائے علم" تازہ ہو جاتا۔ ۱۹۰۵ء کے اوائل میں مرزا جلال الدّین انگلستان سے بیرسٹری کی سند لے کر واپس آئے، تو شیخ عبدالقادر کے حسبِ ہدایت اقبال ان سے دوبار ملے اور انگلستان کے سفر، وہاں قیام اور تعلیم کے متعلّق معلومات حاصل کیں۔[۱۰] مختصر یہ کہ اقبال نے ۱۹۰۵ء میں انگلستان جانے کا پروگرام بنا لیا اور شیخ عبدالقادر کو مطلع کر دیا۔

۲

یکم ستمبر ۱۹۰۵ء کو اقبال بذریعہ ریل لاہور سے دہلی روانہ ہوئے۔ دہلی میں حضرت نظام الدین اولیا کے مزار پر عالم تنہائی میں نظم "التجائے مسافر"[۱۱] پڑھی:

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شرابِ علم کی لذّت کشاں کشاں مجھ کو
مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے
کہ سمجھے منزلِ مقصود کارواں مجھ کو

پھر قریب ہی واقع مرزا غالب کی قبر پر اور بعد ازاں ہمایوں اور دارا شکوہ کے مقبروں پر فاتحہ خوانی کی۔ اگلے روز دہلی سے روانہ ہو کر ۴ ستمبر کو بمبئی پہنچے۔ بمبئی وہ پہلی دفعہ آئے تھے۔ اُن کے لیے یہ

بالکل ایک نئی دنیا تھی۔ ایک خط میں اس کا ذکر یوں کیا ہے:

''میں بمبئی یعنی بابِ لندن کی کیفیت دیکھ کر حیران ہوں ..... عجب شہر ہے، بازار کشادہ، ہر طرف پختہ سر بفلک عمارتیں ہیں کہ دیکھنے والے کی نگاہ ان سے خیرہ ہوتی ہے۔ بازاروں میں گاڑیوں کی آمدرفت اس قدر ہے کہ پیدل چلنا محال ہو جاتا ہے۔ اس شہر کی تعلیمی حالت عام طور پر نہایت عمدہ معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے ہوٹل کا حجام ہندستان کی تاریخ کے بڑے بڑے واقعات جانتا تھا۔'' [۱۲]

۴ ستمبر کو بمبئی سے بحری جہاز کے ذریعے انگلستان روانہ ہو گئے۔

دہلی کے مختصر قیام اور بمبئی سے لندن تک کا احوال سفر انھوں نے مولوی انشاء اللہ خاں کے نام دو خطوں میں تفصیل سے رقم کیا ہے۔ یہ ایک قسم کا سفر نامہ بھی ہے، جسے پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ ''یہ کم آمیز و سفر گریز فلسفی شاعر... ایک طالب علمانہ ذوقِ تجسس لے کر نکلا اور آغازِ سفر ہی میں ہر نئے ماحول کے نو بہ نو تجربات و مشاہدات کے خزانے سمیٹنے کے لیے ہمہ تن چشم بن گیا۔'' [۱۳] ان خطوں میں اقبال نے اپنے مشاہدات کے ساتھ بعض شخصیات اور بعض چیزوں کے بارے میں اپنے جذبات و احساسات کا ذکر بھی کیا ہے، مثلاً حضرت محبوب الٰہی کا مزار، بمبئی کا ماحول، پارسیوں، چینیوں اور ترکوں کا ذکر، ہندی مسلمانوں کا انحطاط، بحری جہاز میں فرانسیسیوں کی خوش خلقی اور ان کا حسنِ انتظام، سمندر کا نظارہ، طلوعِ آفتاب کا حسن، ساحلِ عرب سے گزرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک جذباتی اور قلبی وابستگی کا والہانہ اظہار، بعض ہم سفروں کا تعارف، ساحلِ مصر، سویز اور پورٹ سعید سے گزرتے ہوئے اسلامی اخوت کے چند تجربات وغیرہ۔ بحیرۂ روم سے گزرتے ہوئے ان کی طبیعت شعر گوئی پر مائل ہوئی تو انھوں نے وہ معروف غزل کہہ ڈالی (بانگِ درا: ص ۱۴۹)، جس کا آغاز یوں ہوتا ہے:

مثال پرتوِ مے طوفِ جام کرتے ہیں
یہی نماز ادا، صبح و شام کرتے ہیں

۲۴ ستمبر کو لندن پہنچنے پر شیخ عبدالقادر نے اپنے دیرینہ دوست کا والہانہ استقبال کیا اور باوجود ان کے انگریزی لباس کے انھیں ''دور سے پہچان لیا اور دوڑ کر بغل گیر ہو گئے.... دوسری صبح سے کام شروع ہوا۔'' [۱۴]

۳

اقبال لاہور سے چلے تو بمبئی کو دیکھ کر بہت حیران ہوئے تھے۔ اب لندن پہنچ کر اس کی گہما گہمی اور چکا چوند کو دیکھ کر اور بھی حیران ہوئے ہوں گے، ممکن تھا کہ کچھ پریشان بھی ہوتے، مگر انھیں ہم دمِ دیرینہ شیخ عبدالقادر کی موجودگی کی وجہ سے اس اجنبی ماحول اور دیارِ غیر میں درپیش مسائل سے عہدہ برآ ہونے میں بہت مدد ملی، بلکہ خاصی سہولت رہی۔ جہاں تک تعلیمی امور و مسائل کا تعلق ہے، اس ضمن میں پروفیسر آرنلڈ ہی ان کے مشیر اور راہ نما تھے، بلکہ بقول ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی: ''پروفیسر آرنلڈ نے ان کی آمد سے پہلے، ان کی تعلیم کا سارا منصوبہ طے کر رکھا تھا۔''[۱۵] اقبال نے اس موقع پر، یقیناً آرنلڈ سے بھی مشاورت کی ہوگی۔

بہرحال لندن میں دو تین روز ٹھہر کر وہ کیمبرج چلے گئے۔ یکم اکتوبر ۱۹۰۵ء کو انھوں نے Advanced Student، یعنی ایسا طالب علم، جس کے پاس پہلے سے کسی اور یونی ورسٹی کی بی اے یا ایم اے کی ڈگری ہو) کے طور پر کیمبرج کے ٹرنٹی کالج میں داخلہ لے لیا،[۱۶] مگر سفرِ انگلستان کی اصل غایت تو بیرسٹری کی سند کا حصول تھا، اس لیے اگلے ہی ماہ اقبال لندن آئے اور ۶ر نومبر کو قانون کی تعلیم کے معروف ادارے ''لنکنز اِن'' میں داخلہ لے لیا۔[۱۷]

ٹرنٹی کالج میں انھیں ایک پوسٹ گریجوایٹ سکالر کی حیثیت سے Advanced Student کے لیے خصوصی قواعد کے تحت بی اے کے امتحان کے لیے مقالہ لکھنے کی اجازت دی گئی[۱۸] اور وہ The Genesis of Meta-Conceptions in Persia کے موضوع[۱۹] پر ایک تحقیقی مقالہ لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ موضوعِ تحقیق کے سلسلے میں پروفیسر آرنلڈ کا مشورہ شامل رہا ہوگا۔ مقالے کے ضمن میں لوازمے کی فراہمی کے لیے اقبال؛ خواجہ حسن نظامی سے بھی اعانت و مدد کے خواست گار ہوئے اور کام شروع کرتے ہی انھیں ۸ر اکتوبر کو خط لکھ کر بعض استفسارات کیے۔[۲۰] یہ ان کی حد درجہ مستعدی اور اپنے کام میں انہماک کی علامت تھی۔

ٹرنٹی کالج، کیمبرج یونی ورسٹی کا سب سے بڑا اور انگلستان کا ایک ممتاز کالج ہے۔ بعض نامور شخصیات مثلاً نیوٹن، بائرن، ٹینی سن اور برٹرنڈرسل نے اسی کالج سے تعلیم حاصل کی۔ کالج کے ڈائننگ ہال میں قدیم طلبہ کی تصویریں آویزاں ہیں۔ (ڈاکٹر سعید اختر درانی کی مساعی سے یہاں پاکستان کے نامور مصور گل جی مرحوم کا بنایا ہوا، اقبال کا ایک پورٹریٹ بھی لگایا گیا تھا، لیکن پھر کسی وجہ سے اسے اتار کر کسی حفاظت خانے میں رکھ دیا گیا ہے۔)

کیمبرج میں اقبال کو یونی ورسٹی کے تجربہ کار، قابل اور اپنے اپنے موضوع پر بڑی مہارت اور تخصص رکھنے والے اساتذہ سے استفادے کا موقع ملا۔ وہ اساتذہ کے لیکچروں میں بھی شریک ہوتے اور فرصت کے اوقات میں ان سے خصوصاً پروفیسر میک ٹیگرٹ (Mc Taggart) سے تبادلۂ خیال اور بحث و مباحثہ کرتے، مقصود تھا استفادۂ علمی۔ فلسفے کے اساتذہ کے علاوہ پروفیسر نکلسن (R.A Nicholson) ڈاکٹر براؤن (E.G. Browne) جیسے نامور مستشرقین سے بھی اقبال کے روابط قائم ہوئے اور اقبال نے اپنی ذہانت سے سب کو متاثر کیا۔[۲۱]

اساتذہ سے راہ نمائی اور علمی استفادے کے ساتھ اقبال بھی، دوسرے ریسرچ سکالروں کی طرح اپنی تحقیق کے لیے ضروری لوازمے کی تلاش میں مختلف کتب خانوں میں جاتے ہوں گے۔[۲۲] مقالے کے موضوع سے ہٹ کر بھی وہ مختلف علوم کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ ایک بار انھوں نے جناب ممتاز حسن کو بتایا کہ جب میں کیمبرج میں تھا تو فلسفے کے ساتھ ساتھ معاشیات کا مطالعہ بھی اس غرض سے بھی کیا کرتا تھا" اور کبھی کبھی اس [معاشیات] کے درس میں بھی شریک ہوتا" کہ طبیعت کا توازن قائم رہے۔[۲۳]

اقبال طبعاً کم آمیز تھے، اس لیے کیمبرج میں وہ زیادہ تر اپنی علمی تحقیقات ہی میں مصروف رہتے تھے، پھر بھی غیر نصابی سرگرمیوں اور دوست احباب سے میل ملاقات اور سیر و تفریح کے لیے بھی کچھ نہ کچھ وقت ضرور نکالتے تھے۔ کالج سے باہر ان کا سب سے زیادہ رابطہ شمس العلماء ڈاکٹر سیّد علی بلگرامی سے رہا۔ وہ کیمبرج میں مرہٹی زبان کے استاد تھے۔ انھیں مشرق و مغرب کی ۱۴ زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ ہندستانی طالب علموں کے لیے اُن کی شخصیت میں بڑی کشش تھی۔ طلبہ ان کے گھر آتے تو وہ اور ان کی بیگم سب سے حد درجہ تواضع کے ساتھ پیش آتے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے۔ لندن سے شیخ عبدالقادر اور عطیہ فیضی بھی آ کر علی بلگرامی کی مجالس میں شریک ہوتے۔ اس طرح اقبال کو کیمبرج کے بہت سے فاضل اساتذہ اور طلبہ سے میل ملاقات کا موقع ملتا رہتا تھا۔ اس زمانے میں میاں شاہ نواز بھی کیمبرج میں تھے، ممکن ہے وہ بھی کبھی ان مجالس میں آتے ہوں۔[۲۴] ڈاکٹر سیّد علی بلگرامی کے ہاں ان صحبتوں کے علاوہ سب لوگ مل کر کبھی کبھار کسی پکنک پارٹی کا اہتمام بھی کرتے مثلاً یکم جون ۱۹۰۷ء کو پروفیسر آرنلڈ نے کیم ندی کے کنارے، ایک درخت کے نیچے ایسی ہی ایک مجلس آراستہ کی جس میں متعدد طلبہ کے ساتھ بعض نامور فضلا اور اساتذہ بھی شریک تھے۔ محفل میں ہلکی پھلکی گفتگو کے ساتھ سنجیدہ اور فلسفیانہ مسائل

پر بھی بات چیت ہوتی رہی۔ اقبال سمجھتے تھے کہ اس طرح کے تبادلۂ خیال اور بحث مباحثے سے خیالات میں وسعت اور پختگی پیدا ہوتی ہے۔[۲۵]

تقریباً ڈیڑھ پونے دو سال کے اس قیام میں، اقبال کیمبرج کے مختلف علاقوں میں مقیم رہے، مثلاً ۱۷۔ پرتگال پلیس (17-Portugal Place) جہاں ڈاکٹر سعید اختر درانی اور معروف انگریز صحافی اور تاریخ نویس جناب آئن اسٹیفنز (Ian Stephens، م: ۱۹۸۴ء) کی کوششوں سے اقبال سے ایک انتسابی تختی نصب کی گئی ہے۔ اُن کی دوسری اقامت گاہ ۱۰ کاسل سٹریٹ اور تیسری اقامت گاہ ۹۰ ہنٹنگ ڈن روڈ تھی۔[۲۶]

موسمِ گرما کی تعطیلات میں وہ زیادہ تر وہیں کیمبرج ہی میں مقیم رہے ہوں گے۔ کبھی کبھار سیّد علی بلگرامی کے ہاں حاضری دیتے اور اکثر وہ لندن چلے جاتے، کیونکہ لنکنز ان کے عشائیوں میں شرکت ضروری تھی۔ اس سلسلے میں بعض اوقات انھیں دو دو ہفتے لندن میں ٹھہرنا پڑتا تھا۔ ایسے مواقع پر وہ بالعموم اپنے عزیز دوست شیخ عبدالقادر کے ہاں مقیم ہوتے۔

آرنلڈ سے تو مستقلاً رابطہ رہتا ہی تھا، البتہ کبھی کبھار چند دنوں کے لیے کسی انگریز دوست کے ساتھ اس کے گھر چلے جاتے[۲۷] اس طرح اقبال کو انگلستان اور سکاٹ لینڈ کے دیہی علاقوں، وہاں کی معاشرت اور تمدن کا بچشمِ خود مشاہدے کا موقع ملتا رہتا تھا۔

اقبال نہایت سمجھ دار، ذہین اور فہیم طالب علم تھے۔ کیمبرج میں قیام کے دوران، ان کی پوری توجہ اسی ''کام'' پر رہی، جو اُن کے اپنے بقول ''عبادت'' کی طرح ''مقدس'' تھا۔[۲۸] ان کا زیادہ تر وقت مقالے کی تیاری (= ''عبادت'') میں گزرتا تھا۔ غالباً اسی علمی انہماک کے زمانے میں، انھوں نے شعر گوئی ترک کر کے اُس وقت کو کسی ''مفید کام'' میں صرف کرنے کا عزم کیا تھا۔[۲۹] مقالے کے ساتھ قانون کے امتحان کی تیاری بھی جاری تھی۔[۳۰] اس سارے عرصے میں، خصوصاً ۱۹۰۶ء کے دوران میں وہ سخت محنت سے کام لے رہے ہوں گے۔

۴

غالباً کیمبرج میں قیام کے دوران کسی وقت اقبال کو پی ایچ ڈی کرنے کا خیال آیا۔ پروفیسر آرنلڈ نے انھیں اس طرف متوجہ کیا ہوگا۔ (ممکن ہے، اس تجویز میں) کیمبرج یونی ورسٹی کے بعض اساتذہ کا بھی دخل ہو۔[۳۱] اس زمانے میں انگلستان میں پی ایچ ڈی نہیں ہوتی تھی۔ کیمبرج

میں پی ایچ ڈی ڈگری کے قواعد، پہلے پہل، یونی ورسٹی نے مئی ۱۹۲۱ء میں مرتب کیے اور اولین طالب علم نے اسی سال داخلہ لیا۔[۴۲] بقول ڈاکٹر سعید اختر درانی: "کیمبرج کے ہونہار طلبہ کو جرمنی سے پی ایچ ڈی لینے کی تشویق کی جاتی تھی۔"[۴۳]

طے پایا کہ اقبال پی ایچ ڈی کے لیے جرمنی چلے جائیں۔ ذاتی طور پر اقبال، جرمنوں کے مدّاح تھے اور کہا کرتے تھے: "اگر علم کو پختہ کرنا ہو تو جرمنی جاؤ۔"[۴۴] ان کے انگلستان کے حلقۂ احباب میں کئی جرمن فاضل شامل تھے۔ مزید برآں پروفیسر آرنلڈ نے ایک بار ایک نایاب مخطوطے پر تحقیق کے سلسلے میں، اقبال کو جرمنی بھیجنے کی تجویز بھی پیش کی تھی۔[۴۵] ان عوامل کی بنا پر، انھوں نے جرمنی سے پی ایچ ڈی کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا اور اپنے بڑے بھائی اور مالی سرپرست شیخ عطا محمد سے مزید کچھ رقم بھیجنے کی درخواست کی۔[۴۶]

اندازہ ہے کہ میونخ سے اقبال کے پی ایچ ڈی کے سلسلے کے متعدد امور بذریعہ خط کتابت ۱۹۰۷ء کے ابتدائی مہینوں یا وسط جولائی تک طے کر لیے گئے۔ خرم علی شفیق کا خیال ہے کہ "آرنلڈ جرمن پروفیسروں سے خط کتابت کرتے رہے تھے تاکہ اقبال کو اسی مختصر عرصے میں ڈگری مل جائے۔"[۴۷]

۵

لندن میں اکثر ہندوستانی طالب علم مس بیک (Miss Beck) کے ہاں قیام کرتے تھے۔ وہ علی گڑھ کالج کے ہر دل عزیز پرنسپل تھیوڈور بیک (Theodore Beck م: ۲/ ستمبر ۱۸۹۹ء) کی بہن تھیں۔ ہندستانی طلبہ سے ان کا رویہ بہت مشفقانہ ہوتا تھا۔[۳۸] عطیہ فیضی ان دنوں لندن میں مقیم تھیں۔ ان سے اقبال کی پہلی ملاقات یکم اپریل ۱۹۰۷ء کو مس بیک کے ہاں ہوئی، جب وہ سیّد علی بلگرامی اور بیگم بلگرامی کی طرف سے، عطیہ کو کیمبرج بلانے کے لیے آئے۔[۳۹]

عطیہ فیضی کا تعلق ریاست جنجیرہ کے حکمران خاندان سے تھا۔ وہ ایک ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ حصول تعلیم کے لیے کسی ہندستانی خاتون کا بیرون ملک سفر اور لندن میں قیام، اس زمانے میں نسبتاً ایک انوکھی اور غیر معمولی بات تھی، کیونکہ اس وقت تک خود انگلستان، مرد و زن کی برابری کے تصور سے کوسوں دور تھا اور عورتیں ووٹ دینے کے حق سے محروم تھیں، بلکہ خواتین کے لیے رائے دہی کا حق مانگنا بھی جرم تھا۔[۴۰]

یکم اپریل کی پہلی ملاقات کے بعد سے وسط جولائی تک لندن اور کیمبرج میں خورد و نوش کی

بعض تقریبات میں عطیہ سے متعدد بار اقبال کی ملاقات ہوئی۔ ان غیر رسمی تقریبات میں سیّد علی بلگرامی، شیخ عبدالقادر اور بعض اساتذہ اور ریسرچ اسکالر بڑے بے تکلفانہ ماحول میں باہم گفتگو کرتے، علمی بحث مباحثہ ہوتا اور ہنسی مذاق بھی۔ ان ملاقاتوں میں اقبال اور عطیہ بیگم کو ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملتا رہا۔

۶

ستمبر ۱۹۰۵ء میں اقبال انگلستان پہنچے تھے۔ ۱۹۰۶ء کا پورا سال تعلیمی، علمی اور تحقیقی مشاغل و مصروفیات میں گزر گیا، اب ۱۹۰۷ء شروع ہو چکا تھا۔

آخر پونے دو سال کی محنتِ شاقہ کے بعد، اقبال نے آخر اپریل یا اوائل مئی میں مقالہ مکمل کر لیا۔ پروفیسر سورلی (W.R.Sorley) اور ڈاکٹر رینولڈ نکلسن، ان کے ممتحن (refree) تھے۔[۴۱]

۷ مئی ۱۹۰۷ء کو سپیشل بورڈ آف مارل سائنسز نے ان کا مقالہ منظور کر لیا اور انھیں سندِ تحقیق جاری کر دی گئی۔ ۱۳ جون ۱۹۰۷ء کو انھیں بی اے کی ڈگری بھی مل گئی۔[۴۲]

جون میں یونی ورسٹی میں موسم گرما کی تعطیلات شروع ہو گئیں، اس لیے وہ جون کے تیسرے ہفتے میں لندن آ گئے۔ انھی دنوں شیخ عبدالقادر بیرسٹری کی تکمیل کر کے واپس وطن روانہ ہوئے۔

اقبال تقریباً ایک ماہ لندن میں مقیم رہے۔ اس دوران (غالباً ۱۹ جون سے ۱۷، ۱۸ جولائی تک) وہ سفرِ جرمنی کی تیاری کرتے رہے اور عطیہ بیگم اور پروفیسر آرنلڈ کی دعوتوں میں بھی شریک ہوتے رہے جن میں خورونوش کے ساتھ علمی مسائل پر تبادلۂ خیال اور بحث مباحثہ بھی ہوتا تھا۔[۴۳]

اقبال کے لیے لندن میں ایک ماہ کا یہ قیام، غیر معمولی مصروفیت کا زمانہ تھا۔

انھی دنوں انھوں نے جرمن زبان سیکھنا شروع کر دی تھی (ایک روایت کے مطابق اس کا آغاز، کیمبرج ہی سے ہو گیا تھا۔) چند ہی روز میں ''شرابِ علم کی لذّت'' انھیں کشاں کشاں اپنے دوسرے ''روحانی وطن'' (= جرمنی) لے جانے والی تھی۔[۴۴]

حوالے اور حواشی

۱۔ *Letters & Writings of Iqbal*، ص ۳۶

۲۔ ایضاً۔ اس اعتبار سے شیخ عبدالقادر کا یہ خیال درست نہیں کہ اقبال کو انگلستان جانے کا خیال، میرے وہاں جانے سے ہوا (نذرِ اقبال، ص ۸۸)) شیخ عبدالقادر مئی ۱۹۰۴ء میں انگلستان گئے تھے۔

۳۔ بانگ درا، ص ۷۷
۴۔ Letters & Writings of Iqbal، ص ۱۲۱
۵۔ زندہ رود، ص ۱۲۹
۶۔ نذر اقبال، ص ۱۶۳
۷۔ افتخار احمد صدیقی: عروجِ اقبال، ص ۲۹
۸۔ روایات اقبال، ص ۱۷۹
۹۔ نذر اقبال، ص ۱۷۶
۱۰۔ روایات اقبال، ص ۱۰۰
۱۱۔ بانگ درا، ص ۹۶
۱۲۔ خطوط اقبال، ص ۸۴، ۸۵
۱۳۔ افتخار احمد صدیقی۔ ایضاً، ص ۲۹۸
۱۴۔ خطوط اقبال، ص ۱۰۳
۱۵۔ عروج اقبال، ص ۲۹۸
۱۶۔ اقبال یورپ میں، ص ۱۰۵
۱۷۔ ایضاً، ص ۱۴۴؛ عروج اقبال، ص ۲۹۸
۱۸۔ عروجِ اقبال، ص ۲۹۹
۱۹۔ آخر شب، ص ۴۴۔ ممکن ہے ابتدائی طور پر اقبال کو یہ موضوع تحقیق ملا ہو، بعد ازاں دورانِ تحقیق کسی مرحلے پر عنوان میں شاید تبدیلی کر دی گئی، کیونکہ ان کی سند پر عنوان مقالہ مختلف ہے اور یہ وہی ہے جو مطبوعہ مقالے کا عنوان ہے۔
۲۰۔ اقبال نامہ، ص ۶۰۵
۲۱۔ عروج اقبال، ص ۳۰۱
۲۲۔ زندہ رود، ص ۱۳۹
۲۳۔ مقالاتِ ممتاز، ص ۳۰۹
۲۴۔ آخر شب، ص ۴۲
۲۵۔ عطیہ بیگم: اقبال، ص ۱۳، ۱۵۔ سید علی بلگرامی کی مجالس اور لندن میں اقبال کے شب و روز، ان کی سرگرمیوں اور مصروفیات کے بارے میں عطیہ بیگم کی یہی کتاب سب سے بڑا ماخذ ہے، اگرچہ عطیہ بیگم کے بیانات کو من و عن قبول نہیں کیا جا سکتا۔
۲۶۔ اقبال یورپ میں، ص ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۳ [راقم کو جون ۲۰۰۸ء میں اقبال کی تینوں قیام گاہوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ ۱۷؍ پرتگال پلیس تو ٹرنٹی کالج کے قریب ہی واقع ہے، مگر دوسری اور تیسری قیام گاہیں، قدرے فاصلے پر ہیں۔]
۲۷۔ زندہ رود، ص ۱۴۲

۲۸۔ خطوط اقبال، ص ۱۰۳

۲۹۔ دیباچہ: بانگ درا، ص ۱۵۔ شیخ عبدالقادر نے تفصیل سے بتایا ہے کہ اقبال نے بڑی سنجیدگی سے شعر و شاعری سے دست کش ہونے کا ارادہ کرلیا تھا مگر شیخ صاحب اور پروفیسر آرنلڈ اقبال کو اس ارادے سے باز رکھنے میں کامیاب ہوگئے۔

۳۰۔ زندہ رود، ص ۱۴۲

۳۱۔ اقبال یورپ میں، ص ۱۰۷

۳۲۔ عروج اقبال، ص ۲۹۹

۳۳۔ اقبال یورپ میں، ص ۲۳۹

۳۴۔ اقبال: عطیہ بیگم، ص ۸۴

۳۵۔ ایضاً، ص ۸۰-۸۱

۳۶۔ آثار اقبال، ص ۳۶

۳۷۔ آخر شب، ص ۹۶

۳۸۔ زندہ رود، ص ۱۴۴۔ طلبہ کے ساتھ محبت او رشفقت اور ان کی مدد، غالباً ان کا خاندانی مزاج تھا۔ تھیوڈور بیک کے بارے میں مولانا حالی کا شعر ہے:

نہ دیکھی ہوں جنھوں نے شفقت و طاعت کی تصویریں\
وہ بک اور اس کے شاگردوں کو باہم ہم سخن دیکھیں

۳۹۔ اقبال، ص ۱۰

۴۰۔ آخر شب، ص ۳۹

۴۱۔ اقبال یورپ میں، ص ۲۶۹

۴۲۔ عروج اقبال، ص ۲۹۹، اقبال، یورپ میں، ص: ۲۳۸، آخر شب، ص: ۹۳

۴۳۔ اقبال: عطیہ بیگم، ص ۸۰، ۸۴

۴۴۔ اقبال یورپ میں، ص ۲۱۵

❖......❖......❖

۷

......آ خر مِل گیا وہ گُل مجھے

۱۸ تا ۲۰ جولائی کو (کسی روز) لندن سے براہِ راست میونخ پہنچے اور یہاں کی لڈوِگ میک ملین یونی ورسٹی میں درخواست گزاری کہ انھیں پی ایچ ڈی کے لیے *The Development of Metaphysics in Persia* کے عنوان سے جرمن یا لاطینی کے بجائے انگریزی زبان میں مقالہ پیش کرنے کی اجازت دی جائے۔ (قبل ازیں غالباً پروفیسر آرنلڈ کی وساطت سے اس ضمن میں) اجازت ملنے پر اقبال نے مقالہ جمع کرادیا اور بطور فیس ساٹھ جرمن مارک بھی۔ ڈاکٹر سعید اختر درانی کے مطابق ۱۹۹۵ء میں یہ رقم چار ہزار پاکستانی روپوں کے برابر بنتی تھی۔[۱]
یونی ورسٹی نے اقبال کو، ان کی درخواست پر، جرمنی میں تین سالہ لازمی قیام سے مستثنیٰ قرار دے دیا، البتہ یہ شرط عائد کی کہ انھیں تین ماہ جرمنی میں مقیم رہ کر جرمن زبان سیکھنی ہوگی۔ زبانی امتحان جرمن میں ہوگا، چنانچہ ضروری دفتری کارروائی کے بعد وہ میونخ سے ہائیڈل برگ چلے گئے۔

۱

ہائیڈل برگ پہنچ کر اقبال دریائے نیکر کے کنارے واقع شیرر منزل یا اقامت خانۂ شیرر (Pension Scherrer) میں جاگزیں ہوئے۔ غالباً کیمبرج میں کسی شخص نے انھیں یہاں کا پتا دیا تھا۔ یہ ایک پرائیویٹ ہوسٹل تھا (بقول اقبال: ''ہائیڈل برگ سکول'') جسے ایک ستر سالہ خاتون فراہیرن چلا رہی تھیں۔ یہاں زیادہ تر ایسے غیر ملکی طلبہ قیام پذیر تھے جو جرمن زبان سیکھنا چاہتے تھے۔ فراہیرن نے ایما ویگے ناسٹ اور سینے شال کو اپنے ہاں ٹیوٹر مقرر کر رکھا تھا، وہ خود بھی پڑھاتی تھیں۔ اس اعتبار سے ہائیڈل برگ میں اقبال کے لیے شیرر منزل موزوں ترین قیام گاہ تھی۔[۲]
اقبال نے جرمن زبان سیکھنا شروع کی۔ ان کا زیادہ تر واسطہ ایما ویگے ناسٹ (Emma Wegenast، ۲۰ اگست ۱۸۷۹ء۔ ۱۶/ اکتوبر ۱۹۶۴ء) سے رہا جس کا وطن جرمنی ہی کا ایک شہر

ہائیل برون(Heilbronn) تھا۔ ایما کے حالات میں اس کی بڑی بہن سوفی ویگے ناسٹ (Sofie Wegenast) اور ایک بھائی کارل (Karl) کا بھی ذکر آتا ہے۔ ایما نے یونی ورسٹی کی تعلیم ہائیڈل برگ سے مکمل کی اور پھر شیر منزل میں بطور ٹیوٹر اس کا تقرر ہو گیا۔ ویگے ناسٹ خاندان میں ایما کو "اس گھرانے کا دماغ" (The Brain) سمجھا جاتا تھا۔[۳]

اگرچہ یونی ورسٹی نے تو جرمنی میں تین ماہ قیام کی شرط جرمن زبان دانی میں مہارت پیدا کرنے کے لیے لگائی تھی لیکن قیامِ جرمنی کا یہ زمانہ، ذوقِ جمال کی تسکین اور جمالیاتی مشاہدے کے اعتبار سے شاعر اقبال کی زندگی کا ایک یادگار زمانہ بن گیا۔

وہ ایما کے ساتھ خاصا وقت گزارتے۔ جرمن زبان کا سبق لیتے اور غالباً بول چال کی مشق بھی ہوتی ہوگی۔ اس کے ساتھ ایما سے شعر و ادب اور بعض علمی موضوعات پر گفتگو بھی رہتی تھی۔ دونوں مل کر جرمن شعرا، بالخصوص ہائنے اور گوئٹے کا مطالعہ کرتے۔ شیر منزل، دریائے نیکر کے کنارے واقع ہے۔ اس کے "روبرو خوب صورت درخت، بوقلموں جھاڑیاں، دریا کے پرسکون پانی کی جھلملاتی سطح اور اس پر رواں دواں بجرے"[۴] نظر آتے ہیں۔ دریا کے دوسرے کنارے کے عقب میں کسی قدر سطحِ مرتفع اور کچھ پہاڑیاں سی ہیں جن کی ڈھلانوں پر آبادی ہے۔ اس منظر کی ایک جھلک ڈاکٹر سعید اختر درانی کے الفاظ میں دیکھیے:

"دریا کے دوسری جانب سیکڑوں سال پرانے مکانات، گرجے اور ان کے دل کش سبز تانبے کے کلس، دریا کے پچھواڑے فرازِ کوہ پر محوِ خواب حویلیاں اور ان کے عقب میں ہائیڈل برگ کے قدیم قلعے (Schloss) کے دل کش کھنڈرات...... یہ سب مل جل کر ایک ناقابلِ فراموش نظارہ پیش کر رہے تھے..... نوجوان اقبال جس مکان (شیر منزل) میں رہتے تھے، وہاں سے یہی دل کشا منظر ان کے لیے بہجتِ روح کا باعث ہوا کرتا ہوگا۔"[۵]

ایک طرف یہ خوبصورت، پُر فضا اور رومان پرور ماحول، دوسری طرف ایما کی صحبت و رفاقت۔ ایما کی شکل و صورت کے بارے میں اس کی ایک قرابت دار ڈاکٹر مہیلا کرش ہوف نے ڈاکٹر سعید اختر درانی کو بتایا: "ایما بڑی خوبصورت اور خوش وضع (انیق یا elegant) عورت تھیں سیاہ بال، گہری نیلی آنکھیں اور بڑے ترشے ہوئے خد و خال (chiseled features)...... قد پانچ فٹ سات انچ۔"[۶]

وہ عمر میں اقبال سے دو برس چھوٹی تھیں، مگر اپنے منصب کے اعتبار سے، وہ اقبال کی استانی

تھیں اور اقبال ان کے شاگرد تھے۔ ایسے ماحول میں، دریائے نیکر کے کنارے ٹہلتے اور باتیں کرتے ہوئے اگر شاگرد، استاد کے سامنے طفلِ مکتب بن جائے تو تعجب کی بات نہیں۔ اپنے بقول ''ان پُرمسرت'' دنوں میں اقبال سوچتے ہوں گے:

این کہ می بینم بہ بیداری است یارب یا بخواب

شیخ محمد اقبال کو شیر رمنزل کے نواح میں نیکر کے کنارے یہ خواب دیکھتے ہوئے ایک ماہ گزر گیا۔

۲

اگست کی ۲۰ تاریخ تھی، جب لندن سے عطیہ بیگم بھی چھے ہندستانی طلبہ کی ایک منڈلی لے کر ہائیڈل برگ میں وارد ہوئیں۔ ان میں عطیہ کے بھائی ڈاکٹر فیضی بھی شامل تھے۔ عطیہ نے لکھا ہے کہ وہ پروفیسر آرنلڈ کی تجویز اور اصرار پر ہائیڈل برگ گئی تھیں اور یہ کہ اقبال نے بھی انھیں وہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ (واللہ اعلم بالصواب)

یہ لوگ تقریباً دو ہفتوں تک وہاں مقیم رہے اور یہ دو ہفتے نئے نئے مقامات کی سیر و سیاحت، پکنک اور تفریحی سرگرمیوں میں گزرے۔ عطیہ فیضی کے مطابق شیر رمنزل کے ہر طالب علم کے لیے لازمی تھا کہ کشتی رانی، کلاسیکی موسیقی، گانا، باغ بانی، سائیکل چلانا، درختوں پر چڑھنا وغیرہ سیکھے...... اقبال بھی ان تمام سرگرمیوں میں شرکت کرتے تھے اور وہ ان سب میں بڑی دلچسپی سے حصہ لیتے تھے۔[۷] ان بے تکلفانہ مجلسوں میں اقبال کی شخصیت کے جوہر کچھ اور کھلے، اُن کی ذہانت اور علمی قابلیت کے ساتھ، ان کی حاضر جوابی اور ظرافت نے بھی سبھی کو متاثر کیا۔ خود انھیں بھی ان مذاکروں اور مباحثوں سے فائدہ پہنچا۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی لکھتے ہیں: ''ہائیڈل برگ کے مختصر سہ ماہی قیام کے زمانے میں یہاں کے مخصوص طرزِ تعلیم اور بے تکلف مجلسوں اور مذاکروں میں آزادانہ بحث و تمحیص سے اقبال نے مغربی ادب و فلسفہ اور مغرب کی تاریخ و تہذیب و سیاست کے بارے میں جو کچھ سیکھا، وہ شاید برسوں کے مطالعے کے بعد بھی ممکن نہ ہوتا۔''[۸]

ستمبر کے پہلے ہفتے میں، عطیہ اور ان کا قافلہ واپس لندن چلا گیا۔ پھر وہی شیر رمنزل، اقبال اور ایما، جرمن زبان دانی، شعروادب، ہائنے اور گوئٹے، کنارِ دریا کی سیر...... اس ماحول میں بقول محمد اکرام چغتائی: ''ان دونوں کے قلب اور ذہن کے فاصلے کم ہوتے گئے اور بات زبان سے دل تک جا پہنچی۔ اقبال اسے نہایت سچی اور نیک دل خاتون سمجھتے تھے اور اس سے گفتگو کرنے اور اس

سے قریب رہنے میں راحت محسوس کرتے تھے۔"[9]

زبان سے دل تک کا فاصلہ پاٹنے میں کچھ کردار ایما کے حسنِ اخلاق کا بھی تھا۔ "سچی اور اچھی" ایما کے رویے نے اقبال کو اس قدر متاثر کیا کہ وہ محسوس کرنے لگے: ایما ہی میری "زندگی کی حقیقی قوت ہے" اور جرمنی میرا "دوسرا روحانی وطن"۔ بعد میں جب وہ یہ کہتے ہیں کہ میں نے جرمنی میں رہ کر "بہت کچھ سیکھا اور وہاں بہت کچھ سوچا" تو اس کی بڑی وجہ ایما کی ذات اور شخصیت تھی۔ گوئٹے کے وطن نے اقبال کی "روح میں ایک دائمی جگہ" بنالی تھی۔[10]

ایما کے نام اقبال کے ۲۷ مکاتیب کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اقبال کے نزدیک ایما ہی گوئٹے بھی ہیں، ہائنے اور شوپن ہار بھی۔ وہی ہائیڈل برگ بھی ہیں، نیکر بھی اور جرمنی بھی۔ یہ سب کے سب فرائیلائن ویگے ناسٹ کی شخصیت میں مجسّم ہوگئے تھے۔[11]

ماہ و سال کی گرد بھی "ان بہجت افزا" دنوں اور "سہانے وقتوں" کی یادوں کو دھندلا نہیں سکی۔ کئی سال بیت گئے۔ ۱۹۳۱ء میں اقبال لندن گئے اور وہاں سے ایما کو لکھا: "مَیں ہائیڈل برگ کے وہ ایام کبھی فراموش نہ کرسکوں گا، جب آپ نے مجھے گوئٹے کا فاؤسٹ پڑھایا اور دیگر کئی طرح سے میری مدد کی تھی۔ وہ کیا ہی بہجت افزا دِن تھے...... مَیں اپنی سی پوری کوشش کروں گا کہ مَیں ہائیڈل برگ آؤں اور آپ سے اسی پرانے مقام پر ملاقات کروں۔ مجھے اب تک دریائے نیکر یاد ہے، جس کے کنارے پر ہم دونوں ایک ساتھ گھوما کرتے تھے۔"[12]

قرینِ قیاس بلکہ یقینی امر ہے کہ کبھی کبھی اقبال نیکر کے کنارے اکیلے بھی گھومتے ہوں گے۔ بانگِ درا کی نظم: "ایک شام، دریائے نیکر کے کنارے" یقیناً ایسے ہی لمحات کی تخلیق ہے:

خاموش ہے چاندنی قمر کی ــــ شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوافروش خاموش ــــ کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بے ہوش ہوگئی ہے ــــ آغوش میں شب کے سوگئی ہے
کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے ــــ نیکر کا خرام بھی سکوں ہے
تاروں کا خموش کارواں ہے ــــ یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خاموش ہیں کوہ ودشت و دریا ــــ قدرت ہے مراقبے میں گویا

اے دل! تو بھی خموش ہوجا
آغوش میں غم کو لے کے سوجا

نظم کا آخری شعر:

اے دل! تو بھی خموش ہوجا ❊ آغوش میں غم کو لے کے سوجا

معنی خیز ہے۔اس نظم کو اگر مابعد نظم ''تنہائی'' سے ملا کر پڑھیں تو اقبال کے غم زدہ دل کی کیفیت اوران کے اُمڈتے ہوئے جذبات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں:

تنہائیِ شب میں ہے حزیں کیا؟ ❊ انجم نہیں تیرے ہم نشیں کیا؟
یہ رفعتِ آسمانِ خاموش ❊ خوابیدہ زمیں، جہانِ خاموش
یہ چاند، یہ دشت و در، یہ کہسار ❊ فطرت ہے تمام نسترن زار
موتی خوش رنگ پیارے پیارے ❊ یعنی آنسوؤں کے تارے

کس شے کی تجھے ہوس ہے اے دل
قدرت تری ہم نفس ہے اے دل

اس دور کی بعض دیگر نظمیں خصوصاً ''حسن و عشق''، اور ''وصال'' بھی اس حوالے سے اہم اور بامعنی ہیں، مثلاً، ''حسن و عشق'' (بانگِ درا: ص ۱۱۶) کے یہ اشعار:

ہے مرے باغِ سخن کے لیے تو بادِ بہار
میرے بے تاب تخیل کو دیا تو نے قرار
جب سے آباد ترا عشق ہوا سینے میں
نئے جوہر ہوئے پیدا مرے آئینے میں
حسن سے عشق کی فطرت کو ہے تحریکِ کمال
تجھ سے سرسبز ہوئے میری اُمیدوں کے نہال
قافلہ ہوگیا آسودۂ منزل میرا

اسی طرح پوری نظم ''وصال'' (ص: ۱۲۹) خصوصاً اس کا مطلع:

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے
خوبیِ قسمت سے آخر مل گیا وہ گل مجھے

اور یہ اشعار:

قید میں آیا تو حاصل مجھ کو آزادی ہوئی
دل کے لٹ جانے سے میرے گھر کی آبادی ہوئی

ضو سے اس خورشید کی اختر مرا تابندہ ہے
چاندنی جس کے غبارِ راہ سے شرمندہ ہے

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے عالمانہ استدلال و بحث کے بعد، بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس نظم میں ''وہ گل'' کا مشار' الیہ، ایما کے سوا اور کوئی نہیں۔[۱۳]

۳

بانگ ِدرا (ص:۱۰۳) کے ایک مصرعے:

مہینے وصل کے، گھڑیوں کی صورت اُڑتے جاتے ہیں

کے مصداق، وقت پر لگا کر اُڑا۔ اگست، ستمبر یہاں تک کہ اکتوبر آ پہنچا۔

ابھی موسمِ خزاں شروع نہیں ہوا تھا۔ اقبال ہائیڈل برگ سے رخصت ہونے والے تھے۔ میونخ میں زبانی امتحان کا مرحلہ درپیش تھا۔ اکتوبر کے پہلے ہفتے کے آخر یا دوسرے ہفتے کے شروع وہ میونخ پہنچ گئے۔ ادھر ایما بھی رخصت لے کر، اپنے وطن ہائیل برون چلی گئیں اور غالباً ۱۹۱۴ء تک واپس نہیں آسکیں۔

زبانی امتحان کی تیاری، میونخ میں اقبال کی سب سے بڑی مصروفیت تھی۔ اس تیاری میں جرمن زبان دانی میں مزید اور مناسب حد تک مہارت بہم پہنچانا بھی شامل تھی۔ ممکن ہے، کچھ کسر باقی ہو اور یونی ورسٹی نے کہا ہو کہ اس کمی کو پورا کیجیے۔ اقبال نے ٹیوٹر کے لیے اخبار میں اشتہار دیا۔[۱۴] ایک مقامی ٹیوٹر کی مدد سے جرمن زبان دانی کو بہتر بنانے کی کوشش میں لگے رہے۔ اقبال کی یہ ٹیوٹر بھی خاتون تھیں۔[۱۵]

دریں اثنا پروفیسر ہومل نے اقبال کے مقالے پر اپنی تحریری رائے یونی ورسٹی کو بھیج دی۔ اُن کی رائے بڑی مثبت تھی انھوں نے لکھا تھا: اس تھیسس کے بالاستیعاب مطالعے اور پروفیسر اقبال کے ساتھ ذاتی گفت و شنید کے بعد، پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ صاحب موصوف عربی اور فارسی زبانوں کے ایک نہایت عمدہ دانش ور ہیں۔[۱۶]

پروفیسر ہومل نے تائیداً، پروفیسر آرنلڈ کی رائے کا حوالہ بھی دیا۔ آرنلڈ نے اپنی تحریری رائے میں اس مقالے کو ''تاریخ فکرِ اسلامی میں ایک بیش بہا اضافے کے مترادف'' قرار دیا تھا۔[۱۷]

۴ر نومبر کی سہ پہر ۵ بجے یونی ورسٹی کے مقرر کردہ پانچ رکنی بورڈ نے جس کے سربراہ اقبال

کے نگرانِ مقالہ پروفیسر فریڈرش ہومل ہی تھے، اقبال کا زبانی امتحان لیا۔[۱۸] اقبال کے جوابات اور مجموعی گفتگو اس قدر اطمینان بخش اور متاثر کن تھی کہ وہ نہ صرف کامیاب قرار دیے گئے، بلکہ ان کی قابلیت اور علمی حیثیت کا کھلے بندوں اعتراف کیا گیا۔

یونی ورسٹی نے انھیں جو سند جاری کی اس پر لکھا ہوا ہے کہ یہ سند Famous and learned man and exalted person (معروف عالم فاضل اور قابلِ عزت و افتخار شخص) کو with great praise (بڑی تعریف کے ساتھ) جاری کی جا رہی ہے۔[۱۹]

۴

معاشی اعتبار سے نامساعد حالات کے باوجود اقبال نے یورپ کی دُور دیس مسافرت اختیار کی تھی:

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شرابِ علم کی لذّت کشاں کشاں مجھ کو

علمی فتوحات کے اوّلین مرحلے میں انھوں نے کیمبرج سے بی اے کی سند حاصل کی پھر شرابِ علم کی لذّت کشید کرنے کے لیے، وہ جرمنی چلے آئے۔ تحصیلاتِ علمی کا دوسرا مرحلہ اب میونخ میں شاندار طریقے سے اور اعزاز و امتیاز کے ساتھ تکمیل پذیر ہو رہا تھا۔ یہ کامیابی، کیمبرج سے کہیں زیادہ اہم تھی، کیونکہ اوّل: پی ایچ ڈی ایک اونچے درجے کی علمی سند تھی؛ دوم: اقبال نے یہ ڈگری یورپ کے اُس ملک کی ایک جامعہ سے حاصل کی تھی، جس کے باشندوں، تہذیب ان کے تمدن اور علمی روایت کے بارے میں اگرچہ وہ پہلے بھی بہت اچھی رائے رکھتے تھے، مگر تین ماہ کے اس مختصر قیام نے ان کے دل و دماغ اور جذبات کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا تھا۔ جرمنی کے انسانی اور فطری حسن و جمال نے اُن کے ذوقِ نظر کو ایک طرح سے سرشار کر دیا تھا، اس سے انھیں ایک ترفع بھی حاصل ہوا مگر اس کے ساتھ ہی اس نے اقبال کی شاعرانہ شخصیت کو ایک اندرونی اضطراب سے دوچار کر دیا تھا۔

لندن واپسی سے قبل، اقبال ہائیل برون جا کر ایما سے ملنا چاہتے تھے، مگر پروفیسر آرنلڈ کی ہدایت تھی کہ انھیں ۵ نومبر کو لندن میں ہونا چاہیے اور اسی روز سے لندن یونی ورسٹی میں لیکچروں کا آغاز کر دینا چاہیے۔ آرنلڈ عربی کی (غالباً بی اے کی) یہ کلاس خود لیا کرتے تھے، اب وہ مصر روانہ

ہو چکے تھے اور اپنے ہونہار شاگرد کو اپنا قائم مقام مقرر کر گئے تھے___[۲۰] چنانچہ اقبال ۴ر نومبر کی شب، زبانی امتحان سے فارغ ہو کر فوراً براہِ راست لندن روانہ ہو گئے۔

ریل گاڑی کے اس سفر میں جرمنی میں اپنے مختصر قیام کے بارے میں وہ کیا کچھ سوچتے جا رہے ہوں گے۔ ممکن ہے، اگلے روز کے لیکچر کے لیے ذہناً تیاری کر رہے ہوں، مگر اپنے دوسرے روحانی وطن سے وابستہ یادوں کو ذہن سے جھٹکنا آسان نہ تھا۔ ہائیڈل برگ، شیرر منزل، ایما ویگے ناسٹ، گوئٹے اور ہائنے، نیکر کا خرامِ خاموش...... ع

اے دل! تو بھی خموش ہو جا   آغوش میں غم کو لے کے سو جا

میونخ سے اقبال کے ۱۶ر اکتوبر ۱۹۰۷ء کے خط میں ایک جملہ ملتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ہر حسین چیز عارضی یا کوتاہ عمر ہے۔

حوالے اور حواشی

۱۔ نوادر اقبال: یورپ میں، ص ۱۱۳-۱۱۴

۲۔ محمد اکرام چغتائی۔ ''اقبال اور ویگے ناسٹ'' در: علامہ اقبال: حیات، فکر وفن، ص: ۱۳۰-۱۳۳۔ نیز: اقبال: یورپ میں، ص ۲۲۰

۳۔ نوادر اقبال: یورپ میں، ص ۱۷

۴۔ ایضاً، ص ۳۰

۵۔ ایضاً، ص ۳۰، ۳۱

۶۔ ایضاً، ص ۱۷

۷۔ اقبال از عطیہ بیگم، ص ۲۲

۸۔ عروج اقبال، ص ۳۰۹

۹۔ محمد اکرام چغتائی، ایضاً، ص ۱۳۲

۱۰۔ اس پیراگراف میں جن الفاظ و تراکیب پر واوین لگے ہیں، وہ مکاتیب اقبال بنام ایما ویگے ناسٹ کے اردو ترجمے سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اقبال اور ایما کی باہمی قربت کا صحیح اندازہ انھی خطوط سے ہوتا ہے۔ ان جرمن اور انگریزی خطوں کی نقلِ حرفی اردو ترجمے کے ساتھ سعید اختر درّانی کی تصنیف اقبال: یورپ میں (طبع دوم) میں شامل ہے۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۷۸۔ یہ بیان جرمن سفارت کار اور نو مسلم محمد امان ہربرٹ ہوبوہم کا ہے۔ ایما کے نام مکاتیب اقبال کا انکشاف سب سے پہلے ۱۹۸۲ء میں انھوں نے ہی کیا تھا۔ اُنھیں مذکورہ خطوں

کے عکس جناب ممتاز حسن (۱۹۰۷ء۔۱۹۷۴ء) سے حاصل ہوئے تھے جو ایک نامور عالم اور اقبال اکادمی پاکستان کے نائب صدر رہے اور مرکزی حکومت پاکستان میں بعض اہم مناصب (مثلاً سکریٹری مالیات اور گورنر سٹیٹ بنک آف پاکستان) پر بھی فائز رہے۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۱۱-۲۱۲

۱۳۔ عروجِ اقبال، ص ۳۲۶

۱۴۔ اقبال: یورپ میں، ص ۱۹۲

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۹۴

۱۶۔ نوادر اقبال: یورپ میں، ص ۱۱۵

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۱۶

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۲۱-۱۲۲

۱۹۔ ایضاً، ص ۲۰۸

۲۰۔ اقبال: یورپ میں، ص ۱۹۵، ۴۹۸

❖......❖......❖

⑧

مسلماں کو مسلماں کر دیا......

شیخ محمد اقبال میونخ سے ۴؍نومبر کی شب روانہ ہو کر ۵؍نومبر کی صبح لندن پہنچ گئے، جہاں وہ اوائلِ جولائی تک مقیم رہے۔ نو ماہ کا یہ زمانہ، اقبال کے لیے لندن میں نسبتاً کم مصروفیات کا زمانہ تھا۔

ا

۵؍نومبر کو انھوں نے لندن یونی ورسٹی میں عربی زبان کے طلبہ کو پہلا لیکچر دیا۔ وہ اپنے استاد پروفیسر آرنلڈ کے قائم مقام کی حیثیت سے چھے ماہ کے لیے عربی کے استاد مقرر ہوئے تھے۔ یہ مصروفیت ہفتے میں فقط دو لیکچروں تک محدود تھی۔ اقبال کی اہم تر مصروفیت بیرسٹری کے امتحان کی تیاری تھی، ان کے لیے اب لندن میں یہی سب سے اہم کام رہ گیا تھا۔

امتحان تقریباً چھے ماہ بعد ہونے والا تھا۔ امتحان کی تیاری وہ بہت توجہ اور محنت سے کر رہے تھے، پھر بھی ان کے پاس کچھ وقت بچ جاتا تھا۔ گذشتہ برسوں میں ان کا خاصا وقت پروفیسر آرنلڈ سے ملاقاتوں، ڈاکٹر سید علی بلگرامی کی مجالس میں شرکت اور شیخ عبدالقادر اور عطیہ بیگم کے ساتھ محفل آرائی میں صرف ہوتا تھا، مگر اب پروفیسر آرنلڈ، شیخ عبدالقادر اور عطیہ بیگم کی مثلث لندن سے غائب تھی۔ آرنلڈ مصر جا چکے تھے، شیخ صاحب اور عطیہ ہندستان سدھار گئے تھے۔ بسا غنیمت تھا کہ لندن میں ان کے لیے بے تکلف دوستوں میں سے میاں عبدالعزیز اور حافظ محمود شیرانی[۱] موجود تھے، جن کے ساتھ محفل آرائی ہوتی ہوگی۔ ممکن ہے، وہ کبھی کبھار ڈاکٹر سید علی بلگرامی اور اپنے اساتذہ سے ملنے کیمبرج چلے جاتے ہوں، مگر ایسا ہفتوں بعد ہی ہو سکتا تھا، اس لیے وہ لندن ہی میں مسلم طلبہ کی اجتماعی سرگرمیوں اور بعض تقریبات میں شامل ہونے لگے، مثلاً: انھوں نے پین اسلامک سوسائٹی کی تقریبات میں کئی بار شرکت کی۔ اس انجمن کے سیکرٹری اقبال کے قریبی اور بے تکلف دوست حافظ محمود شیرانی تھے۔ اس کے مقاصد میں لندن میں مقیم مسلم طلبہ کو اجنبی دیس میں سہولتیں مہیا کرنا اور ان کے مسائل حل کرنا بھی تھا۔[۲] بایں ہمہ اقبال اپنے اصل مقصد (بیرسٹری کی تکمیل) سے غافل

نہیں ہوئے۔ آخری امتحان مئی میں ہونے والا تھا، وہ یکسوئی اور توجہ کے ساتھ مطالعے اور تیاری میں مشغول رہے۔ ڈیڑھ دو ماہ میں انھوں نے اندازہ کرلیا کہ وہ بآسانی یہ امتحان پاس کرلیں گے۔

ذہناً وہ بیرسٹر بننے کا تہیہ کر چکے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ان کے بعض احباب (مثلاً: شیخ عبدالقادر، مرزا جلال الدین، فضل حسین اور میاں محمد شفیع وغیرہ) لاہور میں بیرسٹری کا باعزت اور مالی اعتبار سے اطمینان بخش پیشہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ دوسرے: اقبال؛ ملازمت، خصوصاً انگریز کی ملازمت کو طبعاً ناپسند کرتے تھے اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ بیرسٹری ملازمت کا متبادل پیشہ ہوسکتا تھا، نہایت معقول، معزز اور باوقار۔

یورپ آنے سے قبل وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے اور تین سال کی بلا تنخواہ رخصت لے کر آئے تھے۔ ۳۰؍ ستمبر ۱۹۰۸ء کو رخصت کی مدت ختم ہونے والی تھی۔ اقبال نے سوچا: محکمۂ تعلیم کو بروقت مطلع کرنا مناسب ہوگا کہ مَیں ملازمت جاری نہیں رکھنا چاہتا، چنانچہ ۲۲؍ جنوری ۱۹۰۸ء کو انھوں نے ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن کے نام ایک خط میں گورنمنٹ کالج کی معلّمی سے استعفا لکھ بھیجا۔ [۳] اس طرح وہ اپنے مستقبل کے مشغلۂ حیات کے بارے میں یکسو ہو گئے۔

نسبتاً فراغت کے اس زمانے میں انھوں نے لیکچروں کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ خواجہ حسن نظامی کو ۱۰؍ فروری کے خط میں لکھتے ہیں:

''انگلستان میں مَیں نے اسلامی مذہب و تمدن پر لیکچروں کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ ایک لیکچر ہو چکا ہے، دوسرا ''اسلامی تصوف'' پر فروری کے تیسرے ہفتے میں ہوگا، باقی لیکچروں کے معانی [کذا] یہ ہوں گے: ''مسلمانوں کا اثر تہذیبِ یورپ پر''، ''اسلامی جمہوریت''، ''اسلام اور عقلِ انسانی'' وغیرہ۔ [۴]

عبداللہ انور بیگ کی روایت ہے کہ پہلے لیکچر کا موضوع تھا: Certain Aspects of Islam (مذہب اسلام کے بعض پہلو) اور یہ لیکچر کیکسٹن ہال میں پان اسلامک سوسائٹی کے زیر اہتمام منعقد ہوا تھا۔ اقبال کے فی البدیہہ لیکچر نے سامعین کو مسحور کردیا۔ آخر میں سوال جواب بھی ہوئے۔ اس کی رپورٹ لندن کے متعدد اخباروں میں چھپی تھی۔ [۵]

دسمبر ۱۹۰۶ء میں ڈھاکا میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا تو اس وقت اقبال لندن میں تھے۔ وہاں مقیم ہندستانی مسلمانوں کو برطانیہ میں بھی اس کی شاخ قائم کرنے کا خیال آیا۔ اس شاخ کا نام برٹش کمیٹی تجویز ہوا اور اس کا افتتاح لندن میں مئی ۱۹۰۸ء میں ہوا۔ سید امیر علی (۱۸۴۹ء-۱۹۱۹ء)

کی صدارت میں لندن میں مقیم مسلمان کیکسٹن ہال میں جمع ہوئے۔ سید امیر علی صدر اور اقبال مجلس عاملہ کے رکن چنے گئے۔ اقبال، کمیٹی کے قواعد وضوابط مرتب کرنے کے لیے مقررہ سب کمیٹی کے رکن بھی نامزد ہوئے۔[۶] غالباً یہی زمانہ تھا، جب انھوں نے بیرسٹری کا آخری امتحان دیا۔

جون کے اوائل میں عطیہ بیگم اپنی بہن اور بعض دیگر عزیزوں کی معیت میں لندن پہنچیں۔ اقبال کو ان کی آمد کا علم ہوا تو ۹رجون کو وہ ازراہِ وضع داری ان سے ملاقات کرنے اُن کی قیام گاہ پر گئے۔[۷]

اس نو ماہ کے قیام میں ایما ویگے ناسٹ سے ان کا رابطہ خط کتابت کے ذریعے قائم رہا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ہندستان واپس آنے سے پہلے ایک بار ایما سے ملاقات کے لیے ہائیل برون یا ہائیڈل برگ جائیں گے۔[۸] لیکن آخری دِنوں میں سفر کی تیاری کی مصروفیات آڑے آئیں اور وہ دوبارہ جرمنی نہیں جا سکے۔

۲

یکم جولائی ۱۹۰۸ء کو انھیں لنکنز اِن سے بار ایٹ لا کی ڈگری مِل گئی[۹] اور وہ جولائی کے پہلے ہفتے میں واپس ہندستان روانہ ہو گئے۔[۱۰] واپسی کا سفر بھی حسبِ سابق پیرس کے راستے ہوا۔

بحیرۂ روم سے گزرتے ہوئے جب ان کا جہاز سسلی کے قریب پہنچا تو ''غم نصیب اقبال'' کا دِل بھر آیا اور مسلم عظمتِ رفتہ کا تصور ان کے ذہن میں تازہ ہو گیا۔ اندلس کی طرح سسلی پر بھی مسلمان طویل عرصے تک حکمران رہے اور یہاں بھی چپے چپے پر مسلم تہذیب وتمدن کے آثار موجود ہیں۔ بانگِ درا کی نظم ''صقلیہ'' انھی لمحات کی تخلیق ہے:

رو لے اَب دِل کھول کر اے دیدۂ خونابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار

۲۴رجولائی کی شب یا ۲۵رکی صبح ڈاکٹر شیخ محمد اقبال بمبئی کے ساحل پر اترے اور بذریعہ ریل دہلی سے ہوتے ہوئے ۲۷رجولائی کو لاہور پہنچے۔ ریلوے اسٹیشن سے انھیں باغ بیرون بھاٹی دروازہ لایا گیا، جہاں ان کے اعزاز میں شیخ گلاب دین نے ایک استقبالیے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ اس میں تقریریں ہوئیں اور خیر مقدمی نظمیں پڑھی گئیں۔[۱۱] پھر اسی شام وہ ریل کے ذریعے سیالکوٹ روانہ ہو گئے۔ وہاں بھی استقبال کرنے والوں سے پلیٹ فارم بھرا ہوا تھا، اقبال کو پھولوں سے لاد دیا گیا۔ گھر پہنچتے ہی والدہ نے انھیں لپٹا لیا اور منہ چوما ہو گا۔

۳

اقبال کا تین سالہ قیامِ یورپ اگرچہ زمانی اعتبار سے کوئی طویل مدت نہیں ہے، مگر ذہنی و فکری اور جذباتی اعتبار سے یہ تین سال ان کی اکسٹھ سالہ زندگی میں نہایت اہمیت رکھتے ہیں۔ جناب ممتاز حسن کے بقول: "۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء کا زمانہ اقبال کے روحانی ارتقا کی اہم ترین منزل ہے۔"[۱۲] اس تین سال کے عرصے میں وہ خاصے وسیع اور گوناگوں تجربات سے گزرے۔ انھوں نے اپنی علمی تحقیق کے سلسلے میں ڈیڑھ سال تک مختلف علوم کا مطالعہ کیا۔ کیمبرج، لندن، ہائیڈل برگ اور میونخ میں قیام کے دوران میں انھوں نے اپنی علمی اور تعلیمی استعداد میں اضافہ کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یورپی معاشروں کے تمدن، معیشت، سیاست اور تعلیم کا مطالعہ کرتے رہے۔ انھیں مختلف یورپی ممالک کی باہمی رقابتوں، ان کے استعماری عزائم اور ان کی سرمایہ دارانہ ذہنیتوں پر ایک گونہ تفکر و تجسس کے ساتھ غور کرنے اور اس طرح یورپ کے باطن میں جھانکنے کا موقع مِلا۔ اس کے نتیجے میں وہ اپنی سوچ اور ذہن و فکر کی بعض اہم تبدیلیوں سے دوچار ہوئے۔ بعض اصحاب نے ان تبدیلیوں کو اقبال کی "قلبِ ماہیت" قرار دیا ہے۔[۱۳]

یورپ میں اقبال کے تین سالہ قیام کے نتائج اور ان کی شخصیت اور فکر پر اس کے اثرات کو مختصراً یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

۱۔ علمی اور تعلیمی اکتسابات کے لحاظ سے یہ ان کی زندگی کا سب سے باثروت زمانہ تھا۔ انھوں نے تین سال میں کیمبرج سے بی اے، میونخ سے پی ایچ ڈی اور لنکنز اِن سے بیرسٹر ایٹ لا کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اس اعتبار سے وہ اپنے دَور کے ان تمام طلبہ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، جو اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے اور کئی کئی سال تک وہاں مقیم رہے، مگر گوہرِ مراد ہاتھ نہ آیا۔ محمد علی جوہر ہوں یا حافظ محمود شیرانی[۱۴]، ان لوگوں کی ذہانت و قابلیت میں کوئی شبہ نہیں، مگر جہاں تک علمی تحصیلات کا تعلق ہے، ان لوگوں کا معاملہ کچھ اس طرح کا رہا:

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

اکبر الٰہ آبادی کے فرزند ارجمند، سید عشرت حسین کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ وہ سات برس تک انگلستان میں مقیم رہنے کے بعد کیمبرج سے صرف بی اے کی ڈگری حاصل کر سکے۔[۱۵] خود اقبال کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال نے ایسی ہی علمی تحصیلات کے لیے سات برس صرف کیے۔ یہ بات

اقبال کی شخصیت کی امتیازی حیثیت، بلکہ ان کے غیر معمولی پن اور ان کی عبقریت کا پتا دیتی ہے۔

یہ علامہ اقبال کی غیر معمولی کامیابی ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ ان کی ذہنی پختگی اور بالغ نظری کا ثبوت بھی کہ اگر چہ وہ تفریحی سرگرمیوں اور دوستوں کے ساتھ سیر و سیاحت میں شریک رہے اور بعض اوقات بظاہر غیر متعلقہ یا غیر ضروری علمی بحثوں میں بھی حصہ لیتے رہے، مگر انھوں نے اپنے وقت کا استعمال بڑی کفایت شعاری اور ذہانت کے ساتھ کیا۔ ان کے معاصرین میں ہمیں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی اور یہ ان کی غیر معمولی شخصیت کا ثبوت ہے۔

۲۔ اقبال کو اپنی علمی تحقیق کے سلسلے میں اسلامی علوم، تہذیب، فلسفے اور سیاست و معیشت کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ بنیاد تو پہلے سے موجود تھی، یعنی اقبال دِین دارانہ ماحول کے پروردہ اور شیخ نور محمد اور میر حسن کے تربیت یافتہ تھے اور ان کی شخصیت میں مذہب، ایک بنیادی اور قوی عنصر کے طور پر ہمیشہ موجود رہا۔ یورپ کے مخالفانہ ماحول میں یہ عنصر قوی تر ہوتا گیا۔ انھوں نے یورپی تہذیب اور معاشرت کو کھلی آنکھوں سے دیکھا اور قریب سے اس کا مشاہدہ کیا تو اس کا کھوکھلا پن ان پر بے نقاب ہو گیا اور وہ سمجھ گئے کہ اس تمدن کی ظاہری چکا چوند، ایک فریب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی، [۱۶] جب کہ دوسری طرف اسلام کی حقانیت ان پر واضح اور پختہ تر ہوتی چلی گئی۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اقبال کی اس ذہنی تبدیلی کا نہایت عمدہ اسلوب میں ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''سب جانتے ہیں کہ اقبال نے یہی مغربی تعلیم حاصل کی تھی، جو ہمارے نوجوان انگریزی یونی ورسٹیوں میں حاصل کرتے ہیں۔ یہی تاریخ، یہی ادب، یہی اقتصادیات، یہی سیاسیات، یہی قانون اور یہی فلسفہ انھوں نے بھی پڑھا اور فنون میں بھی وہ مبتدی نہ تھے، بلکہ منتہی فارغ التحصیل تھے۔ خصوصاً فلسفے میں تو ان کو امامت کا مرتبہ حاصل تھا، جس کا اعتراف موجودہ دَور کے اکابر فلاسفر تک کر چکے ہیں۔

''جس شراب کے دو چار گھونٹ پی کر بہت سے لوگ بہکنے لگتے ہیں، یہ مرحوم اس کے سمندر پیے بیٹھا تھا۔ پھر مغرب اور اس کی تہذیب کو بھی اس نے محض ساحل پر سے نہیں دیکھا تھا، جس طرح ہمارے ۹۹ فیصد نوجوان دیکھتے ہیں، بلکہ وہ اس دریا میں غوطہ لگا کر تہ تک اتر چکا تھا اور ان سب مرحلوں سے گزرا تھا، جن میں پہنچ کر ہماری قوم کے ہزاروں نوجوان اپنے دِین اور ایمان، اپنے اصولِ تہذیب و تمدن اور اپنے قومی اخلاق کے مبادی تک سے برگشتہ ہو جاتے ہیں، حتیٰ کہ اپنی قومی زبان تک بولنے کے قابل نہیں رہتے۔

''لیکن اس کے باوجود اس شخص کا حال کیا تھا؟ مغربی تعلیم و تہذیب کے سمندر میں قدم رکھتے وقت وہ جتنا مسلمان تھا، اس کے منجدھار میں پہنچ کر اس سے زیادہ مسلمان پایا گیا۔ اس کی گہرائیوں میں جتنا اترتا گیا، اتنا ہی زیادہ مسلمان ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی تہہ میں جب پہنچا تو دنیا نے دیکھا کہ وہ قرآن میں گم ہو چکا تھا اور قرآن سے الگ اس کا کوئی فکری وجود باقی نہیں رہا۔ وہ جو کچھ سوچتا تھا، قرآن کے دماغ سے سوچتا تھا۔ جو کچھ دیکھتا تھا، قرآن کی نظر سے دیکھتا تھا۔ حقیقت اور قرآن اس کی نظر میں شےِ واحد تھے اور شےِ واحد میں وہ اس طرح فنا ہو گیا تھا کہ اس دَور کے علماے دِین میں بھی مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا، جو فنائیت فی القرآن میں اس امامِ فلسفہ اور اس ایم اے، پی ایچ ڈی، بارایٹ لا سے لگا کھاتا ہو۔''[۱۷]

اقبال کی ذہنی کایا پلٹ پر یہ بڑا جامع تبصرہ ہے۔

اقبال نے خود ایک جگہ اعتراف کیا ہے کہ ''یورپ کی آب و ہوا نے مجھے مسلمان کر دیا۔''[۱۸]

اسی زمانے کی نظم ''طلوعِ اسلام'' کا ایک مصرع ہے:[۱۹]

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے

۳۔ شاعرانہ اور فکری لحاظ سے اقبال کے اندر سب سے بڑی تبدیلی یہ آئی کہ وطنیت کے سیاسی نصب العین کا تاریک پہلو ان پر واضح ہو گیا۔ پتا چلا کہ لادِین سیاست کا نتیجہ قوموں کے درمیان باہمی نفرت و عداوت، زر پرستی اور خود غرضی کے سوا کچھ نہیں، چنانچہ وہ وطنیت اور قوم پرستی کے نظریے سے دست کش ہو کر اسلام کے ہمہ گیر آفاقی نظریے کے قائل ہو گئے۔ انھوں نے واضح طور پر کہہ دیا:[۲۰]

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا\
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

مگر واضح رہے کہ انھوں نے فقط وطنیت کی نفی پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ مثبت طور پر اسلامی نظریۂ حیات کی برتری اور پھر اس کے غلبے کے لیے کوشش و کاوش اور جدوجہد کا اعلان بھی کر دیا۔ اس سلسلے میں ۴، ۵ نظمیں (طلبۂ علی گڑھ کالج کے نام، پیامِ عشق، عبدالقادر کے نام، صقلیہ، بلادِ اسلامیہ[۲۱]) اور ایک غزل (بعنوان: مارچ ۱۹۰۷ء) قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں کچھ ایسے میلانات اور رجحانات نظر آتے ہیں، جو آگے چل کر اقبال کے مخصوص تصورِ عشق، فلسفۂ خودی اور بے خودی کی بنیاد بن گئے اور پھر اسی سے احیاے ملت کے جذبے کو تقویت حاصل ہوئی۔ مذکورہ نظموں کے

حوالے سے اقبال کے ہاں کچھ کر گزرنے، آگے بڑھنے اور ملک و ملت کو ایک نئی دنیا، بلکہ ایک نئے نظامِ حیات سے آشنا کرنے کا عزم نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دَور میں شاعر اقبال فقط شاعر نہیں رہتا، بلکہ پیغام بر بن جاتا ہے۔ نظم ''صقلیہ'' اور ''بلادِ اسلامیہ'' انگلستان سے واپس آتے ہوئے سفر کے دَوران میں لکھی گئیں۔ یہ اس ذہن کی آئینہ دار ہیں، جو قیامِ یورپ کے زمانے میں ایک خاص شکل اختیار کر چکا تھا۔ دونوں نظموں میں اور مارچ ۱۹۰۷ء کی غزل میں وہ کاروانِ ملت سے پوری طرح وابستہ اور جڑے ہوئے نظر آتے ہیں:[۲۲]

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے مَیں نے، وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا
سفینۂ برگِ گل بنالے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش، مگر یہ دریا سے پار ہو گا

اور اسی پر اکتفا نہیں، بلکہ اقبال سالارِ قافلہ بن کر اہل قافلہ کی رہبری کرنے پر بھی تیار نظر آتے ہیں:

مَیں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہو گی آہ میری، نفس مِرا شعلہ بار ہو گا

اس اعتبار سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قیامِ انگلستان ہی سے اقبال نے مسلمانوں کی نشاتِ ثانیہ کے امکانات پر غور کرنا شروع کر دیا تھا۔[۲۳]

۴

گذشتہ اوراق میں یہ ذکر آ چکا ہے کہ اقبال کی ازدواجی زندگی ناکام رہی اور وہ جذباتی ناآسودگی کا شکار رہے۔ یورپ میں انھیں بالکل ایک نئے، مختلف اور آزادانہ ماحول سے سابقہ پیش آیا۔ ایک مخلوط معاشرے میں جہاں بے حجابی، عریانی کی حدود کو چھو رہی تھی اور مرد و زَن کے بے قید اختلاط نے اس مدنیت کو آلودہ اور داغ دار بنا دیا تھا، اقبال کو قلب و نظر کی بڑی آزمائش کا سامنا تھا۔ خاص طور پر انگلستان میں عطیہ بیگم کی شخصیت، ان کی جذباتی زندگی کے لیے فی الواقع ایک آزمائش ثابت ہوئی۔ (اس کی تفصیل عطیہ بیگم کی کتاب اقبال میں ملتی ہے۔) جرمنی میں اقبال کو ایماویگے ناسٹ سے سابقہ پیش آیا۔

اقبال کے بعض سوانح نگاروں نے یورپ میں اقبال کی جذباتی زندگی کے حوالے سے

حاشیہ آرائی کی ہے اور عطیہ فیضی اور ایما ویگے ناسٹ کے حوالے سے ان کی "حیاتِ معاشقہ" مرتب کرنے کی سعی فرمائی ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر محمد عثمان، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی اور جگن ناتھ آزاد نے اپنے زاویۂ نظر سے تجزیے کیے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ عطیہ بیگم کے بیانات اور ان کی ڈائری کا بغور مطالعہ نہیں کیا گیا اور عطیہ کے تضادات، غلط بیانیوں اور اِدّعا پسندی پر کم ہی لوگوں کی نظر گئی ہے۔[۲۴] ان کی شخصیت کو بالعموم سطحی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ فی الحقیقت اقبال اور عطیہ کا کوئی جوڑ ہی نہیں بنتا۔ ڈاکٹر سعید اختر درانی نے بھی عطیہ بیگم کے بعض تضادات کا ذکر کیا ہے۔[۲۵] مگر سب سے عمدہ تجزیہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کا ہے۔ ان کے مطابق عطیہ کی ڈائری ان کی پیچیدہ نفسیات، جذبۂ خودنمائی، سطحی خیالات اور تفریحی رجحانات کی غماز ہے۔[۲۶] ہمارا خیال ہے کہ عطیہ نے خود کو اقبال کا سرپرست فرض کر لیا تھا اور وہ چاہتی تھیں کہ اقبال اس کے نیازمند بن جائیں۔ اقبال اس کے لیے تیار نہ تھے، اس لیے وہ اقبال کو بے حد "خود رائے اور خود پسند" کہتی ہیں۔[۲۷] تاہم اقبال جیسے ذہین اور پختہ ذہن شخص کے لیے عطیہ کی خام خیالی کو سمجھنا مشکل نہ تھا۔

اپنی ناکام ازدواجی زندگی کے پیشِ نظر، قیامِ یورپ کے دوران میں، اقبال نے کبھی دوسری شادی کے بارے میں سوچا ہوگا؟...... شاید...... ممکن ہے، کبھی سوچا ہو۔

شاید...... مگر بقول خرم علی شفیق: "اس بات کا امکان بہت کم ہے کہ انھوں نے عطیہ فیضی کو اپنی شریکِ زندگی بنانے کے بارے میں سوچا ہو۔"[۲۸] اگر کبھی انھیں دوسری شادی کا خیال آیا ہو، تب بھی وہ بخوبی سمجھتے تھے کہ "محلوں کی ناز پروردہ، تفریحات و تعیشات کی دلدادہ عطیہ کی طبیعت میں خلوص و ایثار کی وہ خوبو [نہیں] تھی کہ زندگی کی دشوار و پُرخار راہوں میں، دو قدم بھی درویش مزاج اقبال کا ساتھ دے سکتیں۔"[۲۹] ہمیں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی اس رائے سے بھی اتفاق ہے کہ "شادی کے بارے میں اقبال کا تصور چراغِ خانہ کا تھا، شمعِ محفل کا نہیں تھا، اس لیے وہ عطیہ سے ازدواجی تعلق کا تصور ہی نہیں کر سکتے تھے۔"[۳۰]

جذباتی زندگی کے سلسلے میں ایما ویگے ناسٹ دوسرا اہم حوالہ ہے۔ اس کا کچھ ذکر تو اوپر ہو چکا ہے، جس سے اندازہ ہوگا کہ اقبال کی نظر میں عطیہ کے مقابلے میں ایما کی شخصیت کہیں زیادہ برتر اور فائق تھی۔ بے شک اقبال کو اپنے جمالیاتی ذوق اور جذباتی آسودگی کی تسکین ایما سے قربت میں نظر آتی تھی۔ ان کے خطوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایما کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات

کی یاد ہمیشہ ان کے ذہن میں تازہ رہی۔ اگر ممکن ہوتا تو وہ وقت کے پہیے کو روک لیتے۔

ممکن ہے، کبھی انھوں نے سوچا ہو کہ اگر ایما سے شادی ہو جائے تو وہ جرمنی ہی میں مقیم ہو جائیں۔[۳۱] یہ روایت موجود ہے کہ یورپ سے اقبال کی واپسی کے فوراً بعد، خود ایما نے بھی ہندستان جانے کا ارادہ کیا، مگر ان کے بڑے بھائی کارل نے انھیں تنِ تنہا ایک دُور دراز ملک کا سفر کرنے سے منع کر دیا۔[۳۲] (وہی شیخ عطا محمد کی سوچ، وہی اندیشہ ہائے دُور دراز!)

ایما کے نام ان کے ۲۷ رخطوط[۳۳] اقبال کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے بہت اہم ہیں۔ اس سے ایما کے سلسلے میں ان کے جذبات و خیالات کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

کچھ یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے ایما کے سلسلے میں وہ دل و دماغ کی کش مکش کا شکار رہے۔ عطیہ نے لکھا ہے کہ اپریل ۱۹۰۷ء میں اقبال نے ان سے دوسری ملاقات میں کہا: "میں دو شخصیتوں کا مجموعہ ہوں۔ ظاہری شخصیت کارآمد اور عملی ہے اور باطنی شخصیت خواب دیکھنے والے فلسفی اور صوفی کی سی ہے۔"[۳۴]

یوں تو اقبال کی پوری زندگی کا تجزیہ ان کے اسی قول کی روشنی میں کرنا چاہیے، لیکن قیامِ یورپ اور بطورِ خاص، ان کے جمالیاتی ذوق اور جذباتی زندگی کو دیکھیں تو یہاں ان کی دو شخصیتوں کی کش مکش نمایاں نظر آتی ہے۔ دل کی پکار تو یہ تھی، جیسا کہ اقبال لکھتے ہیں کہ میں اپنی ساری جرمن بھول چکا ہوں، فقط ایک لفظ یاد رہ گیا ہے: ایما[۳۵] لیکن عملی زندگی کے تقاضے کچھ اَور تھے۔ کیا وہ اپنے ماضی سے، اپنے وطن ہندستان، اپنے لاہور اور سیالکوٹ، اپنے والدین اور بھائی (جن کے وہ مقروض تھے) اور سب سے بڑھ کر اپنی قوم اور اپنی ملت کو چھوڑ سکتے تھے: تج سکتے تھے؟ صرف ایک لفظ "ایما" کے لیے؟ ـــ نہیں ـــ وہ ایک حقیقت پسند، حوصلہ منداور عملی انسان تھے۔

خواب تو خواب ہی ہوتا ہے۔ اگر چہ نوجوان اقبال کی عمر فقط تیس برس تھی اور اگر چہ اس عمر کے عام نوجوانوں سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ جذباتیت سے قطع نظر کر کے کسی پختہ فکری کا مظاہرہ کریں، مگر اقبال کا معاملہ قدرے مختلف تھا۔ وہ "عام" قسم کے نوجوان نہ تھے، قدرت نے انھیں دیدۂ باطن (بصیرت) سے بہرۂ وافر بخشا تھا۔ وہ خوابوں کی دنیا اور عملی زندگی کے تقاضوں کے بُعد کو سمجھتے تھے۔ پھر ابتدائی دینی و اخلاقی تربیت کے سبب ان کے ہاں قلب و نظر کی پاکیزگی کا تصور بطور ایک قوی اور مؤثر عنصر کے موجود تھا، اس لیے وہ کامیابی کے ساتھ اس امتحان سے گزر کر بخیر و خوبی ساحلِ مراد تک پہنچ گئے۔ یہ بھی ان کی پاکیزہ سیرت اور مہذب شخصیت کا ثبوت ہے۔

۵

قیامِ یورپ کی شاعری اپنے حجم کے اعتبار سے کچھ زیادہ نہیں ہے۔ ۲۴ نظمیں اور گنتی کی چند غزلیں ہیں۔ اگر متروک کلام کو بھی شامل کر لیں، تب بھی مقداری اعتبار سے اس حصۂ شاعری میں کچھ زیادہ اضافہ نہ ہوگا، تاہم فکری و معانی اور شعری خصوصیات کی وجہ سے یہ مختصر سا ذخیرۂ شعر بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا ایک حصّہ تو ان نظموں پر مشتمل ہے، جو اقبال کے احساسِ جمال اور رومانوی افتادِ طبع کی پیداوار ہیں۔ ان میں حسن و عشق، جذباتِ محبت، غم و اندوہ، احساسِ تنہائی اور مظاہرِ فطرت کا ذکر ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، بعض نظموں میں تو ایما و کیٹس سے تعلق خاطر کی جھلک نظر آتی ہے۔ کہیں کہیں وہ زندگی کی بوالعجبیوں پر اس طرح تبصرہ کرتے ہیں:[۳۶]

کوئی نہیں غم گسارِ انساں ‌ ‌ ‌ ‌ کیا تلخ ہیں روزگارِ انساں

ان نظموں میں احساسِ جمال کی شدت، جمالیاتی جذبے کا خلوص اور تخیل کی فراوانی اور غنائیت نمایاں ہے۔[۳۷]

اس دَور کی شاعری میں جذبۂ ملّی کے نقوش بھی نمایاں ہیں۔ منظومات کا ذکر آ چکا ہے، جہاں تک اس دَور کی غزلوں کا تعلق ہے، خصوصاً وہ غزل، جس پر ''مارچ ۱۹۰۷ء'' کا عنوان دیا گیا ہے، تاریخی اہمیّت کی حامل ہے اور اس میں کچھ باتیں بہت کھل کر کہی گئی ہیں؛ جیسے: زوالِ مغرب، حجازیت، اسلامی نشاتِ ثانیہ اور ایک عالم گیر جذبۂ اخوت وغیرہ۔ اس میں ایک نئے دَور کی نقیب کی حیثیت سے سرگرمِ عمل ہونے کے لیے شاعر کا عزمِ صمیم بہت واضح ہے۔ اس کا اظہار مذکورہ بالا غزل کے بعض اشعار سے ہوتا ہے، جو گذشتہ سطور میں نقل کیے جا چکے ہیں۔

عین یہی زمانہ تھا، جب فروری اور مارچ کے مہینوں میں اقبال ''اسلامی تہذیب و تمدن'' پر لندن میں لیکچر بھی دے رہے تھے۔

گویا اس دَور کی شاعری کا ایک اہم حصّہ ملّی اور اجتماعی جذبات و احساسات کا مظہر ہے۔ اسے ہم مستقبل کے مفکرِ اسلام کے سیاسی فکر کا آئینہ دار اور ان کے مستقبل کے شعری نصب العین کا اعلامیہ بھی کہہ سکتے ہیں۔[۳۸]

۶

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے اقبال کے سہ سالہ قیامِ یورپ اور اس کے نتائج پر ایک جامع

تبصرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''اس دور کے گوناگوں تجربات، اقبال کی شخصیت کی توسیع و تکمیل کا باعث ہوئے اور انگلستان و جرمنی میں سیر و تفریح کے اتنے مواقع اور ایسی صحبتیں میسر آئیں، جن کی یاد عرصۂ دراز تک ان کے لیے سرمایۂ نشاطِ روح بنی رہی۔ جس طرح وسیع مطالعے اور مشاہدات کی بدولت اقبال کے ذہن و فکر کے زاویے بدل گئے اور وہ مغربی تہذیب کے ظلمات سے گزر کر اسلام کے سرچشمۂ حیات تک پہنچے، اسی طرح ان کا فن بھی احساس و شعور کی ایک نئی جہت، ایک اعلیٰ نصب العین کے لیے نئے سوز و ساز اور نئے آہنگ و انداز سے آشنا ہوا۔''[۳۹]

حوالے اور حواشی

۱۔ اقبال کے زمانۂ قیامِ یورپ میں حافظ محمود شیرانی بھی لندن میں مقیم تھے۔ ماسوا اگست تا دسمبر ۱۹۰۶ء کے، جب والد کی وفات کی وجہ سے انھیں وطن آنا پڑا۔ (ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی: ''علامہ اقبال اور حافظ محمود شیرانی'' در اقبال، لاہور، جنوری ۱۹۹۷ء، ص ۲۳)

۲۔ عبداللہ انور بیگ *The Poet of the East*، ص ۱۷-۱۸۔ نیز مکاتیبِ حافظ محمود شیرانی ص ۴۱-۴۲، ۱۱۹، ۱۳۵ وغیرہ۔

۳۔ *Journal of the Research Society of Pakistan*، لاہور، اکتوبر ۱۹۷۷ء

۴۔ اقبال نامہ، ص ۴۰۸

۵۔ *The Poet of the East*، ص ۱۸

۶۔ ذکرِ اقبال، ص ۵۷

۷۔ اقبال از عطیہ بیگم، ص ۳۱

۸۔ اقبال یورپ میں، ص ۱۹۸

۹۔ ایضاً، ص ۱۴۴

۱۰۔ زندہ رُود (ص ۱۶۵) میں لندن سے روانگی کی تاریخ ۳ر جولائی بتائی گئی ہے، مگر ڈاکٹر درانی اور ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی دونوں کا خیال ہے کہ اقبال ۸ یا ۹ر جولائی کو لندن سے روانہ ہوئے ہوں گے۔ (اقبال یورپ میں، ص ۲۲۳، عروجِ اقبال، ص ۳۳۴) ہم نے قیاسی توقیت اس طرح مرتب کی ہے: لندن سے روانگی اور پیرس آمد: ۸ر جولائی۔ پیرس میں قیام: دو روز: ۹، ۱۰ر جولائی۔ (ایما ویگے ناسٹ کو ۲۷ر جون ۱۹۰۸ء کے خط میں لکھتے ہیں: ''چندروز پیرس میں رُکوں گا، جہاں مجھے کچھ کام ہے۔'' (اقبال یورپ میں، ص ۲۰۱) پیرس سے روانگی: ۱۱ر جولائی (درانی صاحب کے خیال میں پیرس سے بمبئی تک کے سفر میں بحری جہاز میں ۱۱ تا ۱۳ دن لگتے تھے، اس لیے) بمبئی میں آمد: ۲۴ر جولائی کی شب یا

۲۵؍جولائی کی صبح۔

۱۱۔ مرزا جلال الدین: ملفوظاتِ اقبال، ص ۹۶

۱۲۔ مقالاتِ ممتاز، ص ۴۲۱

۱۳۔ ڈاکٹر اسرار احمد: ''قائدِ اعظم اور علامہ اقبال کی شخصیات کا تقابل'' درروزنامہ نوائے وقت، لاہور، ۱۱؍ ستمبر ۲۰۰۷ء

۱۴۔ محمد علی جوہر، مقابلے کے امتحان میں شرکت کے لیے گئے تھے، جو اس زمانے میں انگلستان میں منعقد ہوتا تھا، مگر وہ یہ معرکہ سر نہ کر سکے، حالانکہ محمد علی جوہر نہایت ذہین اور قابل طالب علم تھے۔ بی اے کے امتحان میں صوبے بھر میں اوّل آئے تھے۔ انھوں نے اپنی ناکامی کی توجیہہ یوں بیان کی ہے: ''اس میں کچھ انگریزوں کے موسمِ بہار کا دخل تھا اور کچھ ایک نوجوان کی تھوڑی بہت احمقانہ ترنگ کا۔'' (بحوالہ: عروجِ اقبال، ص ۳۱۸) جہاں تک حافظ محمود شیرانی کا تعلق ہے، وہ اپنی صحت کی خرابی اور دِگرگوں مالی حالات کے سبب بارایٹ لامکمل نہ کر سکے۔

۱۵۔ شادی شدہ تھے، مگر انگلستان میں ایک میم کے جال میں پھنس گئے۔ والد، بصد منت و سماجت واپس بلانے میں کامیاب ہوئے۔

۱۶۔ ممتاز حسن: مقالاتِ ممتاز، ص ۴۱۰

۱۷۔ رسالہ جوہر، دہلی، اقبال نمبر، مئی ۱۹۳۸ء، ص ۶۵-۶۶

۱۸۔ مکتوب بنام وحید احمد، محررہ: ۷؍ ستمبر ۱۹۲۱ء منقولہ: انوارِ اقبال، ص ۱۷۶

۱۹۔ بانگِ درا، ص ۲۶۷

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۳۶

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۴۰-۱۴۲

۲۲۔ حکیم احمد شجاع: ''اقبال کا قیامِ لاہور'' درنقوش، ستمبر ۱۹۶۷ء، ص ۱۳

۲۳۔ عطیہ بیگم کی کتاب کا تحقیقی تجزیہ ایک مستقل مقالے کا موضوع ہے۔ اس کتاب کے علاوہ کچھ دیگر شواہد بھی اس امر کی تائید کرتے ہیں کہ عطیہ بیگم مجلسی ہنگاموں اور تفریحی مشاغل کی دلدادہ تھیں، مثلاً دیکھیے: ماہر القادری کا ایک چشم کشا مضمون، جس کے بعض حصے پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اپنی کتاب فکر و فن میں نقل کیے ہیں۔ (ص ۱۹ تا ۲۸)

۲۴۔ درانی صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں کہ عطیہ بیگم نے اپنی کتاب میں ''بے پر کی ہوائیاں اڑائی ہیں''۔ (نوادرِ اقبال: یورپ میں، ص ۲۵)

۲۵۔ عروجِ اقبال، ص ۳۲۱-۳۲۵

۲۶۔ اقبال از عطیہ بیگم، ص ۲۲

۲۷۔ آخرِ شب، ص ۹۷

۲۸۔ عروجِ اقبال، ص ۳۲۷

۲۹۔ فکر و فن، ص ۵۳

۳۰۔ ۱۱؍جنوری ۱۹۰۹ء کے خط میں ایما کو لکھتے ہیں: "کچھ عرصے کے بعد جب میرے پاس کچھ پیسے جمع ہو جائیں گے تو یورپ میں اپنا گھر بناؤں گا۔" (اقبال یورپ میں، ص۲۰۳)

۳۱۔ نوادرِ اقبال: یورپ میں، ص۱۹

۳۲۔ اقبال یورپ میں، ص۱۹۲۔۲۱۷

۳۳۔ اقبال از عطیہ بیگم، ص۱۱

۳۴۔ اقبال یورپ میں، ص۲۰۲

۳۵۔ بانگِ درا، ص۱۲۷

۳۶۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، عروجِ اقبال، ص۴۱۱

۳۷۔ ایضاً

❖......❖......❖

۹

اور آزادی میں، بحرِ بے کراں ہے زندگی

بیرسٹر شیخ محمد اقبال جولائی کے آخری ایام میں سیالکوٹ پہنچے۔ یہ بات تو واضح ہو چکی تھی کہ اب وہ نوکری نہیں کریں گے، بلکہ وکالت ہی کو وسیلۂ معاش کے طور پر اپنائیں گے۔ وکیل کے طور پر عملی زندگی کے آغاز کے لیے لاہور موزوں ترین جگہ تھی۔ بیرسٹر اقبال سے پورے گھرانے کی امیدیں وابستہ تھیں، خصوصاً شیخ عطا محمد کی، جو اب تک اپنے ہونہار بھائی کی مالی کفالت کرتے چلے آ رہے تھے۔

اگست ۱۹۰۸ء کے اوائل میں، جب اقبال گھر سے تین سال کی غیر حاضری کے بعد، ایک لمبے سفر کی تکان اتار رہے تھے، شیخ عطا محمد لاہور آئے اور بیرسٹر اقبال کے دفتر کے لیے مناسب جگہ تلاش کرنے لگے۔ اس سلسلے میں اقبال کے دوست اور انھی کی طرح کے ایک بیرسٹر مرزا جلال الدین نے ان کی بہت مدد کی، چنانچہ شیخ عطا محمد نے یہ کام مرزا صاحب ہی کے سپرد کر دیا، جنھوں نے چنگڑ محلہ، موہن لال روڈ [موجودہ اردو بازار] میں واقع ایک مکان اس مقصد کے لیے کرائے پر لیا اور دفتری ضروریات کے علاوہ مقدمات کی تیاری کے لیے ضروری کتابیں بھی فراہم کر لیں۔

۱

اقبال جلد ہی سیالکوٹ سے لاہور پہنچے اور وکالت کا آغاز کر دیا۔ بیرسٹر اقبال کا یہ دفتر ضلع کچہری کے بالکل قریب واقع تھا۔ وہ حسب عادت محنت اور توجہ سے مقدمات کی تیاری کرتے۔ دفتری کاموں میں معاونت کے لیے انھوں نے کاہن چند نامی ایک ہندو کو بطور منشی ملازم رکھ لیا۔

یہ سلسلہ بمشکل کوئی دو ماہ تک چلا ہوگا کہ اقبال نے محسوس کیا کہ یہ جگہ ان کے لیے موزوں نہیں ہے۔ ایک تو یہ احساس کہ ان کے بیشتر احباب چیف کورٹ میں وکالت کرتے ہیں، دوسرے: ضلع کچہری کی ماتحت عدالتوں کا ماحول اور وہاں قانونی بحث مباحثے کا معیار بالیقین اقبال جیسے قابل اور ذہین شخص کے معیار سے فروتر ہوگا، چنانچہ اکتوبر میں انھوں نے چیف کورٹ

میں درخواست گزاری کہ انھیں بطور وکیل چیف کورٹ میں کام کرنے کی اجازت دی جائے۔ وہی عدالت، جس نے چند سال پہلے اقبال کو قانون کے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دی تھی، اب انھیں بیرسٹر ایٹ لا تسلیم کر رہی تھی۔ ۳۰/ اکتوبر کو انھیں چیف کورٹ میں قانونی پریکٹس کا اجازت نامہ جاری کر دیا گیا۔

اقبال نے جلد ہی اپنی قیام گاہ تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ انارکلی بازار میں واقع ایک مکان کرائے پر لیا اور اپنے دفتر سمیت اس نئے مکان میں منتقل ہو گئے۔ ان سے پہلے ان کے دو وکیل دوست سر محمد شفیع اور سر فضل حسین اسی مکان میں قیام پذیر رہے تھے۔ یہ جگہ چیف کورٹ [موجودہ ہائی کورٹ] سے دُور نہ تھی، اس کے باوجود اقبال نے سواری کے لیے ایک گگ [گھوڑا گاڑی] مہیا کر لی۔ شاید یہ بیرسٹر ایٹ لا کی حیثیت کا تقاضا بھی تھا۔ اس میں وہ کچہری جاتے، اسے بعض اوقات خود چلایا کرتے تھے۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے ایک پوربیا ملازم تھا[1]۔" اس اثنا میں اقبال نے علی بخش کو اپنے پاس بلا لیا۔ یہ سیدھا سادہ محبت کرنے والا محنتی قسم کا نوجوان تھا۔ ولایت جانے سے قبل بھی، وہ اقبال کے ساتھ رہتا تھا[2]۔

اقبال نے وکالت کا پیشہ سوچ سمجھ کر اختیار کیا تھا اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ اقبال کی آزاد منش طبیعت کے مطابق تھا۔ اقبال کی طبیعت، مزاج، تعلیم اور صلاحیتوں کے اعتبار سے وسیلۂ معاش کے طور پر دو پیشے موزوں ہو سکتے تھے۔ اول: درس و تدریس، دوم: وکالت۔ درس و تدریس سے انھیں طبعاً ایک رغبت اور مناسبت تھی، لیکن نوکری کیے بغیر درس و تدریس سے وابستہ رہنا ممکن نہ تھا۔ کسی کالج یا یونی ورسٹی سے منسلک رہ کر ہی وہ ایسا کر سکتے تھے اور نوکری ان کے مزاج سے لگا نہیں کھاتی تھی۔ بارہا انھوں نے اس کا اظہار بھی کیا۔ ایک بار اپنے بھتیجے شیخ اعجاز احمد سے کہنے لگے: "جن دِنوں مَیں گورنمنٹ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر تھا، ایک دِن پرنسپل نے طالب علموں کی حاضری کے سلسلے میں میرے ساتھ اس انداز میں بات کی، جیسے اپنے کلرک سے کر رہا ہو، اس لیے اُس دِن سے میری طبیعت ملازمت سے متنفر ہو گئی اور مَیں نے تہیہ کر لیا کہ جہاں تک ہو سکے گا، مَیں ملازمت سے احتراز کروں گا[3]۔"

ولایت سے واپسی پر وہ درس و تدریس کے بجائے وکالت کرنے لگے۔ ان کے دیرینہ ملازم علی بخش کو تعجب ہوا کہ ڈاکٹر صاحب نے گورنمنٹ کالج کی اچھی خاصی ملازمت چھوڑ دی ہے، حالانکہ اس میں ہر ماہ ایک بندھی رقم مل جاتی تھی اور آگے چل کر ترقی کے بھی بہت سے امکانات

تھے۔ اس نے پوچھا: 'شیخ صاحب! آپ نے نوکری کیوں چھوڑ دی؟' کہنے لگے: ''علی بخش! انگریز کی ملازمت میں بڑی مشکلیں ہیں۔ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ میرے دِل میں کچھ باتیں ہیں، جنھیں مَیں لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہوں، مگر انگریز کا نوکر رہ کر انھیں کھلم کھلا نہیں کر سکتا۔ اب مَیں بالکل آزاد ہوں؛ جو چاہوں، کروں؛ جو چاہوں، نہ کروں'' [۴]۔

جب وہ گورنمنٹ کالج میں جز وقتی ملازمت کر رہے تھے تو محکمہ تعلیم نے انھیں کل وقتی صدرِ شعبۂ فلسفہ کا منصب پیش کیا، مگر وکالت کو ترک کیے بغیر ایسا ممکن نہ تھا۔ ان کے دوستوں کی رائے بھی ملازمت کے حق میں نہ تھی، کیونکہ یہ 'اپنے پاؤں میں بیڑی ڈال کر بیٹھ' رہنے کے مترادف تھا اور اس سے 'قوتِ عمل کے سلب ہونے کا احتمال' تھا [۵]۔ پس انھی وجوہ سے اقبال نے ۱۹۰۸ء میں ملازمت سے استعفا دے دیا تھا۔

لاہور پہنچ کر ابھی انھوں نے وکالت کا آغاز کیا ہی تھا کہ پھر ملازمتوں کی پیش کش ہونے لگی۔ پہلے تو انھیں علی گڑھ کالج میں بطور پروفیسر فلسفہ بلایا گیا اور جب انھوں نے انکار کیا تو بعض حلقوں نے ان پر تنقید کی کہ وہ ایک قومی خدمت بجا لانے سے انکاری ہیں۔ کچھ عرصے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں تاریخ کی پروفیسری کی پیش کش ہوئی، مگر وہ ملازمت کا طوق دوبارہ گلے میں ڈالنے پر بالکل آمادہ نہ ہوئے [۶]۔

یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ علامہ اقبال کوئی ماورائی مخلوق نہیں، گوشت پوست کے انسان تھے۔ وکالت کا پیشہ اختیار کرنے میں یہ بات بھی پیش نظر ہوگی کہ مستقبل میں ان پر جو مالی ذِمہ داریاں آنے والی تھیں، وہ خوش اسلوبی کے ساتھ ان سے عہدہ برآ ہوسکیں اور زندگی میں معاشی آسودگی حاصل رہے۔ خاندانی اعتبار سے وہ کوئی امیر شخص نہ تھے، بلکہ ان کی تعلیم بھی بڑے بھائی، شیخ عطا محمد کی مالی اعانت ہی سے مکمل ہوئی تھی۔ شیخ عطا محمد ستمبر ۱۹۱۲ء میں ملازمت سے سبک دوش ہوگئے [۷]، چنانچہ پورے گھرانے کی کفالت زیادہ تر اقبال کے ذمے تھی۔ سیالکوٹ کا گھرانا: والدین، شیخ عطا محمد، ان کے اہل خانہ اور اقبال کی ہمشیرگان (=نو دس افراد) پر مشتمل تھا۔ اقبال اپنے اہل خانہ (کریم بی بی، آفتاب اقبال، معراج بیگم) کی کفالت سے بھی غافل نہ تھے۔ لاہور میں قیام کے اخراجات (خود اقبال، ایک منشی، ایک ملازم: علی بخش، گھوڑا گاڑی اور اس کا پوربی سائیس وغیرہ) اس پر مستزاد۔

لندن میں جنوری ۱۹۰۸ء کی ۲۲ تاریخ کو، جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور کی ملازمت سے

استعفے کا خط لکھ رہے تھے تو یقیناً اُن کے تصور میں ہوگا کہ مستقبل میں اُن پر کیا مالیاتی ذِمہ داریاں اور اخراجات کا بارِ گراں آنے والا ہے اور یورپ سے واپسی پر، اُنھیں اپنی مالی ذِمہ داریوں کو نباہنے کے لیے اچھی خاصی رقم درکار ہوگی، جو فقط نوکری سے میسر نہ آسکتی تھی، چنانچہ پیشۂ وکالت اختیار کرنے میں یقیناً مالی پہلو بھی اقبال کے پیشِ نظر رہا ہوگا۔ ولایت جانے سے پہلے چار پانچ سال تک وہ معلم رہے تھے اور اس حیثیت میں انھیں نوکری کی قباحتوں کا اندازہ بخوبی ہو چکا تھا۔

۲

سوانحِ اقبال کا مطالعہ کرتے ہوئے، ایک اَور اشکال بھی سامنے آتا ہے، جس کی یہاں وضاحت ضروری ہے۔ ۱۹۱۲ء یا ۱۹۱۳ء کی بات ہے، سر علی امام نے اقبال سے کہا کہ مہاراجا اَلْوَر کے پرائیویٹ سیکرٹری کی اسامی خالی ہے اور مَیں ان سے آپ کا ذِکر بھی کر چکا ہوں، آپ وہاں چلے جائیں تو اچھا ہے۔ اقبال ابتدائی معلومات حاصل کیے بغیر منشی طاہر الدین اور علی بخش کو لے کر اَلْوَر پہنچ گئے۔ مہاراجا سے ملے تو پتا چلا کہ تنخواہ صرف چھے سو روپے ہوگی۔ (حالانکہ اس سے زیادہ، یعنی سات آٹھ سو روپے کی آمدنی تو وکالت سے ہو جاتی تھی) چنانچہ اقبال خاموشی سے واپس آگئے[۸]۔ اعتراض یہ ہوسکتا ہے کہ جب وہ ذہناً نوکری کے مخالف تھے تو اَلْوَر گئے ہی کیوں؟ ...... ہمارا خیال ہے کہ مالی مشکلات کی بنا پر ایسا کیا ہوگا۔ گورنمنٹ کالج، لاہور کی جُز وقتی ملازمت ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۰ء کو ختم ہو چکی تھی۔ (ایک روایت کے مطابق اس سے ماہانہ پانچ سو روپے کی یافت ہو جاتی تھی۔) آمدنی کم ہوگئی اور اخراجات میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ عین اسی زمانے میں، شیخ عطا محمد کے وظیفہ یاب ہو جانے سے اقبال کی معاشی اور کفالتی ذِمہ داریوں میں اچانک اضافہ ہوگیا۔ اَلْوَر میں نوکری کی توقع اور پھر مایوسانہ واپسی کی وضاحت کرتے ہوئے اقبال اپنے ایک قریبی دوست، مہاراجا کشن پرشاد کو لکھتے ہیں: ''اَلْوَر کی ملازمت نہ کرنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ تنخواہ قلیل تھی۔ سات آٹھ سو روپے ماہوار تو لاہور میں بھی مل جاتے ہیں۔ اگرچہ میری ذاتی ضروریات کے لیے تو اسی قدر رقم کافی، بلکہ اس سے زیادہ ہے، تاہم چونکہ میرے ذِمے اَوروں کی ضروریات کا پورا کرنا بھی ہے، اس واسطے اِدھر اُدھر دوڑ دھوپ کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ گھر بھر کا خرچ میرے ذِمے ہے۔ بڑے بھائی جان، جنھوں نے اپنی ملازمت کا اندوختہ میری تعلیم پر خرچ کر دیا، اب پنشن پا گئے۔ ان کے اور ان کی اولاد کے اخراجات بھی میرے ذِمے ہیں اور ہونے چاہییں۔ خود تین بیویاں رکھتا ہوں اور دو اولادیں۔''[۹]

ایک اَور موقع پر حیدر آباد دکن میں عدالتِ عالیہ کے جج کے طور پر، اقبال کے تقرر کا امکان پیدا ہوا۔ جج کا یہ منصب اقبال کے لیے ایک باوقار ملازمت کے مترادف تھا۔ مزید برآں حیدر آباد میں مہاراجا کشن پرشاد، سر اکبر حیدری اور دیگر مداحوں کی موجودگی اقبال کے لیے باعثِ کشش تھی۔ مولانا گرامی جیسے بے تکلف اور ہم مذاق سخن گو کی صحبت کا امکان اس پر مستزاد۔ اس منصب کے حصول کے لیے اقبال نے کچھ زیادہ دوڑ دھوپ تو نہیں کی، تاہم بطور جج تقرر کے وہ آرزومند ضرور تھے۔[۱۰]

ایک اَور موقع پر انھیں جامعہ عثمانیہ میں قانون کی پروفیسری کی پیش کش ہوئی۔[۱۱] مالی آسودگی کے پیش نظر ہی اقبال اس کے لیے بھی رضا مند تھے، مگر ان میں سے کوئی تجویز بھی بروے کار نہ آسکی اور انھوں نے اسی وکالت کے اسی آزادانہ پیشے پر اکتفا کیا۔ یہ وسیلۂ معاش آئندہ زندگی میں ان کے لیے بہتر ثابت ہوا۔

اقبال انار کلی والے مکان میں اکیلے ہی رہتے تھے۔ ان کی بیگم اور بچے شاید ہی کبھی لاہور آکر ان کے پاس مقیم ہوئے ہوں۔ کاہن چند کی طبیعت میں کچھ جھگڑالو پن تھا، چنانچہ اس کی جگہ منشی طاہر الدین نے لے لی تھی۔ اس سے قبل، وہ سر محمد شفیع کے منشی رہ چکے تھے۔ وہ مقدمات کی تیاری میں معاونت کے ساتھ متفرق دفتری امور بھی سر انجام دیتے اور آمد و خرچ کا حساب رکھتے۔ اپنی خدمت گزاری کے سبب انھوں نے اقبال کی طبیعت میں رفتہ رفتہ ایسا رسوخ اور اعتبار پیدا کرلیا تھا کہ وہ تا حینِ حیات، اقبال گھرانے سے وابستہ رہے، بلکہ ۱۹۳۵ء میں علامہ نے اپنے وصیت نامے میں انھیں بھی بچوں کے سرپرستوں میں شامل کیا (باقی تین: چودھری محمد حسین، میاں امیر الدین اور سر راس مسعود)۔[۱۲]

چیف کورٹ میں وکالت کے زمانے میں اقبال کو چند مخلص دوست مل گئے، مثلاً: مولوی احمد دین، میاں شاہ دین، شیخ گلاب دین، مرزا جلال الدین، میاں فضل حسین، لالہ لاجپت رائے، پنڈت شو نارائن شمیم اور لالہ شادی لال وغیرہ۔ ان لوگوں کی صحبت و رفاقت، اقبال کے لیے ذہنی طمانیت اور آسودگی کا باعث ثابت ہوئی۔

اگرچہ اقبال پیشۂ وکالت میں نو وارد تھے، لیکن انھوں نے وکالت کو بڑی سنجیدگی سے وسیلۂ معاش کے طور پر اپنا لیا تھا، جس کے نتیجے میں ان کے اندر اعتماد پیدا ہوا اور ایک وکیل کی حیثیت سے رفتہ رفتہ ان کی ساکھ بڑھتی گئی۔ مرزا جلال الدین نے اقبال کی، اس زمانے کے شب و روز کی

مصروفیات کا بڑا عمدہ نقشہ کھینچا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ میرے اور اقبال کے تعلقات بہت گہرے ہو چکے تھے۔ ہمارا معمول یہ تھا کہ ہم دس بجے کے قریب چیف کورٹ پہنچتے۔ بار روم میں دوسرے وکلا سے بھی ملاقات ہوتی۔ ادھر اُدھر کی گپ چلتی، اس دوران میں جس کسی کا مقدمہ پیش ہوتا، وہ اپنی پیشی بھگتا کر واپس بار روم میں آ جاتا۔ پُر مذاق باتوں اور تبادلہ ٔ خیال کا سلسلہ جاری رہتا۔ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت میں ظرافت کو دخل تھا۔ وہ فارغ اوقات میں بار روم میں بیٹھ کر اپنی ظریفانہ باتیں شروع کرتے تو متعدد افراد ان کے گرداگرد جمع ہو جاتے[۱۳]۔ اقبال بار روم میں بیٹھے بیٹھے کبھی کبھی سگریٹ بھی سلگا لیا کرتے۔

رفتہ رفتہ مرزا جلال الدین سے اقبال کی قربت اتنی بڑھی کہ عدالت کے کام سے فارغ ہو کر وہ اپنی گگ واپس بھیج دیتے اور مرزا صاحب کے ساتھ ان کی موٹر کار میں ان کے دفتر چلے جاتے اور رات گئے تک انھی کے پاس ٹھہرتے۔ اسی زمانے میں مرزا صاحب ہی کی وساطت سے نواب سر ذوالفقار علی خاں اور سر جوگندر سنگھ سے بھی ان کا تعارف ہوا اور بے تکلفی کی حد تک مراسم قائم ہو گئے۔ ان تینوں حضرات کو 'اصحابِ ثلاثہ' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اقبال کبھی کبھی رات کو مرزا جلال الدین کے ہاں ہی ٹھہر جاتے۔ مرزا صاحب رقص و سرود کی محفل کا اہتمام کیا کرتے۔ بعض اوقات گانے بجانے کی ایسی محفل اقبال کی سخن گوئی کے لیے مہمیز کا کام کرتی اور ان کی طبیعت جوش میں آ جاتی۔ مرزا جلال الدین راوی ہیں کہ بانگِ درا کی نظم (یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے) کی بنیاد ایسی ہی ایک محفل میں رکھی گئی تھی۔[۱۴]

۳

وکالت کو شروع کیے ہوئے ابھی چند ماہ ہی گزرے تھے کہ یکا یک اقبال کی مصروفیت میں اضافہ ہو گیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے قائم مقام پروفیسر یاٹ جیمز یکم مئی ۱۹۰۹ء کو اچانک انتقال کر گئے۔ فوری طور پر فلسفے کا کوئی متبادل استاد موجود نہ تھا۔ چنانچہ گورنمنٹ کالج کے پرنسپل رابسن نے مسئلے کے فوری حل کے لیے اقبال سے رابطہ کیا۔ وہ رضا مند ہو گئے، بشرطیکہ عدالتِ عالیہ میں ان کے مقدمات قدرے تاخیر سے ایسے وقت میں پیش ہوں کہ وہ گورنمنٹ کالج میں درس و تدریس مکمل کر لیں۔ چیف کورٹ نے گورنمنٹ کالج کے پرنسپل کی درخواست پر قدرے تامل کے بعد، اقبال کو اجازت دے دی کہ موسمِ گرما میں صبح ٦ بجے سے ۹ بجے تک اور موسمِ سرما میں ۹ بجے سے ۱۲ بجے تک فلسفے کے طلبہ کو پڑھائیں، ان کے مقدمات ان اوقات کے بعد عدالت میں

پیش ہوا کریں گے۔" اس عرصے میں معلمی اور وکالت کے سلسلے میں اقبال کو اتنی تگ و دو کرنی پڑتی کہ ان کا سارا وقت اسی میں صرف ہو جاتا۔ تمام دن تدریسی مشاغل یا مقدمات کی پیروی میں گزر جاتا۔ شام کو موکلوں کی ملاقات کے لیے دفتر میں بیٹھنا پڑتا اور رات گئے تک اگلے مقدمات کی تیاری کرتے رہتے۔ بسا اوقات طالب علم گھر پر بھی پڑھنے آ جاتے"[۱۵]۔

پہلے بھی یہ ذکر ہو چکا ہے کہ اقبال طبعاً محنتی انسان تھے۔ اپنے فرائض کی بجا آوری میں ہمیشہ مستعد رہتے اور وقت کی پابندی کرتے، لیکن ایک بات انھیں ہمیشہ رنجیدہ رکھتی اور بعض اوقات اداس کر دیتی کہ شعر و شاعری کی جو صلاحیت اور جو نعمت انھیں اللہ نے ودیعت کی تھی، اس کے اظہار کے لیے انھیں خاطر خواہ وقت نہیں ملتا۔ بقول جاوید اقبال: "شعر کہنے کا وقت نہ ملتا تھا، بلکہ ایسی مہلت کے لیے وہ ترستے ہی رہتے تھے"[۱۶]۔ اس محرومی کے نتیجے میں بسا اوقات وہ ایک گہرے تأسف میں ڈوب جاتے۔ اکثر و بیشتر دوستوں سے اس کا اظہار بھی کرتے، مثلاً: شاطر مدراسی نے مجموعہ کلام مرتب کرنے کی طرف متوجہ کیا تو ۲۹ راگست ۱۹۰۸ء کو انھیں لکھا: میں کیا اور میرا کلام کیا، نہ مجھے ان اوراقِ پریشاں کے جمع کرنے کی فرصت ہے، نہ حقیقت میں اس کی ضرورت ہے۔ محض دوستوں کے دل بہلانے کے لیے کبھی کبھی کچھ لکھتا ہوں اور وہ بھی مجبوراً۔[۱۷] اسی طرح ۴ رجنوری ۱۹۰۹ء کو تلوک چند محروم کو لکھا: "افسوس ہے کہ میں بوجہ مصروفیت فی الحال شعر گوئی سے محروم ہوں"[۱۸]۔ منشی سراج الدین کو ۴ را کتوبر ۱۹۱۵ء کو لکھا: "موجودہ مشاغل وقت نہیں چھوڑتے اور جوں جوں اس پروفیشن میں زمانہ زیادہ ہوتا جاتا ہے، کام بڑھ ہی جاتا ہے [کذا]۔ لٹریری مشاغل کے امکانات کم ہو جاتے ہیں"[۱۹]۔

مابعد زمانے میں بھی وکالت کے 'مشاغل' کی زیادتی کا احساس ہمیشہ اقبال کے ذہن پر غالب و مستولی رہا، مثلاً محمد دین فوق کو ۶ مارچ ۱۹۱۷ء کو بتایا کہ روزی کے دھندوں سے فرصت نہیں ملتی[۲۰]۔ ۱۷ راپریل ۱۹۲۲ء کو عبدالماجد دریابادی کو مطلع کرتے ہیں کہ فکرِ روزی، قاتلِ رُوح ہے؛ یکسوئی نصیب نہیں[۲۱]۔

۳۱ دسمبر ۱۹۱۰ء کو متبادل انتظام ہونے پر انھوں نے گورنمنٹ کالج میں درس و تدریس کی ذمہ داری سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس زمانے میں حیاتِ اقبال کے بعض متفرق واقعات قابلِ ذکر ہیں، جن سے ان کی دلچسپیوں یا سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

۴

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس ۲۷ تا ۲۹ ردسمبر ۱۹۱۰ء کو امرتسر میں منعقد ہو رہا تھا، اس موقعے پر اقبال نے ایک نمائندہ وفد کے ہمراہ کانفرنس کے صدر، خواجہ محمد سلیم اللہ خاں (نواب ڈھاکا) سے ملاقات کی اور انھیں فارسی زبان میں ایک سپاس نامہ پیش کیا، جس میں اُن سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ انجمن کشمیری مسلمانان کی سرپرستی قبول فرمائیں [۲۲]۔ خواجہ صاحب نے انجمن کا صدر بننا قبول کر لیا۔

اسی زمانے میں کشمیریوں کا ایک وفد مہاراجا کشمیر سر پرتاپ سنگھ سے ملاقات کرنے والا تھا۔ یہ لوگ اقبال کو بھی وفد میں شامل کرنا چاہتے تھے، پہلے تو وہ رضامند نہ ہوئے۔ لیکن پھر اپنے عزیز دوست محمد دین فوق کے اصرار پر بادلِ نخواستہ وفد میں شامل ہو گئے۔ یہ ملاقات لاہور کے کشمیر ہاؤس میں ہوئی۔ مہاراجا نے اقبال کی شاعرانہ حیثیت اور شہرت کا ذکر سن رکھا تھا۔ پوچھنے لگے:

"ڈاک دار صاحب! سنا ہے کہ آپ بیت بناتے ہیں؟"

اقبال نے کہا: سرکار! بیت نہ کبھی مَیں نے بنائے ہیں، نہ میرے باپ دادا نے۔ اس کے علاوہ ڈاک دار بھی نہیں، نہ مَیں نے کبھی ڈاک کا کام کیا ہے، نہ میرے بزرگوں نے۔

مہاراجا حیرانی سے اقبال کے دوستوں کا منہ تکنے لگے۔ کسی نے وضاحت کی: حضور! یہ شاعر ہیں اور شعر تحریر کرتے ہیں۔ شعر کو بیت بھی کہتے ہیں، مگر انھوں نے بیت کو بید سمجھا، جس سے کرسیاں بنائی جاتی ہیں۔

مہاراجا نے اقبال سے کوئی شعر سنانے کی فرمائش کی۔ جب اقبال شعر پڑھنے لگے تو مہاراجا بولے: "یوں نہیں، گا کر پڑھیے۔ اقبال نے فوق کی طرف دیکھا اور دبی زبان میں کہا: جی تو چاہتا ہے، کہوں کہ میرے دوستوں کے پاؤں میں گھنگرو باندھیے تو مَیں گاؤں۔ پھر چند شعر ترنم سے پڑھے اور انھیں مہاراجا نے خود بھی کچھ شعر فارسی کے سنائے" [۲۳]۔

۵

۲۸ رمارچ ۱۹۰۹ء کو حیدر آباد دکن کا سفر درپیش ہوا۔ اس سفر کی غایت کیا تھی؟ یقینی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ اس زمانے میں متعدد نامور ادیب، شاعر اور اہلِ علم حضرات ریاست حیدر آباد سے وابستہ تھے اور ریاست بھی اہلِ علم کی قدر دان تھی۔ ہندستان کے متعدد اہلِ علم ریاست سے وظیفہ پاتے تھے۔ نوکری اقبال کی افتادِ طبع سے قطعاً مناسبت نہ رکھتی تھی۔ دوسرے، وہ ریاست کے

سازشی ماحول سے بھی واقف تھے، جہاں بعض اوقات کسی وابستۂ ریاست عالم یا ادیب کو کوئی وجہ بتائے بغیر ریاست بدری کا حکم تھما دیا جاتا تھا۔ سفرِ حیدر آباد دکن کے بارے میں ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ ان کے حیدر آباد جانے کا کوئی خاص [اور] متعین مقصد نہ تھا، البتہ ممکن ہے، ان کا خیال ہو، اگر دربارِ حیدر آباد میں بازیابی حاصل ہو گئی تو نظام کو تصنیف و تالیف کے سلسلے میں اپنے مستقبل کے عزائم کی اہمیّت سے روشناس کراؤں گا۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کا قیاس ہے کہ اگر ان عزائم کی اہمیّت کو سمجھتے ہوئے نظام انھیں کسی مناسب منصب کی پیش کش کرتے تو وہ غالباً اسے قبول کر لیتے، لیکن ایسی نوبت ہی نہ آئی۔[۲۴]

دراصل حیدر آباد کے عوام و خواص میں ان کے مداحوں کا ایک وسیع حلقہ موجود تھا، ان کے دو نمایاں قدردان، سر اکبر حیدری (۱۸۶۹ء-۱۹۴۲ء) اور مہاراجا کشن پرشاد اعلیٰ حکومتی مناصب پر فائز تھے۔ اقبال کے ہم مزاج اور بے تکلف دوست مولانا غلام قادر گرامی (۱۸۵۶ء-۱۹۲۷ء) بھی اس زمانے میں وہاں مقیم تھے۔ اسی طرح نواب بہادر یار جنگ بھی ان کی شاعری کے مداح تھے۔

حیدر آباد میں وہ سر اکبر حیدری کے ہاں مقیم ہوئے۔ سر اکبر اور ان کی بیگم نے اقبال کے لیے ہر آسائش مہیا کی۔ گول کنڈہ میں قطب شاہی سلاطین کے مقبرے دکھائے۔ اقبال لکھتے ہیں کہ اکبر حیدری ''مجھے ایک شب ان شاندار، مگر حسرت ناک گنبدوں کی زیارت کے لیے لے گئے، جن میں سلاطینِ قطب شاہیہ سو رہے ہیں۔ رات کی خاموشی، ابر آلود آسمان اور بادلوں میں سے چھن کر آتی ہوئی چاندنی نے اس پُر حسرت منظر کے ساتھ مل کر، میرے دل پر ایسا اثر کیا، جو کبھی فراموش نہ ہوگا''۔[۲۵] بانگِ درا کی نظم ''گورستانِ شاہی'' اسی سفر کی یادگار ہے:

سوتے ہیں خاموش، آبادی کے ہنگاموں سے دُور
مضطرب رکھتی تھی جن کو آرزوے ناصبور
قبر کی ظلمت میں ہے ان آفتابوں کی چمک
جن کے دروازوں پہ رہتا تھا جبیں گستر فلک
کیا یہی ہے ان شہنشاہوں کی عظمت کا مآل
جن کی تدبیرِ جہاں بانی سے ڈرتا تھا زوال
رعبِ فغفوری ہو دنیا میں کہ شانِ قیصری
ٹل نہیں سکتی غنیمِ موت کی یورش کبھی

بادشاہوں کی بھی کشتِ عمر کا حاصل ہے گور
جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور[۲۶]

اکبر حیدری اور ان کی بیگم نے اپنی مہمان نوازی کے سبب اقبال کے ''قیامِ حیدر آباد کو دلچسپ ترین بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا''[۲۷]۔

اسی سفر میں مہاراجا کشن پرشاد سے پہلی بار ملاقات ہوئی۔ آگے چل کر ان سے قریبی مراسم استوار ہو گئے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: محمد عبداللہ قریشی کی مرتبہ کتاب: اقبال بنام شاد)

واپسی پر اقبال ایک دو روز کے لیے اورنگ آباد رُکے اور اورنگ زیب عالمگیر کے مقبرے کی زیارت بھی کی۔

۶

یہ زمانہ اقبال کی شدید مصروفیات کا تھا۔ ان کا سارا وقت درس و تدریس اور وکالت کی مصروفیات میں نکل جاتا تھا۔ ذہنی طور پر بھی وہ ایک بے کلی، اضطراب اور انتشار کا شکار تھے، کیونکہ ان کی ازدواجی زندگی حسب سابق اختلال اور نا آسودگی سے دوچار تھی۔ اقبال جس کرب و اضطراب میں مبتلا تھے، اس کا اندازہ عطیہ بیگم کے نام ان کے خطوں سے لگایا جا سکتا ہے، مثلاً دیکھیے: ۱۹/ اپریل اور ۱۷/ جولائی ۱۹۰۹ء کے خطوط، جن میں اقبال کا شدید اضطراب، بلکہ ایک حد تک ان کی باغیانہ سوچ نمایاں ہے اور وہ ایک ناراض اور زندگی سے بیزار نوجوان (angry young man) کی طرح کبھی 'شراب نوشی میں پناہ لینے' کی بات کرتے ہیں، جو 'خودکشی کو آسان بنا دیتی ہے''۔ کبھی اس 'بدبخت ملک' سے ہجرت کر جانے کا عندیہ دیتے ہیں اور کبھی کہتے ہیں کہ ''مَیں سپیرا بن جاؤں گا اور بازاروں میں پھرتا پھروں گا''؛ لیکن ظاہر ہے، یہ ان کی وقتی سوچ تھی۔ اقبال کی باطنی شخصیت اتنی کمزور نہ تھی کہ وہ وقتی جذبات کی کسی رَو میں بہ جاتے۔ اندرونی طور پر وہ توانا اور مضبوط تھے اور والدین کی تربیت اور سید میر حسن کی تعلیم اور صحبت نے ان کے فکر و نظر کو ایسی جِلا بخشی تھی کہ ان کے لیے کسی طرح کی بے اعتدالی کا شکار ہو کر بھٹکنا آسان نہ تھا۔ چند ماہ بعد جب انھوں نے اپنی نجی ڈائری میں (جس کا نام انھوں نے ابتدا میں *Stray Thoughts* رکھا تھا، اور بعد ازاں *Stray Reflections* کے نام سے شائع کی۔) اپنی سوچ اور ذہن کی جھلکیاں مختصر اطریق پر قلم بند کرنی شروع کیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ عطیہ بیگم کے نام مذکورہ بالا خطوں کے برعکس، ان شذرات میں کسی طرح کی جذباتیت یا اضطراب یا ذہنی اختلال کا نام و نشان نہیں ملتا،

بلکہ ان میں بڑی حکمت و دانائی اور دانش وری نظر آتی ہے۔

یورپ سے واپسی کے بعد بزرگوں (والدین اور شیخ عطا محمد) کی کوشش رہی کہ اقبال اور ان کی بیگم کے درمیان نباہ کی کوئی صورت نکل آئے۔ اقبال بھی یہی چاہتے تھے، مگر ایسا نہ ہو سکا؛ چنانچہ بعض مخلص دوستوں کی تجویز پر اور والدین کی رضا مندی اور تائید سے ۱۹۱۰ء میں انھوں نے لاہور میں مقیم ایک کشمیری گھرانے کی خاتون، سردار بیگم سے عقدِ ثانی کر لیا۔ ابھی رخصتی نہ ہوئی تھی کہ ایک گم نام خط کے ذریعے سردار بیگم کے چال چلن کو مشکوک ٹھہرایا گیا۔ اب تو اقبال اَور بھی پریشان ہوئے۔ خوشگوار ازدواجی زندگی کا خواب تعبیر آشنا نہ ہو سکا۔ اقبال کے احباب حقیقتِ حال کا سراغ لگانے کی کوشش کرتے رہے۔ ڈیڑھ دو سال گزر گئے تو بعض قریبی دوستوں کے مشورے پر سردار بیگم کو طلاق دے کر کہیں اَور نکاح کے بارے میں سوچنے لگے۔ ۱۹۱۳ء کے ابتدائی دِنوں میں لدھیانہ کی مختار بیگم سے عقدِ ثالث ہوا۔ اسی اثنا میں ایک تو سردار بیگم نے براہِ راست اقبال کو خط لکھ کر یہ احساس دلایا کہ انھوں نے فقط سنی سنائی بات پر یقین کر لیا ہے اور قیامت کے روز وہ اس کے جواب دہ ہوں گے؛ دوسرے: تحقیق کرنے پر پتا چلا کہ گم نام خط کسی وکیل نے لکھا تھا، جو اپنے بیٹے کی شادی سردار بیگم سے کرنے کا متمنی تھا۔ اقبال بہت نادم ہوئے۔ اگست یا ستمبر میں سردار بیگم سے تجدید نکاح کے بعد اسے گھر میں لا بسایا۔ مختار بیگم اور سردار بیگم دونوں انارکلی والے مکان میں ایک ساتھ رہنے لگیں۔ بقول جاوید اقبال: ''دونوں میں ایسی محبت پیدا ہو گئی، جو بہنوں میں بھی پیدا نہیں ہوتی [۲۸]۔''

ازدواجی زندگی کا بحران ختم ہوا۔ زندگی پر سکون ہو گئی۔ ''والدۂ جاوید سے شادی کرنے کے بعد انھوں نے ایک دوست کو بتایا کہ ان کی شادی کیا ہوئی ہے، گویا جنت الفردوس مل گئی ہے [۲۹]''۔

حوالے اور حواشی

۱۔ روایاتِ اقبال، ص ۱۰۹

۲۔ یہاں تک کی جملہ معلومات ذکرِ اقبال، ملفوظات اور زندہ رُود سے اخذ کی گئی ہیں۔

۳۔ مظلوم اقبال، ص ۳۲۳

۴۔ اقبال نامہ، از حسرت، ص ۳۶

۵۔ ملفوظات، ص ۶۰

۶۔ Iqbal از عطیہ بیگم، ص ۳۶

۷۔ مظلوم اقبال، ص ۴۹
۸۔ زندہ رُود، ص ۲۰۵
۹۔ اقبال بنام شاد، ص ۵۶
۱۰۔ اقبالیات: تفہیم و تجزیہ، ص ۱۸؛ مکاتیب بنام گرامی، ص ۱۱۲؛ نیز اقبال بنام شاد، ص ۲۲۵، ۲۳۴
۱۱۔ اقبال بنام شاد، ص ۲۳۴
۱۲۔ اپنا گریباں چاک، ص ۲۹
۱۳۔ ملفوظات، ص ۶۱
۱۴۔ ایضاً، ص ۶۸
۱۵۔ زندہ رُود، ص ۱۷۴
۱۶۔ ایضاً، ص ۱۷۴
۱۷۔ خطوطِ اقبال، ص ۷۲-۷۳
۱۸۔ ایضاً، ص ۱۰۵
۱۹۔ اقبال نامہ، ص ۸۲
۲۰۔ انوارِ اقبال، ص ۶۴
۲۱۔ اقبال نامہ، ص ۲۱۳
۲۲۔ گم شدہ کڑیاں، ص ۱۴۴
۲۳۔ زندہ رُود، ص ۱۷۳-۱۷۴
۲۴۔ ایضاً، ص ۱۷۵
۲۵۔ مخزن، لاہور، جون ۱۹۱۰ء بحوالہ مکاتیب بنام گرامی، ص ۹۲
۲۶۔ بانگِ درا، ص ۱۵
۲۷۔ مخزن، لاہور، جون ۱۹۱۰ء بحوالہ مکاتیب بنام گرامی، ص ۹۲؛ نیز *Iqbal* از عطیہ بیگم، ص ۶۰-۶۱
۲۸۔ زندہ رُود، ص ۲۰۴
۲۹۔ اقبال درُونِ خانہ [اوّل]، ص ۱۴۱

❖......❖......❖

(۱۰)

......اک آبگینہ لایا ہوں

۱

۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۳ء تک کے اس عرصے میں اقبال کی سب سے بڑی مصروفیت وکالت ہی تھی۔ یہی ان کی ترجیح اوّل تھی، کیونکہ یہ ایک طرح سے ان کے 'کیریئر' کا مسئلہ تھا۔ مئی ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۰ء کے آخر تک گورنمنٹ کالج کی تدریسی ذمہ داریوں نے ان کی مصروفیات میں اضافہ کر دیا تھا؛ اس لیے، جیسا کہ گذشتہ اوراق میں ذکر ہوا، انھیں مشقِ سخن کے لیے سازگار ماحول اور مناسب وقت نہیں ملتا تھا۔ ان مصروفیات اور ازدواجی بحران کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مایوسی اور ذہنی اضطراب کے باوجود، اُن کی زندگی اور شخصیت میں چند باتیں نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہیں:

اول: تمام مصروفیات اور ذہنی الجھنوں کے باوجود وہ قومی اور اجتماعی مسائل سے کبھی بے نیاز نہیں ہوئے اور ملّی محاذ کے مختلف شعبوں میں ہمیشہ سرگرمِ کار رہے۔

دوم: اس زمانے میں انھوں نے علمی و فکری سطح پر تحریری و تصنیفی کام جاری رکھا۔

سوم: بطور شاعر اپنے پیغامبرانہ منصب کے تقاضوں کو فراموش نہیں کیا۔ اس عرصے میں متعدد قومی اور ملی نظمیں لکھیں اور ایک طرح سے ''ترجمانِ ملت'' بن گئے۔

چہارم: وہ مسلمانوں کے اجتماعی امور و معاملات میں سرگرمی کے ساتھ شریک ہوتے رہے۔

۲

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ بیسویں صدی کا ربع اوّل ہندستان میں ہنگامہ خیز تحریکوں کا زمانہ تھا۔ ان کے انتہائی قریبی دوست مرزا جلال الدین کے بقول اقبال کی ''طبیعت کو فطری طور پر سیاست سے مناسبت نہ تھی''[۱]، اس لیے وہ وقتی سیاست سے مجتنب رہے، البتہ اجتماعی مشکلات و مصائب میں انھوں نے امت کا ساتھ دیا اور کبھی پیچھے نہیں ہٹے۔ بحیثیت مجموعی ان کی جملہ مسائل لیے

عرصے کی سوچ اور مسلمانانِ عالم میں [فہم و فراست اور] ایک نئے شعور کی تخلیق پر مرتکز رہیں۔[۲]
کچھ تو اپنے علمی ذوق کی تسکین کے لیے اور کچھ حالاتِ حاضرہ کے تقاضوں کے پیشِ نظر انھوں نے دو طویل مقالے قلم بند کیے۔ Islam as A Moral and Political Ideal (اسلام ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین) کے عنوان سے انھوں نے ایک مقالہ انجمن حمایتِ اسلام، لاہور کے سالانہ جلسے منعقدہ ۱۰/اپریل ۱۹۰۹ء میں پڑھا، جو پہلے *The Observer*، لاہور میں اور بعد ازاں *The Hindustan Review*، (دی ہندستان ریویو، جولائی تا دسمبر ۱۹۰۹ء) میں شائع ہوا۔[۳] ۹/فروری ۱۹۱۱ء کو علی گڑھ یونی ورسٹی میں منعقدہ ایک جلسے میں دوسرا معرکہ آرا انگریزی مضمون The Muslim Community (ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر) پیش کیا، جس میں مسلم قومیت کے تین امتیازی پہلوؤں کی نشان دہی کی گئی تھی اور یہ بھی بتایا گیا تھا کہ مسلمانوں کے ذہنی عقیدے اور تہذیب و ثقافت میں کیا تعلّق ہے، ان کی تعلیمی، معاشی اور سیاسی کمزوریاں کیا ہیں اور اس صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کی تدابیر کیا ہیں؟[۴]

جہاں تک پیغامبرانہ منصب کے تحت اقبال کی شعر گوئی کا تعلّق ہے، جیسا کہ گذشتہ باب میں بھی ذکر ہوا، وہ بڑے تسلسل اور تاسّف کے ساتھ یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ وکالت کی مصروفیات کے سبب شعر گوئی کے لیے وقت میسر نہیں آتا؛ لٹریری مشاغل کے امکانات کم ہوتے جا رہے ہیں؛ شعر گوئی سے محروم ہوں، بلکہ محرومِ تخیل کر دیا گیا ہوں، وغیرہ۔

اقبال کے ان بیانات میں خاصی حد تک صداقت نظر آتی ہے، کیونکہ یورپ کے تین سالہ قیام کی طرح، واپسی پر بھی ان کی شعر گوئی کی رفتار نسبتاً کم رہی۔ اس عرصے میں، اگرچہ ان کی نظموں کی تعداد زیادہ نہیں، تاہم انھوں نے جو نظمیں لکھیں، وہ بہت معرکہ آرا ہیں اور تاریخی حیثیت رکھتی ہیں، مثلاً: 'شکوہ'، جو اپریل ۱۹۱۱ء میں انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے میں پیش کی گئی۔[۵]

اسی طرح 'شمع اور شاعر' (تخلیق: فروری ۱۹۱۲ء) جو انھوں نے ۱۶/اپریل ۱۹۱۲ء کو انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے میں پیش کی۔ سات آٹھ ماہ بعد نومبر ۱۹۱۲ء میں نظم 'جوابِ شکوہ' موچی دروازے کے باہر ایک جلسۂ عام میں پڑھی[۶] اور پھر اگلے ہی برس انھوں نے اسرارِ خودی کا آغاز کر دیا۔

یہ تو صرف طویل نظموں کا ذکر تھا۔ اقبال نے ۱۹۰۸ء (یورپ سے واپسی کے بعد) سے ۱۹۱۴ء تک تقریباً ۴۰ نظمیں لکھیں جو مختصر ہونے کے باوجود نہایت اہم اور اپنے موضوع پر یادگار

حیثیت رکھتی ہیں، جیسے: 'گورستانِ شاہی'، 'فلسفۂ غم'، 'ترانۂ ملی'، 'وطنیت'، 'بزمِ انجم'، 'خطاب بہ جوانانِ اسلام'، 'حضور رسالت مآب میں'، 'دعا'، 'فاطمہ بنتِ عبداللہ' اور 'صدیق' وغیرہ۔ خیال رہے کہ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۳ء تک کا زمانہ اقبال کے لیے شخصی اعتبار سے گوناگوں پریشانیوں کا زمانہ تھا۔ ازدواجی زندگی کی کشتی ہچکولے کھا رہی تھی اور اقبال ایک مسلسل اضطراب و بے یقینی اور احساسِ تنہائی کا شکار تھے۔ ۶/ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو اکبر الٰہ آبادی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں: ''لاہور ایک بڑا شہر ہے مگر میں اس ہجوم میں تنہا ہوں۔ ایک فردِ واحد بھی ایسا نہیں، جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکے:

طعنہ زن ہے ضبط اور لذت بڑی افشا میں ہے
ہے کوئی مشکل سی مشکل رازداں کے واسطے

لارڈ بیکن کہتے ہیں کہ: 'جتنا بڑا شہر ہو، اتنی ہی بڑی تنہائی ہوتی ہے۔ سو یہی حال میرا لاہور میں ہے، اس کے علاوہ گذشتہ ماہ میں بعض معاملات کی وجہ سے سخت پریشانی رہی اور مجھے بعض کام اپنی فطرت اور طبیعت کے خلاف کرنے پڑے اور ان ہی میں طبعِ سلیم میرے لیے شکنجے کا کام دے گئی۔''[۷]

۳

بلاشبہ اقبال کا قلبِ مضطرب؛ احساسِ تنہائی اور ذہنی و جذباتی ناآسودگی کے سبب ایک مستقل خلفشار میں مبتلا تھا اور طرح طرح سے اس کا اظہار بھی ہوتا رہا، لیکن اپنے شخصی دکھ درد سے قطعِ نظر حساس شاعر اُمت کی پریشاں حالیوں پر کرب محسوس کرتا تھا۔

عالمِ اسلام کے لیے یہ بڑا پُرآشوب زمانہ تھا۔ سلطنتِ عثمانیہ یوں تو انیسویں صدی ہی سے زوال پذیر تھی، لیکن بیسویں صدی میں وہ انحطاط کے اس درجے کو پہنچ چکی تھی کہ اُسے The sick man of Europe (یورپ کا مردِ بیمار) قرار دے کر یورپی طاقتیں اس کے حصے بخرے کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ ایک طرف اپنی اندرونی بغاوتوں اور دوسری طرف بلقانی ریاستوں کے حملوں سے ترک مسلسل پسپا ہو رہے تھے۔ اٹلی نے ۱۹۱۲ء میں طرابلس پر حملہ کر دیا۔ فرانس مغربِ اقصیٰ (تیونس، الجزائر اور مراکش) پر قابض ہو گیا۔ یونان نے سالونیکا پر تسلط جما لیا۔ مارچ ۱۹۱۳ء میں سقوطِ اَدَرنَہ کا حادثہ رونما ہوا۔ پروفیسر محمد اسلم لکھتے ہیں: ''جس زمانے میں ترکی ریاست ہائے بلقان سے نبرد آزما تھا، ان دنوں برِعظیم کے مسلمانوں میں بڑا جوش و خروش پایا جاتا تھا، ان کی تمام ہمدردیاں ترکوں کے ساتھ تھیں۔ برِعظیم کے مسلمان، برطانوی ہند میں رہتے

ہوئے عثمانی خلیفہ کی اطاعت کو مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔ عیدین اور جمعے کے خطبات میں اس کے لیے دعا کی جاتی تھی۔"[۸]

اس زمانے میں ترکوں کے لیے ملک بھر سے چندے جمع کیے گئے، خانہ نشین عورتوں نے اپنے زیورات تک امدادی فنڈ میں دے دیے۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی قیادت میں زخمی ترک فوجیوں کے علاج معالجے کے لیے ایک طبی وفد بھی ہندستان سے ترکی بھیجا گیا۔ اگرچہ ترک اپنی بقا کی جنگ ہندستان سے ہزاروں میل دور لڑ رہے تھے، لیکن ان کی آزمائشوں نے ہندستان کے مسلمانوں کو ایک بے مثال ملّی اور دینی غیرت مندی کے جذبے سے سرشار کر دیا تھا۔

کہا جا سکتا ہے کہ وکالت اقبال کی ذاتی، شخصی اور دنیاوی ضرورت تھی تو نظم گوئی امت کے لیے ان کی دل سوزی و دردمندی کا تقاضا تھا۔ ان کا دل ہمیشہ امتِ مسلمہ کے ساتھ دھڑکتا تھا، چنانچہ اس دور کی بیشتر نظموں میں وہ ہمیں ترجمانِ ملت نظر آتے ہیں۔ مسلمانوں کے احساسات و جذبات اور برِ عظیم کی ملی تحریکوں کی جیسی بھرپور ترجمانی اقبال نے کی، وہ انھی کا حصہ ہے۔ اس نے اقبال کو اپنے عہد کا سب سے مقبول شاعر بنا دیا تھا۔ جب طرابلس پر اٹلی کے حملے کی خبر ہندستان پہنچی، جس میں بہت سے مسلمان بھی جامِ شہادت نوش کر گئے تھے تو مسلمانوں کے جذبات میں زبردست ہل چل مچ گئی۔ اقبال نے بھی اس خبر سے گہرا اثر قبول کیا۔ نظم 'حضورِ رسالت مآب میں'[۹] اسی زمانے کی یادگار ہے:

گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامۂ زمانہ ہوا — جہاں سے باندھ کے رختِ سفر روانہ ہوا
قیودِ شام و سحر میں بسر تو کی لیکن — نظامِ کہنۂ عالم سے آشنا نہ ہوا
فرشتے بزمِ رسالتؐ میں لے گئے مجھ کو
حضورِ آیۂ رحمتؐ میں لے گئے مجھ کو

یعنی شاعر دنیا سے رخصت ہو کر، عالم خیال و تصور میں دربارِ رسالتؐ میں پہنچتا ہے تو آنحضورؐ پوچھتے ہیں:

نکل کے باغِ جہاں سے برنگِ بو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا؟

اقبال، جواباً عرض کرتے ہیں:

حضورؐ! دہر میں آسودگی نہیں ملتی — تلاش جس کی ہے، وہ زندگی نہیں ملتی

ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں　　وفا کی جس میں ہو بو، وہ کلی نہیں ملتی

یہ نظم انھوں نے شاہی مسجد لاہور میں منعقدہ ایک جلسے میں پڑھی تھی، اور لوگوں کو رُلا دیا تھا۔ اس موقعے اور منظر کی جو تصویر ایک چشم دید گواہ حکیم محمد یوسف حسن (مدیر: نیرنگِ خیال) نے پیش کی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس جلسے میں عام زندہ دلانِ لاہور کے علاوہ سر محمد شفیع، سر فضل حسین، میاں نظام الدین، مولوی محبوب عالم اور میاں عبدالعزیز جیسے مسلم راہ نما بھی موجود تھے۔ پہلے چند ریزولیشن پڑھے گئے۔ پھر علامہ اقبال سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنا کلام سنائیں۔ ہجوم میں پندرہ بیس ہزار مسلمان ہوں گے۔ جوش کا یہ عالم تھا کہ جذبات پر قابو رکھنا محال ہو رہا تھا۔ نظم پڑھنے سے پہلے سر محمد شفیع، میاں فضل حسین اور مولوی محبوب عالم ایڈیٹر روز نامہ پیسہ اخبار نے بڑی آتشیں تقریریں کیں، جن میں اٹلی کے خلاف غیظ و غضب کا اظہار کیا گیا تھا۔ جب علامہ نے نظم پڑھنی شروع کی تو مجمع پر ایک عجیب قسم کا سکوت طاری ہو گیا۔ اس وقت فرش پر ایک سوئی بھی گرتی تو آواز آتی۔ کلام کے علاوہ اقبال کی آواز میں ایک عجیب سوز تھا۔ حضرت علامہ نے مذکورہ نظم سنائی۔ علامہ نے جب پوری دل سوزی اور سرشاری سے یہ شعر پڑھا:

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

تو لوگوں کا تجسس بڑھا' سوال پیدا ہوا، بھلا وہ کیا چیز ہو گی' جو جنت میں بھی نہیں ملتی...... اس کے بعد علامہ نے یہ شعر پڑھا:

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

تو مجمع بے قابو ہو گیا۔ چیخ پکار' نالہ و بکا اور آہ و فغاں سے مسجد کی دیواریں لرزنے لگیں۔ اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے سے فضا گونجنے لگی۔ لوگ پاگلوں اور دیوانوں کی طرح کپڑے پھاڑنے لگے۔ کوٹ اتار کر پھینک دیے اور ٹوپیاں فضا میں اچھال دیں۔ زمین پر اس طرح لوٹنے اور تڑپنے لگے جیسے ان کو کسی نے ذبح کر ڈالا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں کسی موت کے سانحے پر یا کسی بھی موقع پر ایسا دل خراش منظر اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔[۱۰]

طرابلس کی لڑائی میں ایک تیرہ سالہ بچی فاطمہ غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہو گئی۔ نظم ''فاطمہ بنتِ عبداللہ''[۱۱] اسی شہادت کی یادگار ہے:

فاطمہ! تو آبروے امتِ مرحوم ہے ذرّہ ذرّہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت، حورِ صحرائی! تری قسمت میں تھی غازیانِ دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی
یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپَر ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر
......
یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یا رب اپنی خاکستر میں تھی

اسی طرح نظم ''محاصرۂ ادرنہ''[۱۲] بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے:

یورپ میں جس گھڑی حق و باطل کی چھڑ گئی
حق خنجر آزمائی پہ مجبور ہو گیا

اگرچہ اس زمانے میں ہندستان کے بعض دوسرے اکابر (مولانا شبلی نعمانی، محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خاں وغیرہ) بھی ترکوں کی حمایت اور سامراجی طاقتوں کے مظالم اور ان کی زیادتیوں کے خلاف برابر لکھ رہے تھے، لیکن اقبال نے جس انداز اور لب و لہجے میں مسلم عوامی جذبات کی ترجمانی کی، اسے سب سے زیادہ پذیرائی ملی۔ ان نظموں کی وجہ سے علامہ اقبال بقولِ عبدالمجید سالک: ''اسلامی ہند کی آنکھ کا تارا بن گئے۔''[۱۳]

۴

وکالت کی پیشہ وارانہ مصروفیات، تحریر و تصنیف اور شعر گوئی کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال اہلِ وطن کے اجتماعی مسائل پر غور و خوض اور بعض پیچیدہ معاملات کی گتھیاں سلجھانے میں بھی شریک رہتے تھے، مثلاً وہ یکم فروری ۱۹۱۲ء کو موچی دروازے کے باہر منعقدہ اس جلسے میں شریک ہوئے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کی طرف سے برطانوی حکومت اور شہنشاہِ انگلستان پر اظہارِ اعتماد اور جذبۂ خیر سگالی کے لیے منعقد ہوا تھا۔[۱۴] اس جلسے میں اقبال نے بھی تقریر کی، جس میں بظاہر تو انھوں نے سرکار کی برکات و فیوض کا ذکر کیا اور شہنشاہِ معظم کی تعریف بھی کی، لیکن بڑے حکیمانہ انداز میں مسلمانوں کو نصیحت کی کہ 'حاکموں سے مؤدبانہ حاجات طلب' کرنے سے پہلے 'اپنے خدا، اپنے رسولؐ، اپنے دین اور اپنے قوتِ بازو پر بھروسا' کریں۔ 'جو سیکھ سکتے ہیں، انھیں سکھائیں؛ جو سکھا سکتے ہیں، ان سے سیکھیں اور حتی الوسع ہمارا وہ نصب العین ہو، جو اگلے مسلمانوں کا تھا۔'[۱۵] اقبال کی یہ نصیحت اور تلقین ایک طرح سے درسِ خودی تھا، جو آگے چل کر اسرارِ خودی کی شکل میں تفصیل سے مرتب و منضبط ہو کر سامنے آیا۔

۱۸ فروری ۱۹۱۲ء کو انھوں نے حبیبیہ ہال، اسلامیہ کالج لاہور میں منعقدہ ایک جلسے کی صدارت کی۔ یہ جلسہ مسٹر گوکھلے کے مسودہ تعلیم لازمی کی حمایت میں منعقد ہوا تھا۔ علامہ اقبال نے بطور صدرِ جلسہ اپنی تقریر میں لازمی اور جبری تعلیم کے نفاذ کو مفید اور ضروری قرار دیا۔[۱۶]

اس زمانے میں اقبال انجمن حمایتِ اسلام لاہور کی مختلف کمیٹیوں کے رکن بھی تھے۔ اپنی تمام تر ذہنی پریشانیوں اور مصروفیات کے باوجود، وہ متعلقہ کمیٹیوں کے رکن کے طور پر اپنے فرائض بجالاتے رہے۔[۱۷]

حوالے اور حواشی

۱۔ ملفوظات، ص ۶۴

۲۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید: سر گذشتِ اقبال، ص ۱۲۳

۳۔ یہ مضمون *Speeches* میں شامل ہے۔

۴۔ اس مقالے کا متن اور اس کی دریافت کا پس منظر دیکھیے: تصانیفِ اقبال، ص ۴۹۰ و مابعد۔

۵۔ روایت ہے کہ اقبال نظم 'شکوہ' لکھ چکے تو انھیں اُس کا موزوں عنوان نہیں سوجھ رہا تھا۔ اپنے دوست میاں عبدالعزیز مالواڈہ کو نظم پڑھنے کے لیے دی اور پوچھا کہ اس کا کیا عنوان ہونا چاہیے۔ انھوں نے نظم پڑھ کر کہا: 'شکوہ'۔ اقبال خوش ہوئے اور نظم پر یہی عنوان لکھ دیا۔ (میاں عبد العزیز مالواڈہ۔ ص ۱۳۵)

۶۔ زندہ رود میں، بیرون موچی دروازہ منعقدہ جلسے میں 'جوابِ شکوہ' پڑھنے کا سنہ ۱۹۱۳ء بتایا گیا ہے۔ اُسی زمانے کے مطبوعہ 'جوابِ شکوہ' کے کتابچوں پر 'نومبر ۱۹۱۲ء' درج ہے۔ دیگر شواہد بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

۷۔ اقبال نامہ، ص ۳۷۲۔۳۷۳

۸۔ تحریکِ پاکستان، ص ۱۴۵

۹۔ بانگِ درا، ص ۱۹۷

۱۰۔ مجالسِ اقبال، ص ۶۱۔۶۲

۱۱۔ بانگِ درا، ص ۲۱۴

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۱۶

۱۳۔ ذکرِ اقبال، ص ۹۴

۱۴۔ گفتارِ اقبال، ص ۱-۲

۱۵۔ ایضاً، ص ۲-۳

۱۶۔ ایضاً، ص ۳

۱۷۔ اقبال اور انجمن حمایتِ اسلام، ص ۱۷۴۔۱۷۵

(۱۱)

اپنی اصلیت سے ہوآ گاہ......

علامہ اقبال اپنی شخصیت، مزاج اور افتادِ طبع کے لحاظ سے ایک شاعر تھے۔ قدرت نے انھیں شعر گوئی کا حیرت انگیز اور بے مثال ملکہ ودیعت کیا تھا۔ عظیم شاعر ایک اعتبار سے پیغام بر بھی ہوتا ہے۔ اقبال کا منصب بھی ایک پیغام بر کا تھا۔ اگر چہ وہ اپنے شاعر ہونے سے تو بار بار اور بتکرار انکار کرتے ہیں (جیسے کہہ رہے ہوں: ''کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے'')، مگر یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ''چند مطالب میرے ذہن میں ہیں، بلکہ مقاصد خاص'' ......اور وہ ''شاعرانہ نہیں، بلکہ مذہبی اور اخلاقی ہیں''، جن کا مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس......۔

۱

بہر حال 'خاص مقاصد' کی تکمیل کے لیے ہی سہی، وہ شعر گوئی پر مجبور ہوئے کہ یہ، ان کی فطرت اور طبیعت کا اقتضا بھی تھا۔ لہٰذا اس زمانے میں اپنی گوناگوں مصروفیات اور خلافِ طبع قانونی بحثوں اور موشگافیوں میں الجھے رہنے کے باوجود، انھوں نے خاصی بڑی تعداد میں بلند پایہ نظمیں کہیں۔ بحیثیت مجموعی ان نظموں کا مرکزی موضوع امتِ مسلمہ ہے۔ اسی تسلسل میں ۱۹۱۳ء میں انھوں نے مثنوی اسرارِ خودی لکھنی شروع کی، جو ڈیڑھ دو برس میں مکمل ہو کر ۱۹۱۵ء کے وسط میں منظرِ عام پر آئی۔

عطیہ بیگم کے نام ایک خط میں اقبال نے بتایا ہے کہ اسرار خودی کا محرک تحریر و تصنیف، والدِ محترم شیخ نور محمد کی تجویز و ہدایت تھی۔[۱] یہ ۱۹۱۱ء کا ذکر ہے، تاہم فقط والد محترم کی ہدایت ہی مثنوی کا محرک نہ تھی، سہ سالہ قیامِ یورپ، سلطنت عثمانیہ کا بکھرتا ہوا شیرازہ، ملتِ اسلامیہ کا عمومی زوال و انحطاط، اور ان سب کے نتیجے میں وہ ذہنی کرب و اضطراب، جو کسی حد تک 'شکوہ' اور 'شمع اور شاعر' جیسی نظموں اور اس زمانے کے خطوط (بطورِ خاص مکاتیب بنام اکبر الٰہ آبادی) میں ظاہر ہوا، اسرار خودی کا اصل محرک ہے۔[۲]

آغاز تحریر تو ۱۹۱۱ء میں ہو گیا مگر یہ فقط چند اشعار تھے، ڈیڑھ دو برس کے تعطل کے بعد اقبال ۱۹۱۳ء میں مثنوی کی طرف متوجہ ہوئے، جو اکتوبر یا نومبر ۱۹۱۴ء میں مکمل ہوئی۔

اس مثنوی میں اقبال نے تصورِ خودی کو پہلی بار مربوط انداز میں پیش کیا۔ دیباچے میں وضاحت کرتے ہوئے لکھا: 'خودی کا مفہوم احساسِ نفس یا تعینِ ذات ہے۔'[۳] مگر یہ تعینِ ذات کیا ہے؟ اقبال سمجھتے تھے کہ مسلمان اپنے مقصدِ تخلیق کو بھول چکا ہے۔ تعلیمِ خودی سے اسے یاد دلایا کہ اس کا مقصدِ تخلیق کیا ہے۔ اقبال کے نزدیک انسان، اس دنیا میں خدا کا نائب اور خلیفہ ہے، اپنی اس حیثیت کا وہ جس خوبی سے ادراک کرے گا، اسی قدر اس کی زندگی کامیاب ہوگی۔ ان کی متعدد ماقبل اردو نظموں میں بھی تصورِ خودی کی جھلکیاں موجود ہیں، جیسے 'شمع اور شاعر' (فروری ۱۹۱۲ء) کا دسواں بند:

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو

یا گیارھواں بند:

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ، اے غافل کہ تو
قطرہ ہے، لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے

یا 'خطاب بہ نوجوانانِ اسلام' (۱۹۱۱-۱۲ء)، جس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے؟
وہ کیا گردوں تھا، تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

اسی طرح نثر میں بھی اقبال نے کئی جگہ انفرادی خودی کی اصلاح اور نشوونما کی طرف متوجہ کیا ہے، مثلاً ۱۹۰۴ء کے مضمون ''قومی زندگی'' میں کہتے ہیں: ''دنیا کی کسی قوم کی اصلاح نہیں ہو سکتی، جب تک اس قوم کے افراد اپنی ذاتی اصلاح کی طرف توجہ نہ کریں''۔[۴] اسی طرح ۱۹۱۱ء کے خطبۂ علی گڑھ (ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر) میں بھی جذبۂ خودی کی پرورش و فروغ کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ اس ضمن میں مذکورہ خطبے کا وہ حصہ خاص طور پر قابلِ غور ہے جس میں وہ جماعتِ مسلمین کی ہیئتِ ترکیبی کے تیسرے جز ''اسلامی سیرت'' پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کی غایت 'ضبطِ نفس' ہے۔ یہ وہی نکتہ ہے جسے اقبال اسرارِ خودی میں تربیتِ خودی کا دوسرا مرحلہ قرار دیا ہے۔ اسی طرح ۱۹۱۴ء میں انجمن حمایتِ اسلام کے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اسلام چاہتا ہے کہ ہر انسان کی خودی قائم رہے، جو اس کے لیے مقدر ہے اور جس سے بڑا مقام انسانی تصور میں نہیں آسکتا۔'' علامہ اقبال کا مؤقف یہ ہے کہ خودی اور خود شناسی، خدا بینی اور خدا شناسی کا ذریعہ ہے۔ اسرارِ خودی میں اقبال نے خودی کے تین مراحل (اطاعتِ الٰہی، ضبطِ نفس، نیابتِ الٰہی) کی نشان دہی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مذکورہ مراحل طے کرنے کے بعد، بآسانی عرفانِ نفس حاصل ہوسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال نے مروجہ تصوف پر شدید تنقید کی اور اسی حوالے سے وحدت الوجود کو بھی زوالِ امت کا اہم سبب قرار دیا۔ اسی طرح انھوں نے حافظ شیرازی کی شاعری کی مذمت کی اور کہا کہ یہ شاعری انسان کے قوائے عمل کو معطل کر کے اسے زندگی کے برتر اور اعلیٰ مقاصد سے غافل کرتی ہے۔ اقبال اپنے قارئین کو خبردار کرتے ہیں:

ہوشیار از حافظِ صہبا گسار جامش از زہرِ اجل سرمایہ دار[۵]

اس مثنوی کے شائع ہوتے ہی بعض حلقوں کی طرف سے اقبال پر شدید تنقید شروع ہوگئی بلکہ مخالفت کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ بقول ڈاکٹر جاوید اقبال: 'وجودی تصوف کے حامی صوفیوں، روایتی سجادہ نشینوں، عہدِ تنزل کے شاعروں کے دل دادوں اور فرسودہ یونانی فلسفۂ اشراق کے پیروکاروں نے اسرارِ خودی کی شدید مخالفت کی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ مثنوی سے ان گروہوں کے عقائد، مشاغل یا مفادات پر زد پڑتی تھی۔ مخالفت میں خواجہ حسن نظامی اور ان کے بعض پیروکار پیش پیش تھے۔'[۶]

اقبال کے جن مداحوں نے اقبال کا دفاع کیا، ان میں مولانا ظفر علی خاں، عبدالرحمٰن بجنوری، عبداللہ عمادی اور مولوی سراج الدین پال ایڈووکیٹ شامل تھے۔ اسرارِ خودی کی مخالفت اور حمایت میں بہت سے مضامین شائع ہوئے۔ بعض شعرا نے جوابی مثنویاں اور نظمیں لکھیں۔ ان میں پیرزادہ مظفر الدین فضلی کی رازِ بے خودی زیادہ معروف ہے۔ اقبال کے بزرگ دوست اکبر الٰہ آبادی نے بھی (مثنوی کو پڑھے بغیر) اسے نشانۂ تنقید بنایا، چنانچہ اقبال کو اپنے مؤقف کی وضاحت کے سلسلے میں کئی مضامین لکھنے پڑے۔[۷] یہ بحث ۱۹۱۸ء تک چلتی رہی اور اس میں کچھ تلخی بھی آگئی۔ اس مرحلے پر اقبال کے بعض خیر خواہوں نے یہ بے کار بحث بند کرانے کے لیے کوشش کی۔ اکبر الٰہ آبادی ابتدا میں اسرارِ خودی کے ناقد تھے، لیکن اقبال کی وضاحت کے بعد انھیں اندازہ ہوا کہ مخالفینِ اقبال کا مؤقف کمزور ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس قلمی جنگ و جدل کے خاتمے کے لیے موثر کردار ادا کیا اور اس طرح یہ قلمی محاذ آرائی اختتام کو پہنچی۔[۸]

۲

اس عرصے میں اقبال کا تخلیقی سفر برابر جاری رہا۔ رموز بے خودی ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی۔ یہ ایک اعتبار سے اسرار خودی کا دوسرا حصہ یا اس کا تکملہ تھا۔ اقبال کے بقول: ملت اسلامیہ کا یہ فلسفہ اس سے پہلے کبھی اسلامی جماعت کے سامنے پیش نہیں کیا گیا تھا۔ اسرار خودی میں فرد کی خودی، انفرادیت اور تشخص پر اتنا زور دیا گیا تھا کہ بعض لوگوں کو ملت کا وجود گم ہوتا ہوا نظر آیا۔ اقبال نے وضاحت کی کہ 'بے خودی' دراصل 'خودی' ہی کا ایک پہلو ہے اور 'بے خودی' 'خودی' کی تکمیل و توسیع کا باعث بنتی ہے۔ اقبال کے ہاں بے خودی کا یہ تصور ما قبل کی متعدد نظموں (ترانۂ ملی، شکوہ، شمع اور شاعر، بزم انجم) میں بھی موجود ہے۔ 'شمع و شاعر' میں کہتے ہیں:

آبرو باقی تری ملّت کی جمعیت سے تھی
جب یہ جمعیت گئی، دنیا میں رسوا تو ہوا

فرد قائم ربط ملت سے ہے، تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

'بزم انجم' کا آخری شعر ہے:

ہیں جذبِ باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

اقبال نے ایک اور جگہ لکھا ہے: 'حقیقی اسلامی بے خودی، میرے نزدیک اپنے ذاتی اور شخصی میلانات و رجحانات و تخیلات کو چھوڑ کر، اللہ کے احکام کا پابند ہونا ہے'۔ اور یہ چند نکات پر عمل پیرا ہونے سے ممکن ہے۔ اس ضمن میں اقبال نے 'ارکانِ اساسی ملیہ اسلامیہ' کے تحت توحید اور رسالت کا ذکر کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ رسالتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نصب العین حریت و مساوات اور ہجرت و اخوت کے ذریعے ایک آفاقی نظام قائم کرنا تھا۔ اقبال نے ملی شعور کی بیداری اور اجتماعی شیرازہ بندی میں مطالعہ تاریخ کو ضروری قرار دیا۔ ان کے نزدیک:

ایں ترا از خویشتن آگہ کند
آشنائے کار و مردِ رہ کند

روح را سرمایۂ تاب است ایں
جسمِ ملت را چو اعصاب است ایں[۹]

(یہ تاریخ تمھیں اپنے آپ سے آگاہ کرتی ہے اور تجھے مردِ کار اور مردِ رہ بناتی ہے۔ملت کی روح کے لیے یہ سامانِ قوت ہے اور جسدِ ملت کے لیے اس کی حیثیت اعصاب کی ہے۔)

نوجوانانِ ملت کو، تاریخ اسلام کے ایوانوں میں جھانکنے کی دعوت دیتے ہوئے، وہ کہتے ہیں:

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبر بھی کیا تو نے؟
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

دراصل اقبال سمجھتے تھے کہ تاریخ، ہمیں اجتماعی زندگی کو بہتر صورت میں منظم و مرتب کرنے کی راہ سجھاتی ہے۔تاریخ سے علامہ اقبال کی دل چسپی کے ضمن میں یہاں یہ بتانا مناسب ہوگا کہ پنجاب یونی ورسٹی میں اسلامی تاریخ کا مضمون ۱۹۲۳ء سے بی اے کے نصاب میں شامل چلا آرہا تھا۔۱۹۳۲ء میں یونی ورسٹی کے انگریز پروفیسر بروس کی تجویز پر اسے بی اے پاس کورس سے خارج کر دیا گیا۔۱۱رجون ۱۹۳۲ء کو موچی دروازے میں منعقدہ احتجاجی جلسے میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے، علامہ اقبال نے اس امر پر اظہارِ افسوس کیا کہ ہمارے اداروں میں تاریخ اسلامی کی تدریس کا معقول انتظام نہیں ہے۔انھوں نے بتایا کہ جب مَیں اٹلی گیا تو مجھے ایک شخص پرنس کیتانی مِلا۔وہ اسلامی تاریخ کا دلدادہ تھا، اس نے اپنے شوق سے اسلامی تاریخ پر نہایت قابل ستائش علمی و تحقیقی کام کیا تھا۔تاریخ اسلام سے اپنی دل چسپی کی وجہ بتاتے ہوئے اس نے کہا: اسلامی تاریخ عورتوں کو مرد بناتی ہے۔[۱۰]

۳

اقبال کا ارادہ تو یہ تھا کہ 'حیاتِ مستقبلہ اسلامیہ' کے نام سے تیسرا حصہ بھی لکھا جائے، لیکن پھر ان کی سخن گوئی کا رُخ دوسری طرف مڑ گیا۔کسی مسلسل نظم یا مثنوی کے بجائے وہ چھوٹی بڑی اردو اور فارسی نظمیں لکھتے رہے۔اگرچہ متصل زمانے میں انھوں نے بعض معرکہ آرا اردو نظمیں بھی لکھیں، مگر ان کی طبیعت اردو سے زیادہ فارسی گوئی کی طرف مائل رہی۔ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اردو اشعار لکھنے سے دل برداشتہ ہوتا جاتا ہوں۔فارسی کی طرف زیادہ میلان ہوتا جاتا ہے۔اور وجہ یہ ہے کہ دل کا غبار اردو میں نکال نہیں سکتا۔''[۱۱] یہی وجہ ہے کہ رموزِ بیخودی (۱۹۱۸ء) کے چار پانچ برس بعد فارسی کا اتنا کلام جمع ہوگیا کہ ۱۹۲۳ء میں پیامِ مشرق کے نام سے فارسی

مجموعۂ کلام کی اشاعت عمل میں آئی۔ اس دور کے کلامِ اقبال کو سمجھنے کے لیے بیسویں صدی کے ربع اوّل کے حالات وواقعات پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

جنگِ عظیم اوّل (۱۹۱۴ء۔۱۹۱۸ء) کے دوران میں برطانیہ کو گوناگوں مشکلات کا سامنا تھا۔ حکومت چاہتی تھی کہ کم از کم جنگ کے خاتمے تک ہندستانی ان کے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہ کریں۔ اہلِ ہند کو مطمئن رکھنے کے لیے ۱۰راگست ۱۹۱۷ء کو وزیرِ ہند مسٹر مانٹیگو نے اعلان کیا کہ جنگ ختم ہونے پر ہم ہندستان میں مقامی باشندوں پر مشتمل حکومت قائم کر دیں گے جو انھی کے سامنے جواب دہ ہوگی۔ یہ اعلان بہت خوش آئند تھا، مگر جنگ کے خاتمے پر یہ وعدہ ایفا نہ ہوا۔ اس بدعہدی پر پورے ملک میں غم و غصے کی ایک لہر دوڑ گئی اور جگہ جگہ احتجاجی جلسے ہونے لگے۔ ابنائے وطن کے غم و غصے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہندی مسلمان خلافتِ عثمانیہ سے ایک جذباتی لگاؤ رکھتے تھے۔ ہندستان میں کہیں کہیں عثمانی خلیفہ کا نام بھی خطبے میں لیا جاتا تھا۔ اب اتحادی طاقتیں جنگ کے خاتمے پر، ترکی سے متعلق اپنے وعدوں سے منحرف ہو گئیں، بلکہ ترکی سے ان کا سلوک نہایت ذلت آمیز تھا۔ اس پر ہندستانیوں کا ناراض ہونا بے جا نہ تھا۔

برطانیہ کو اپنی استعماری پالیسیوں پر ہندستانیوں کے ردّعمل کا اندازہ تھا، اس لیے اس نے ''سونے کی اس چڑیا'' پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے رولٹ ایکٹ کے نام سے ایک کالا قانون نافذ کر دیا، جس کی رُو سے حکومت جسے چاہتی، گرفتار کر کے سزا دے سکتی تھی، کوئی داد و فریاد نہ تھی۔ مزید برآں ۱۳راپریل ۱۹۱۹ء کو جلیانوالہ باغ امرتسر کے احتجاجی جلسے میں جنرل ڈائر کے حکم پر فائرنگ کر کے چار سو سے زائد لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ پنجاب کے گورنر سر مائیکل اوڈوائر نے مزید عاقبت نااندیشی سے کام لیتے ہوئے پنجاب میں مارشل لا نافذ کر دیا۔ لوگوں کو دھمکانے کے لیے پنجاب میں جگہ جگہ پھانسیاں نصب کر دی گئیں۔ اوڈوائر کی دہشت کا یہ عالم تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم محمد اجمل خاں، محمد علی جوہر، شوکت علی اور گاندھی جی وغیرہ لاہور آئے تو کوئی شخص انھیں اپنے ہاں ٹھہرانے کے لیے تیار نہ تھا۔ میاں عبدالعزیز بار ایٹ لا نے بڑی جرأت سے کام لیتے ہوئے انھیں اپنے ہاں ٹھہرایا۔[۱۲]

۲۰رمئی ۱۹۱۹ء کو بمبئی کے ایک اجتماع میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے خلافت کمیٹی کی بنیاد رکھی۔[۱۳] ۲۳، ۲۴ردسمبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں منعقدہ اس کے دوسرے اجلاس میں ہندو راہنما گاندھی جی، موتی لال نہرو اور مدن موہن مالویہ وغیرہ نے بھی شرکت کی اور تحریکِ خلافت کے لیے غیر مشروط

تعاون پیش کیا۔[۱۴] مختلف شہروں میں اس کی شاخیں قائم ہوئیں۔ تحریک خلافت کے سلسلے میں زیادہ تر ہندو متأمل تھے، چنانچہ ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی کے ایما پر ترکِ موالات کی شق بھی تحریک میں شامل کر دی گئی، یعنی عدالتوں اور برطانوی ساختہ اشیا کا مقاطعہ (بائیکاٹ) کیا جائے اور عوام سرکاری تعلیمی اداروں اور ملازمتوں کو ترک کریں۔[۱۵] ان حالات میں بہت سے لوگ توقع رکھتے تھے کہ دوسرے نمایاں راہ نماؤں کے ساتھ ساتھ، اقبال بھی جلسوں، جلوسوں اور احتجاجی سرگرمیوں میں پیش پیش نظر آئیں گے، مگر اقبال اپنی شاعرانہ افتادِ طبع کے سبب، ہنگاموں سے نفور رہتے تھے۔ 'قطب از جا نمی جنبد' کا مزاج رکھنے والے شخص سے سیاسی میدان میں سرگرمِ عمل راہ نماؤں کی سی دوڑ دھوپ کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ یوں بھی ۱۹۱۴ء سے ان کی سماجی سرگرمیاں کم ہو گئی تھیں۔ اگرچہ اقبال بعض اوقات کسی تقریب میں شریک بھی ہو جاتے تھے، مگر بحیثیت مجموعی جنگِ عظیم اوّل (۱۹۱۴ء-۱۹۱۸ء) کا زمانہ بلکہ مابعد کا زمانہ بھی بقولِ جاوید اقبال: اقبال کی خانہ نشینی کا زمانہ تھا۔[۱۶] چنانچہ مولانا شوکت علی نے انھیں علی گڑھ بلایا تو جواباً لکھا کہ 'بھائی شوکت! اقبال عزلت نشین ہے اور اس طوفانِ بے تمیزی کے زمانے میں گھر کی چار دیواری کو کشتیِ نوح سمجھتا ہے۔'[۱۷]

اقبال کی عزلت نشینی کا ایک سبب یہ تھا کہ وہ اسرارِ خودی کی تصنیف و تکمیل کی طرف اپنی پوری توجہ مبذول کیے ہوئے تھے۔ عین اسی مصروفیت کے زمانے میں ۹ر نومبر ۱۹۱۴ء کو ان کی والدہ فوت ہو گئیں۔ اس حادثے نے قدرتی طور پر انھیں پریشان اور اداس کر دیا۔ کئی ماہ تک یہی کیفیت جاری رہی۔ مہاراجا کشن شاد کو لکھتے ہیں: اس حادثے نے میرے دل و دماغ میں ایک شدید تغیر پیدا کر دیا ہے۔ میرے لیے دنیا کے معاملات میں دلچسپی لینا اور دنیا میں [آگے] بڑھنے کی خواہش کرنا صرف مرحومہ کے دم سے وابستہ تھا۔ اب یہ حالت ہے کہ موت کا انتظار ہے۔[۱۸] نظم 'والدۂ مرحومہ کی یاد میں' (بانگِ درا، ص ۲۲۶) اسی سانحے پر لکھی گئی۔ اسرارِ خودی کی اشاعت (۱۲ر ستمبر ۱۹۱۵ء) کے بعد اُن کے خلاف قلمی ہنگامہ آرائی شروع ہو گئی اور جلد بعد وہ رموزِ بے خودی کی تحریر میں مصروف ہو گئے۔

۴

کئی سال بعد کی بات ہے' مولانا محمد علی جوہر ایک مرتبہ لاہور آئے اور اقبال سے اپنے بے تکلفانہ انداز میں کہنے لگے: 'ظالم! ہم تو تمھارے شعر پڑھ پڑھ کر جیل جاتے ہیں، لیکن تم دُھسّا اوڑھے، حقے کے کش لگاتے رہتے ہو۔' اقبال نے برجستہ جواب دیا: مَیں تو قوم کا قوال ہوں اور

قوال خود وجد و حال میں شامل نہیں ہوتا، ورنہ قوالی ہی ختم ہو جائے۔[19] یہ بات اقبال نے ازراہِ تفنن کہی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انھوں نے ہمیشہ ہی مسلمانوں کے دکھ درد کو شدت سے محسوس کیا اور وہ مسلمانوں کی اجتماعی تحریکوں سے کبھی لاتعلق نہیں رہے۔ جہاں جہاں مسلمانوں کے اجتماعی مفادات یا مسائل کے سلسلے میں ضرورت پیش آتی، لوگ انھیں مستعد پاتے۔ وہ بڑے خلوص اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ مسلم عوام کی راہ نمائی کرتے اور بطور ایک راہ نما، مشکلات و مصائب میں ان کی ڈھارس بندھاتے۔ اپنے بقول، پولیٹیکل جلسوں میں شریک نہیں ہوتے تھے، مگر خلافت اور ترکِ موالات، ان کے خیال میں مذہبی مسائل تھے،[20] اس لیے ایسے جلسوں میں شرکت کرتے تھے، مثلاً: ۵ر دسمبر ۱۹۱۹ء کو باغ بیرون موچی دروازہ منعقدہ ایک جلسے میں شریک تھے، اس کی صدارت میاں فضل حسین نے کی تھی۔ یہ جلسہ خلافت کے تحفظ اور بقا کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔ برطانیہ سے مطالبہ یہ تھا کہ خلافتِ عثمانیہ کو ختم نہ کیا جائے اور نہ ترکیہ کے حصے بخرے کیے جائیں۔ اقبال برطانیہ اور دوسری بڑی طاقتوں کے استعماری مزاج سے بخوبی واقف تھے اور انھیں، ان سے کسی خیر کی توقع نہ تھی، چنانچہ مذکورہ جلسے میں تقریر کرتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا: 'ہم کیوں کسی بندے کے سامنے شکایت کریں، ہمیں خدا کے سامنے شکایت کرنی چاہیے۔ خوشامد، منت اور مانگنے سے کبھی کچھ نہیں ملا۔ خدا کے سوا کسی کی اطاعت ہمارے لیے واجب نہیں۔[21]

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے، جائے
تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی

واضح رہے کہ علامہ اقبال تحریک خلافت اور ترکِ موالات کے جملہ نکات سے متفق نہ تھے۔ وسط ستمبر میں فیصلہ ہوا کہ ایک وفد برطانیہ بھیجا جائے گا، جو برطانیہ سے خلافت کو برقرار رکھنے کی درخواست کرے گا۔ مجوزہ وفد میں محمد علی جوہر کے علاوہ سید سلیمان ندوی بھی شامل تھے۔ اقبال نے خلافت کی اس 'گدائی' کو ناپسند کیا اور سید صاحب کو معارف میں اشاعت کے لیے وہ اشعار لکھ بھیجے، جو بانگِ درا (ص ۲۵۴) میں 'دریوزۂ خلافت' کے عنوان سے شامل ہیں۔[22] اقبال کے نزدیک خلافت کی گدائی قومی و ملی غیرت اور خودی و خودداری کے خلاف تھی، بہر حال وفد برطانیہ گیا اور ناکام لوٹا۔ گدائی سے کچھ نہ ملا۔

دسمبر ۱۹۱۹ء میں، امرتسر میں خلافت کانفرنس اور کانگریس کے جلسے ہوئے تو علی برادران کچھ عرصہ قبل ہی، بیتول جیل سے رہا ہو کر آئے تھے۔ وہ بھی خلافت کانفرنس کے میں شرکت کے لیے

امرتسر آئے، اِدھر سے علامہ اقبال بھی مرزا جلال الدین اور نواب ذوالفقار علی خاں کے ساتھ امرتسر پہنچ کر جلسے میں شریک ہوئے۔ اس موقع پر اقبال نے جلسے میں وہ اشعار پڑھے، جو 'اسیری' کے عنوان سے بانگِ درا (ص ۲۵۳) میں موجود ہیں۔ یہ ایک طرح سے جلیانوالہ باغ کے شہیدوں کو خراجِ تحسین تھا:

ہے اسیری اعتبار افزا 'جو فطرت ہو بلند
قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند

خلافت اور ترکِ موالات جذباتی تحریکیں تھیں اور انھوں نے مسلمانوں کے اندر ہلچل برپا کر دی تھی۔ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی تحریکِ خلافت میں پیش پیش تھے۔ اقبال بھی شروع میں ان تحریکوں سے متاثر ہوئے، کیونکہ اصولی طور پر انھیں مسلمانوں کے مطالبات سے پورا اتفاق تھا، لیکن جلد انھوں نے محسوس کیا کہ ہندو' مسلمانوں کو اپنا آلۂ کار بنا رہے ہیں، اس لیے وہ بڑی حد تک ان تحریکوں سے الگ ہو گئے۔

تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات کے سلسلے میں اقبال کے طرزِ عمل کا کچھ ذکر اوپر آچکا ہے، یہاں یہ بتانا کافی ہوگا کہ ترکِ موالات مہم کا پہلا ہدف علی گڑھ کالج بنا کیونکہ ترکِ موالات کے تحت سرکاری اور ایسے غیر سرکاری تعلیمی اداروں کا مقاطعہ بھی شامل تھا، جو سرکار سے گرانٹ لیتے تھے۔ اس مہم میں جو لیڈر پیش پیش تھے، ان میں علی برادران کے ساتھ گاندھی جی بھی شامل تھے۔ بہر حال کالج کا مقاطعہ کر کے' ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کا اعلان ہوا اور جن طلبہ و اساتذہ نے کالج سے علیحدگی اختیار کی' انھیں نئی قائم شدہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخل کر لیا گیا۔ گاندھی جی نے اقبال سے نوخیز جامعہ کی صدارت (وائس چانسلر شپ) قبول کرنے کی درخواست کی، مگر انھوں نے معذرت کر لی۔ اقبال کی دوربین نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ مقاطعہ، مسلمانوں کے حق میں نقصان دہ ہوگا۔ خیال رہے کہ گاندھی جی نے بنارس کی ہندو یونی ورسٹی کو مقاطعے کا ہدف نہیں بنایا اور جب کسی نے انھیں توجہ دلائی کہ ہندو یونی ورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ ترکِ موالات پر عمل پیرا نہیں ہیں تو گاندھی جی نے اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پنڈت مدن موہن مالویہ مقاطعے کے خلاف ہیں۔[۲۳] نتیجہ یہ کہ وہاں تعلیم و تدریس کا سلسلہ باقاعدگی سے جاری رہا۔

علی گڑھ سے بعض اساتذہ اور طلبہ کو اکھاڑنے کے بعد' ترکِ موالات کے حامیوں کا اگلا

ہدف پنجاب میں مسلمانوں کے لیے اعلیٰ تعلیم کا ایک بڑا مرکز اسلامیہ کالج لاہور تھا۔ یہ لوگ چاہتے تھے کہ مذکورہ کالج، پنجاب یونی ورسٹی سے اپنا الحاق ختم کر لے۔ اقبال اس زمانے میں انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے آنریری جنرل سیکرٹری تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یونی ورسٹی سے کالج کا الحاق ختم کرنا مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگا۔ اس لیے انھوں نے علمائے کرام سے متفقہ فیصلہ لینے کی تجویز پیش کی جس پر عمل درآمد، ظاہر ہے، ممکن نہ تھا۔ ان کی اس ترکیب سے مسلمانوں کو بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ ان کا یہ تعلیمی ادارہ تباہ اور تحلیل ہونے سے بچ گیا، اگرچہ بائی کاٹ پر عملدرآمد کے لیے کالج کے طلبہ نے بہت ہنگامہ آرائی کی، اور کچھ توڑ پھوڑ بھی کی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں:

''اقبال محسوس کرتے تھے کہ کانگریس کی اعانت سے مسلمانوں کے لیے جو نئے تعلیمی ادارے قائم ہوئے تھے، وہ بظاہر تو اسلامی تھے، لیکن درحقیقت مسلم قومیت کی بجائے قومیتِ متحدہ کے مبلغ و ترجمان تھے۔ اس کے علاوہ انھیں یقین تھا کہ اگر مسلم درس گاہیں عدم تعاون کی لپیٹ میں آ گئیں تو مسلمانوں کی تعلیمی حالت اور بھی ناگفتہ بہ ہو جائے گی۔''[۲۴]

اقبال کی بصیرت قابلِ داد ہے کیونکہ بعدازاں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا جو تشخص سامنے آیا، وہ کانگریس کی ہندستانی قوم پرستی پر مبنی تھا؛ دوسرے: ہندوؤں نے مقاطعے سے اپنا دامن بچائے رکھا اور یوں وہ تعلیم میں، مسلمانوں کے مقابلے میں اَور بھی برتر و فائق ہو گئے۔ تحریکِ ترکِ موالات کے ضمن میں بعض علما (ابوالکلام آزاد، عبدالباری فرنگی محلی وغیرہ) نے ہندستان کو دارالحرب قرار دیتے ہوئے یہاں سے ہجرت کر جانے کا فتویٰ دیا۔[۲۵] مگر ہجرت کے نتیجے میں مسلمانوں کو بے حد مصائب اور مالی و جانی تباہی و بربادی کا سامنا کرنا پڑا۔ تقریباً اٹھارہ ہزار مسلمانوں نے اپنی جایدادیں ہندوؤں کے ہاتھ اونے پونے بیچ کر افغانستان کی طرف ہجرت کی۔ بہت سے سفر کی صعوبتوں کا شکار ہو کر چل بسے؛ جو واپس آئے، وہ نانِ شبینہ کو محتاج ہو چکے تھے۔[۲۶] ۱۹۲۲ء میں چورا چوری کے پرتشدد واقعے پر گاندھی جی نے اچانک ترکِ موالات ختم کرنے کا اعلان کر دیا، خلافت کی تحریک بھی رفتہ رفتہ ماند پڑ گئی اور ۱۹۲۴ء میں خود اتاترک نے ترکی میں خلافت کی بساط لپیٹ دی۔ ان حالات نے اقبال کی سیاسی بصیرت پر مُہرِ تصدیق ثبت کر دی۔

حوالے اور حواشی

۱۔ ''ا'''/''ا''، از عطیہ بیگم، ص ۴۳

۲۔ تصانیفِ اقبال، ص ۷۷
۳۔ دیباچہ اسرار خودی، طبع اول، ۱۹۱۵ء
۴۔ مقالاتِ اقبال، ص ۹۰
۵۔ اسرارِ خودی، طبع اوّل، ص ۲۶
۶۔ زندہ رود، ص ۲۷۲
۷۔ مقالاتِ اقبال (مرتبین: عبدالواحد معینی۔ محمد عبداللہ قریشی) میں اس نوعیت کے چار پانچ مضامین شامل ہیں۔
۸۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: محمد عبداللہ قریشی کا مضمون 'معرکۂ اسرارِ خودی'، مشمولہ مجلّہ: اقبال، لاہور، اکتوبر ۱۹۵۳ء، اپریل ۱۹۵۴
۹۔ اسرار و رموز، ص ۱۴۷
۱۰۔ گفتارِ اقبال، ص ۱۵۳-۱۵۴
۱۱۔ مکاتیب بنام گرامی، ص ۹۹
۱۲۔ تلخیص از میاں عبدالعزیز مالواڈہ' ص ۸۶، ۹۲-۹۸
۱۳۔ تحریکِ پاکستان، ص ۲۰۱
۱۴۔ بحوالہ علامہ اقبال کی سیاسی زندگی، ص ۱۰
۱۵۔ ایضاً، ص ۱۰-۱۱
۱۶۔ زندہ رود، ص ۳۰۱
۱۷۔ اقبال نامہ، ص ۲۲۵-۲۲۶
۱۸۔ اقبال بنام شاد، ص ۱۰۹
۱۹۔ آثار اقبال، ص ۲۸
۲۰۔ ایضاً، ص ۲۵۵
۲۱۔ انوارِ اقبال، ص ۱۴۴
۲۲۔ اقبال نامہ، ص ۱۳۲، سید سلیمان ندوی کو ارسال کردہ قطعے کا پہلا شعر تھا:

بہت آزمایا ہے غیروں کو تو نے — مگر آج ہے وقتِ خویش آزمائی

جب کہ بانگِ درا (ص ۲۵۴) میں اس قطعے کا پہلا شعر یہ ہے:

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے — تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی

اقبال نے سید سلیمان ندوی کو لکھا تھا کہ ''عنوان، ان اشعار کا آپ خود تجویز کر لیں......'' معارف (اکتوبر ۱۹۱۹ء) نے یہ اشعار ''پولیٹیکل گدائی'' کے زیرِ عنوان شائع کیے۔
۲۳۔ علامہ اقبال کی سیاسی زندگی، ص ۱۲۵
۲۴۔ زندہ رُود، ص ۳۱۴
۲۵۔ تبرکاتِ آزاد بحوالہ حصولِ پاکستان، ص ۱۲۴
۲۶۔ تحریکِ پاکستان، ص ۲۱۱

(۱۲)

اقبال سرا قبال شد......

۱

اقبال نے ۸ رجون ۱۹۱۷ء کو اپنے کشمیری دوست محمد دین فوق کو ایک خط میں لکھا: ''افسوس ہے کہ مَیں نے آج تک کشمیر کی سیر نہیں کی۔''[۱]

اس جملے سے، اقبال کی اس حسرت بھری آرزو کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، جو کشمیر کی زیارت و سیاحت کے لیے وہ اپنے دل میں رکھتے تھے۔ ان کی اس دیرینہ آرزو کی تکمیل کی صورت، چار برس بعد پیدا ہو سکی۔

جون ۱۹۲۱ء میں ان کے دوست منشی سراج الدین نے بعض قانونی نکات پر مشاورت (یا ایک دوسری روایت کے مطابق کسی مقدمے کی پیروی) کے لیے انھیں سری نگر مدعو کیا۔[۲] اس سفر میں اقبال کے ایک قریبی دوست مولوی احمد دین وکیل ان کے رفیقِ سفر تھے۔ وہ اپنے دفتری معاون منشی طاہر الدین کو بھی ساتھ لے گئے تھے۔ تقریباً دو ہفتے تک سری نگر میں رہے اور اس دوران میں ان کا قیام غالباً کسی ہاؤس بوٹ میں رہا۔[۳] یہاں انھوں نے منشی سراج الدین کے مقدمے کی پیروی کی، مگر اس کا فیصلہ حسبِ منشا نہ ہو سکا۔[۴] فاضل وقت سیر و تفریح میں گزرا۔

جاوید اقبال لکھتے ہیں: 'قانونی کاموں سے فراغت کے بعد، اقبال شکارے میں بیٹھ کر ڈل کی سیر کو جاتے اور احباب کے ہمراہ نشاط باغ اور شالامار باغ میں دن گزارتے'۔[۵] ایک روز شام کو سیر سے واپس آ رہے تھے، غروبِ آفتاب کا وقت تھا، شفق پھول رہی تھی اور اس کا عکس جھیل جھیل کے شفاف پانی میں جھلملا رہا تھا۔ خوب صورت اور دل کش منظر نے اقبال کو مسحور کر دیا۔ ان کا تاثر، بے اختیار حسبِ ذیل دو شعروں میں ڈھل گیا:

تماشائے ڈل کن کہ ہنگامِ شام ۔۔۔ دہد شعلہ را آشیاں زیرِ آب
بشوید ز تن تا غبارِ سفر ۔۔۔ زند غوطہ در آبِ ڈل آفتاب[۶]

لیکن سفرِ کشمیر کی یادگار نظم 'ساقی نامہ' (مشمولہ پیامِ مشرق) ہے، جو نشاط باغ میں لکھی گئی۔ ساقی ناموں کی روایت کے مطابق، نظم کے ابتدائی حصّے میں موسمِ بہار، اور اس کی مناسبت سے رنگارنگ پھولوں، گیت گاتے پرندوں کی دل کش صداؤں، سبزے کے تختوں، ندی نالوں، آبشاروں اور دامنِ کوہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ کشمیر جنت نظیر کے بارے میں اقبال کہتے ہیں:

تو گوئی کہ یزداں بہشت بریں را ——— نہاد است در دامن کوہسارے

(تم کہو گے کہ باری تعالیٰ نے جنت الفردوس کو (آسمانوں سے اتار کر) زمین پر اُسے دامنِ کوہ میں لا بسایا ہے۔)

یہاں قدرتی طور پر ذہن غنی کاشمیری کے معروف شعر کی طرف منتقل ہوتا ہے:

اگر فردوس بر رُوے زمیں است ——— ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

یہاں اقبال شکوہ کرتے ہیں (اور شاید وہ قدرت کی اس ستم ظریفی کی طرف توجہ بھی دلا رہے ہیں) کہ اس خوب صورت سرزمین کے باشندے سرمایہ داروں کے استحصال کا شکار ہیں:

بریشم قبا خواجہ از محنتِ او ——— نصیب تنش جامۂ تار تارے

(اس محنت کش کی محنت سے تیار ہونے والی ریشم کی قبا، سرمایہ دار زیب تن کرتا ہے، لیکن خود محنت کش کا لباس تار تار ہے۔)

اس کے بعد اقبال نے شکوہ کیا ہے کہ کشمیری باشندے غلامی کے خوگر ہو چکے ہیں، وہ خودی سے نا آشنا ہیں اور ان کے ضمیر بلند خیالات سے عاری ہیں۔ اقبال باری تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ وہ کشمیریوں کے دلوں میں جذبۂ آزادی کی شمع فروزاں کر دے۔

۲

۱۹۲۲ء میں 'مسجدِ شب بھر' کی تعمیر کا دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ شاہ عالمی دروازے کے باہر ڈیڑھ مرلہ سرکاری جگہ خالی پڑی تھی۔ ہندو اس جگہ مندر اور مسلمان مسجد بنانا چاہتے تھے۔ (بعض روایات میں ہے کہ ہندوؤں نے وہاں ایک مندر بنا لیا تھا، قریب میں مسجد کوئی نہ تھی اور یہ بات مسلمانوں کو کھٹکتی تھی۔) میاں عبدالعزیز مالواڈہ کے مشورے اور تائید سے مسلمانوں نے رات بھر میں کام کر کے وہاں مسجد تعمیر کر لی اور نمازِ فجر اسی 'مسجد شب بھر' میں با جماعت ادا کی گئی۔ ہندو اس پر چیں بجبیں تو بہت ہوئے، مگر کچھ نہ کر سکے۔ بانگ درا کے آخری قطعے کا یہ شعر اسی واقعے سے متعلق ہے:

مسجد تو بنادی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے، برسوں میں نمازی بن نہ سکا

مسجدِ شب بھر کی یہ ہنگامی تعمیر عارضی تھی۔ بعدازاں اُس عارضی تعمیر کو گرا کر نئی پختہ مسجد بنائی گئی تھی، جو اَب بھی قائم اور آباد ہے۔[۷]

۳

۲۴ رمئی ۱۹۲۲ء کو اقبال نے مولانا گرامی کو خط میں لکھا: مَیں امتحانوں کے پرچوں میں سخت مصروف رہا، اس واسطے جواب نہ لکھ سکا۔ یہ کام ابھی تک جاری ہے اور غالباً پندرہ بیس روز اَور جاری رہے گا۔ اَوروں کی نسبت میرے پاس کام بھی زیادہ ہوتا ہے، کیونکہ دیگر یونی ورسٹیوں کے پرچے بھی ہوتے ہیں۔[۸]

اقبال عملی زندگی کے ابتدائی برسوں میں تعلیم و تعلم سے وابستہ رہے، پھر وکالت کا پیشہ اپنالیا، مگر تعلیم سے ان کا تعلق برابر قائم رہا۔ وہ پنجاب یونی ورسٹی کی مختلف علمی اور تعلیمی انجمنوں کے رکن اور اورینٹل فیکلٹی کے ڈین رہے۔ مڈل، انٹرمیڈیٹ، بی اے اور ایم اے کے مختلف مضامین (اردو، فارسی، فلسفہ، قانون) کے پرچوں کے مرتب اور ممتحن کے فرائض بھی انجام دیے۔ اس زمانے میں ایم اے کا پرچہ جانچنے کا معاوضہ دو روپے تھا۔[۹]

پنجاب یونی ورسٹی کے علاوہ، دیگر یونی ورسٹیاں بھی، ان سے یہی خدمت لیتی تھیں۔ یہ مصروفیت اس اعتبار سے مفید تھی کہ اس طرح کچھ مالی یافت ہو جاتی تھی، جس سے وہ اپنی کفالتی ذمہ داریاں ادا کرنے میں سہولت محسوس کرتے۔ علامہ اقبال، نہایت توجہ اور محنت سے پرچے جانچتے اور کسی سفارش کو خاطر میں نہ لاتے۔ اگر کبھی کوئی شخصی رعایت کرنے کے لیے کہتا تو اسے ڈانٹ دیتے اور اس سے ناراض ہو جاتے۔[۱۰]

۴

۱۹۲۲ء کے آخر میں وہ انارکلی سے میکلوڈ روڈ (موجودہ نمبر ۱۱۶) پر واقع ایک بیوہ کی پرانی خستہ حال کوٹھی میں منتقل ہو گئے۔ اس کا کرایہ ایک سو ستر روپے ماہوار تھا۔[۱۱] مکان کی منتقلی میں، گھریلو ساز و سامان کی دیگر چیزوں کے ساتھ کبوتر اور ان کے متعلقات بھی شامل تھے۔[۱۲]

یہ...... کبوتروں کا شوق...... حیاتِ اقبال کا ایک نہایت دل چسپ پہلو ہے۔ ڈاکٹر شیخ محمد

اقبال بیرسٹرایٹ لا اوائل عمر ہی سے کبوتروں کے نہایت شائق اور دل دادہ تھے۔

مولوی میر حسن کے ابتدائی زمانۂ تلمذ میں دونوں استادزادوں کے ساتھ ان کی گہری دوستی تھی اور اس دوستی کا ایک نکتۂ اشتراک کبوتر داری بھی تھا۔ اُسی زمانے میں وہ اپنے محلے کے کچھ اور لڑکوں سے بھی کبوتروں کے حوالے سے دوستی رکھتے تھے۔ ان کے بچپن کے ایک دوست لالو پہلوان کا بیان ہے کہ کبوتروں کا مشترکہ شوق مجھے اور اقبال کو ایک دوسرے کے قریب لے آیا اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہم ایک پل بھی ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ لالو پہلوان کہتے ہیں: ''کبوتر کی تیز آواز اور اُڑان اقبال کی نگاہوں میں ایک عجیب سی چمک اور تڑپ پیدا کر دیتی تھی، اور ہمیں ایسا محسوس ہوا کرتا تھا کہ وہ خود کبوتروں کے ساتھ فضا میں پرواز کرنے کے لیے پر تول رہا ہے۔''[۱۳]

لالو پہلوان کے علاوہ سیالکوٹ میں، احموں کشمیری بھی اقبال کا دوست تھا۔ اس نے اعلیٰ نسل کے کبوتر پال رکھے تھے۔ اقبال، جب کبھی سیالکوٹ جاتے تو احموں ان سے ملنے آتا۔ شیخ اعجاز احمد کا بیان ہے کہ وہ دونوں سارا وقت کبوتروں کے متعلق گفتگو کرتے رہتے تھے۔[۱۴]

قیامِ یورپ کے دوران میں تو ظاہر ہے کہ اقبال کا یہ شوق معطل رہا، لیکن واپسی پر جب وہ وکیل کی حیثیت سے لاہور میں مقیم ہوئے تو کبوتر رکھنے کا شوق پھر عود کر آیا۔ عبدالمجید سالک راوی ہیں: ۱۹۱۷ء میں علامہ اقبال نے مدینہ منورہ کا ایک کبوتر کہیں سے حاصل کر کے پالا تھا اور اس کے دانے دُنکے کی فکر بہ نفسِ نفیس کیا کرتے تھے۔ نومبر کی ۲۰ تاریخ کو وہ کبوتر ایک بلی کی چیرہ دستی کا شکار ہو گیا، اس واقعے سے اقبال بہت متأثر ہوئے اور ایک نظم لکھی، پہلا شعر تھا:

رحمت تیری جان پہ اے مرغِ نامہ بر　　　آیا تھا اُڑ کے ذروۂ بامِ حرم سے تو[۱۵]

اقبال کے ایک قریبی دوست خان نیاز الدین خاں کو بھی کبوتروں کا شوق تھا، چنانچہ ان کے نام اقبال کے خطوں میں جگہ جگہ کبوتروں کا ذکر ملتا ہے۔ نیاز الدین خاں، اقبال کو اعلیٰ نسل کے کبوتر باقاعدگی سے بھیجا کرتے تھے۔ اقبال کبوتروں کی اقسام اور ان کی خصوصیات کا خاصا درک رکھتے تھے۔ اپنی منشا کے مطابق کبوتروں پر پکے رنگ چڑھانے کے تجربے بھی کیا کرتے۔[۱۶] بعض دوسرے شہروں مثلاً: لدھیانہ، ملتان، سیالکوٹ، گجرات اور شاہ جہان پور سے بھی کبوتر منگاتے رہتے تھے۔[۱۷] نیاز الدین خاں کے نام خطوں میں، کبوتروں کے حوالے سے، اقبال کبھی کبھی شگفتہ طبعی کا مظاہرہ بھی کیا کرتے، مثلاً ایک خط میں مغربی تہذیب پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں: کبوتر

بہت اچھے ہیں، مگر افسوس کہ زمانہ حال کی مغربی تہذیب سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ کہ بچوں کی پرورش سے بیزار ہیں۔[۱۸] جاوید اقبال کی ولادت (۵/اکتوبر ۱۹۲۴ء) کے بعد انھوں نے اپنے سارے کبوتر، دوستوں میں بانٹ دیے۔ جاوید اقبال کہتے ہیں کہ انھوں نے: ''کبوتر بازی کے شغل کو اس لیے ترک کر دیا کہ کہیں راقم بھی بڑا ہو کر، ان کی دیکھا دیکھی کبوتر اڑانے کی عادت نہ ڈال لے۔''[۱۹]

کبوتروں سے اقبال کی دل چسپی روایتی اور شوقین مزاج کبوتر بازوں سے مختلف نوعیت کی تھی۔ کبوتر داری کا شوق ختم کرنے کے بعد بھی، اندازہ ہوتا ہے کہ کبوتروں سے ان کا ایک غیر مرئی تعلق قائم رہا۔ جاوید اقبال لکھتے ہیں: ''آخر عمر میں ان کی خواہش تھی کہ گھر کی چھت پر ایک وسیع پنجرا بنوایا جائے، جس میں لاتعداد کبوتر چھوڑ دیے جائیں اور ان کی چارپائی ہر وقت کبوتروں کے درمیان رہے۔ انھیں یقین تھا کہ کبوتروں کے پروں کی ہوا صحت کے لیے مفید ہوتی ہے۔''[۲۰]

انارکلی والے بالاخانے کی نسبت میکلوڈ روڈ کی کوٹھی بڑی اور کشادہ تھی، کمروں کی تعداد بھی خاصی تھی۔ اب مسئلہ تھا کہ گھر کے لیے کچھ فرنیچر مہیا کیا جائے۔ اقبال کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد کا بیان ہے کہ ایک قالین فروش آیا اور اُس نے غالباً اٹلی کے بنے ہوئے قالین اقبال کے ہاتھ فروخت کیے۔ اقبال کو اس طرح کی خریداری کا کوئی تجربہ نہ تھا، نہ قالینوں کی پہچان تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ گھٹیا قالین اچھے خاصے مہنگے داموں، اقبال کو دے گیا تھا۔[۲۱]

بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ اقبال دنیاوی سوجھ بوجھ زیادہ نہیں رکھتے تھے۔ انارکلی میں قیام کے زمانے میں اُن کے پاس ایک گگ (گھوڑا گاڑی) تھی۔ میکلوڈ روڈ آئے تو ایک دو سال بعد انھوں نے ایک موٹر گاڑی خریدی، مگر یہ موٹر بھی پرانی تھی اور بالکل کھٹارا قسم کی تھی، جو اکثر قابلِ مرمت رہتی تھی۔[۲۲]

۵

اسی زمانے کا ایک قابلِ ذکر واقعہ یہ ہے کہ یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو حکومت نے اقبال کو 'سر' کا خطاب دیا۔ روایت ہے کہ گورنر پنجاب سر ایڈورڈ میکلیگن نے اقبال کو لندن ٹائمز سے وابستہ ایک انگریز صحافی سے ملوانے کے لیے گورنر ہاؤس میں مدعو کیا۔ مذکورہ صحافی اسرارِ خودی کا انگریزی ترجمہ پڑھ چکا تھا۔[۲۳] مزید برآں، مشرقِ وسطیٰ کے بعض ممالک کی سیاحت کے دوران، اس نے اقبال کی علمی اور شاعرانہ حیثیت کا شہرہ بھی سنا تھا۔[۲۴] اس حوالے سے اقبال سے ملاقات

کا خواہش مند تھا۔ اقبال گورنر ہاؤس پہنچے، صحافی سے خاصی دیر تک ملاقات رہی۔ جب واپس آنے لگے تو گورنر نے انھیں روک لیا اور کہا: آپ کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں آپ کو 'سر' (نائٹ ہڈ) کا خطاب دینے کی تجویز ہے۔ آپ کو اعتراض تو نہ ہوگا؟

اقبال کو رضا مندی ظاہر کرنے میں قدرے تامل تھا، تاہم صریح انکار ان کی افتادِ طبع کے خلاف تھا، چنانچہ "کچھ پس و پیش کے بعد رضا مند ہو گئے"۔[۲۵]

گورنر نے شمس العلماء کے خطاب کے لیے کسی مناسب عالم کا نام پوچھا تو اقبال نے کہا کہ مَیں ایک نام پیش کرتا ہوں، بشرطیکہ اس کے ساتھ کسی دوسرے نام کی سفارش نہ کی جائے۔ گورنر نے اس شرط سے اتفاق کیا تو انھوں نے اپنے استاد مولوی میر حسن کا نام تجویز کیا۔ گورنر کے لیے یہ بالکل اجنبی نام تھا۔ پوچھا: ان کی تصانیف کتنی ہیں؟

اقبال نے کہا: انھوں نے کوئی کتاب نہیں لکھی، البتہ ایک زندہ تصنیف آپ کے سامنے ہے۔ بتایا کہ وہ میرے استاد ہیں۔ اقبال نے یہ بھی کہا کہ سند خطاب کے لیے مولانا میر حسن کو یہاں حاضر ہونے کی زحمت نہ دی جائے، کیونکہ وہ ضعیف العمر ہیں، چنانچہ شمس العلماء کی سند ان کے بیٹے ڈاکٹر علی نقی شاہ نے وصول کی، جو حسن اتفاق سے، اُن دنوں گورنر ہاؤس میں بطور میڈیکل افسر خدمات انجام دے رہے تھے۔[۲۶]

اقبال کو 'سر' کا خطاب کیا ملا، مخالفین کو ان کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک عمدہ ہتھیار مل گیا۔ اگرچہ چوراچوری کے واقعے کے بعد ۱۴ فروری ۱۹۲۲ء کو گاندھی جی نے ترکِ موالات ختم کرنے کا اعلان کر دیا تھا، تاہم تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات کی وجہ سے ملک کی فضا انگریزوں کے خلاف ابھی تک مکدّر تھی، بلکہ ترکِ موالات میں تو انگریزی خطابات واپس کرنے کا نکتہ شامل تھا۔ (کجا یہ کہ کوئی شخص خطاب قبول کرے) جب اقبال نے 'سر' کا خطاب قبول کیا تو بعض کم فہم لوگوں نے انھیں انگریز پرست سمجھنا شروع کر دیا۔ عبدالمجید سالک ویسے تو اقبال کے نیاز مندوں میں شامل تھے، مگر اس موقعے پر انھوں نے بھی ایک ہجویہ اور طنزیہ نظم لکھ کر اقبال کے خلاف طنز و تعریض کے تیر برسائے۔[۲۷] نظم کے دو شعر حسبِ ذیل ہیں:

کہتا تھا کل ٹھنڈی سڑک پر کوئی گستاخ	سرکار کی دہلیز پہ سر ہو گئے اقبال
سر ہو گیا ترکوں کی شجاعت سے سمرنا	سرکار کی تدبیر سے سر ہو گئے اقبال

سالک صاحب نے اپنے فکاہیہ کالم 'افکار و حوادث' میں بھی دو مرتبہ اس موضوع پر اظہار

خیال کیا۔[۲۸] اقبال کے بعض قریبی دوستوں کو بھی کسی قدر تشویش ہوئی، چنانچہ اقبال کو وضاحت کرنی پڑی۔ میر غلام بھیک نیرنگ کا خط آیا تو ۴ر جنوری ۱۹۲۳ء کو انھیں لکھا: ''دنیا کی کوئی قوت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ ان شاء اللہ۔ اقبال کی زندگی مومنانہ نہیں، لیکن اس کا دل مومن ہے۔''[۲۹] مولانا عبدالماجد دریا بادی نے اس موضوع پر کچھ لکھا تو اقبال نے ۶ر جنوری کو جواباً عرض کیا: ''یہ بات دنیا کو عنقریب معلوم ہو جائے گی کہ اقبال کلمۂ حق کہنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ ہاں، کھلی کھلی جنگ اس کی فطرت کے خلاف ہے۔''[۳۰] اقبال کے بے تکلف دوست مولانا غلام قادر گرامی نے مخالفین کی باتوں کو 'بے معنی شور' قرار دیا اور کہا کہ 'اس شور سے بوے حسد آرہی ہے'۔ گرامی نے اس موضوع پر ایک فارسی رباعی بھی کہی،[۳۱] جس کا دوسرا شعر ہے:

اقبال سر اقبال شد از جوہرِ علم ‏ ‏ ‏ ‏ حاسد عوعو کند علاجش سنگ است

ایک ہندو اخبار روزنامہ بندے ماترم نے بھی اقبال پر تنقید کی کہ انھوں نے یہ سرکاری خطاب کیوں قبول کیا۔[۳۲]

سر کا خطاب، اس زمانے میں ایک طرح کا اعزاز سمجھا جاتا تھا، چنانچہ معززینِ لاہور نے ۱۷ر جنوری کو ۴ بجے شام مقبرۂ جہانگیر میں ایک استقبالیہ تقریب کا اہتمام کیا، جس میں گورنر پنجاب اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے سرکاری اور غیر سرکاری ملازمین، ہندو اور مسلم عمائد، حکام اور اقبال کے مداحین شامل ہوئے۔ اس موقع پر اقبال نے انگریزی میں تقریر کی، جس میں انکشاف کیا کہ وہ جرمن مفکر اور شاعر گوئٹے کے دیوانِ مغربی کے جواب میں عنقریب فارسی نظموں کا مجموعہ پیامِ مشرق کے نام سے شائع کر رہے ہیں۔[۳۳]

علامہ اقبال نے 'سر' کا خطاب قبول کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی، کیونکہ یہ کوئی انوکھا یا نیا واقعہ نہ تھا۔ اقبال کے متعدد احباب اور بعض عمائد (جن میں ہندو، مسلمان اور سکھ بھی شامل تھے) اقبال سے قبل، یہ خطاب قبول کر چکے تھے۔ یہ درست ہے کہ بعض اوقات حکومتیں کچھ لوگوں کو رام کرنے اور ان کا منہ بند کرنے کے لیے بھی خطاب دیتی ہیں، لیکن بسا اوقات خطابات علمی، ادبی، سماجی، سائنسی اور تحقیقی نوعیت کی خدمات کی بنا پر دیے جاتے ہیں۔ اس زمانے میں فضا انگریزی حکومت کے خلاف بہت مکدر تھی اور حکومت سے کسی طرح کی قربت یا وابستگی کو پسند نہیں کیا جاتا تھا، اور اسی وجہ سے اقبال پر تنقید بھی کی گئی، لیکن اقبال مرنجاں مرنج طبیعت کے مالک تھے اور ہمیشہ محاذ آرائی سے بچتے۔ انھیں گوارا نہ تھا کہ کسی کی دل شکنی ہو۔ کہا جاتا ہے خطاب کی پیش کش

پر پہلے تو اقبال نے انکار کر دیا اور کہا: 'مَیں خطابات و اعزازات کے بکھیڑے میں نہیں پڑنا چاہتا۔' عبدالمجید سالک لکھتے ہیں کہ اس انکار سے گورنر کی طبیعت مکدّر سی ہو گئی۔ اس پر علامہ نے کہا کہ اگر آپ کو اصرار ہے تو خیر، یوں ہی سہی۔ اب گورنر کے چہرے پر شگفتگی کے آثار نمایاں ہو گئے۔[۳۴] اپنے اسی رویے اور افتادِ طبع کے سبب انھوں نے مولانا دریابادی کو لکھا تھا کہ کھلی کھلی جنگ میری فطرت کے خلاف ہے۔[۳۵]

اگر ہم ہندوستان کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ بعض ایسے لوگوں نے بھی انگریزی خطابات قبول کیے، جو انگریزوں کے زبردست ناقد رہے (جیسے: شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی)، خود اقبال نے بھی سر کا خطاب ملنے سے قبل اور اس کے بعد بھی انگریزی حکومت، برطانوی استعمار، تہذیبِ مغرب، سرمایہ داری اور سامراجیت پر بڑی بے باکی اور بڑے تواتر کے ساتھ تنقید کی۔ نظم ''خضرِ راہ'' اپریل ۱۹۲۲ء میں (خطاب سے قبل) انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں پڑھی گئی، جس میں 'سلطنت' کے زیرِ عنوان مغرب، مغربی تہذیب و تمدن اور اس کے اداروں پر شدید تنقید موجود ہے:

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام　　جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب　　تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاحات و رعایات و حقوق　　طبِ مغرب میں مزے میٹھے، اثر خواب آوری
گرمیِ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں　　یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری

اور 'سرمایہ و محنت' کے زیرِ عنوان 'سرمایہ دارِ حیلہ گر' کے بارے میں یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
ساحرِ الموط نے تجھ کو دیا برگِ حشیش
اور تو اے بے خبر! سمجھا اسے شاخِ نبات
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
'خواجگی' نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

سر کا خطاب، علامہ اقبال کو یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو ملا۔ ۳۰ / مارچ کو انھوں نے انجمن حمایتِ

اسلام کے سالانہ جلسے میں نظم 'طلوعِ اسلام' پڑھی، جس میں سرمایہ داری، تہذیبِ حاضر اور مغربی (=برطانوی) استعمار پر شدید تنقید کی گئی تھی:

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہر یاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت، ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

ظاہر ہے یہ اشعار اقبال نے حکومتِ وقت کو خوش کرنے کے لیے نہیں کہے تھے۔ ایسے ہی 'باغیانہ خیالات' کی بنا پر حکومت کے حسبِ ہدایت اقبال کی شاعری کے حوالے سے خفیہ رپورٹیں تیار کی جاتی تھیں۔ 'تصویرِ درد' اور 'شمع اور شاعر' کے انگریزی تراجم کرائے گئے، تاکہ اردو سے نابلد انگریز حکام، اقبال کے خیالات سے آگاہ ہو سکیں۔[۳۶] بہرحال ہم سمجھتے ہیں کہ سر کا خطاب قبول کرنے میں برطانوی استعمار کی تائید کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔[۳۷]

اِسی سال ۲۲ر اکتوبر ۱۹۲۳ء کو لاہور میں پنجاب ہائی کورٹ کی افتتاحی تقریب منعقدہ ہوئی۔ انگریز وائسرے لارڈ ریڈنگ مہمانِ خصوصی تھے۔ اس موقع پر انھوں نے تقریر کرتے ہوئے خاص طور پر علامہ اقبال کو بایں الفاظ خراجِ تحسین پیش کیا:

This bar has the distinction of possessing as a practising member, Sir Muhammad Iqbal The Celebrated Urdu and Persian Poet.[۳۸]

(اس بار کو سر محمد اقبال جیسے وکیل کی شمولیت کا فخر حاصل ہے، جو اردو اور فارسی کے مسلّمہ شاعر ہیں۔)

۶

اسی سال مئی کے پہلے ہفتے میں فارسی نظموں کا پہلا (اور فارسی کلام کا تیسرا) مجموعہ پیامِ

مشرق کے نام سے شائع ہوا۔[۳۹] پیام مشرق کا مدعا بقول علامہ اقبال: ''زیادہ تر ان اخلاقی، مذہبی اور ملّی حقائق کو پیش نظر لانا ہے، جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔''[۴۰]

پیام مشرق میں چند ایسی نظمیں بھی شامل ہیں، جن سے اشتراکی نظریے کی تائید اور روس کے اشتراکی انقلاب کی تحسین کا پہلو نکلتا تھا۔ اس پر بعض لوگوں نے اقبال کو 'اشتراکیت کا مبلغ' قرار دیا، مگر کیا اقبال واقعی اشتراکی خیالات رکھتے تھے، اس کا جواب تلاش کرنے سے پہلے سوال کا پس منظر جاننا ضروری ہے۔

پہلی جنگ عظیم جاری تھی کہ اکتوبر ۱۹۱۷ء میں روس کا اشتراکی انقلاب برپا ہوا۔ یہ تاریخ عالم کا ایک اہم واقعہ تھا۔ چوں کہ یہ انقلاب سرمایہ داروں کے استحصال کے خلاف اور مزدوروں، کسانوں اور معاشرے کے مظلوم طبقوں کی حمایت میں اور انھیں امن و انصاف اور ہر طرح کے مساوی حقوق دلانے کے نام پر برپا ہوا تھا، اس لیے نظام حکومت اس کی تبدیلی کو دنیا بھر میں عمومی طور پر سراہا گیا۔ اقبال نے نظم 'خضرِ راہ' میں مزدوروں کو 'آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا' کی نوید سناتے ہوئے، اس انقلاب کا خیر مقدم کیا:

اُٹھ کہ اَب بزمِ جہاں کا اَور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دَور کا آغاز ہے

پیامِ مشرق کی بعض نظموں سے بھی بظاہر یہی مترشح ہوتا تھا کہ اقبال، اشتراکی انقلاب کے مویّد ہیں۔ اس پر بعض اشتراکی صحافیوں نے: اقبال کو بولشوزم (اشتراکیت) کا پرجوش حامی قرار دے ڈالا۔ ایک اشتراکی صحافی کامریڈ غلام حسین نے تو یہاں تک لکھ دیا: 'سر اقبال کی 'خضر راہ' اور پیامِ مشرق کی نظموں 'قسمت نامۂ سرمایہ دار و مزدور' اور 'نوائے وقت' سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبال یقیناً ایک اشتراکی ہی نہیں، بلکہ اشتراکیت کے مبلغِ اعلیٰ بھی ہیں۔[۴۱]

اس پر علامہ اقبال نے فی الفور روزنامہ زمیندار میں ایک تردیدی مراسلہ شائع کرایا، جس میں کہا کہ بولشویک خیالات رکھنا دائرہ اسلام سے خارج ہونے کے مترادف ہے، مزید کہا: ''مغرب کی سرمایہ داری اور روسی بولشوزم، دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے، جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے۔''[۴۲] دراصل علامہ اقبال بہت سمجھ دار اور دانش مند انسان تھے۔ نظریاتی اور فکری مسئلہ ہو یا سیاسی اور سماجی امور و معاملات، انھوں نے ہمیشہ جذباتیت سے ہٹ کر حقیقت پسندی کی معتدل اور متوازن راہ اپنائی۔

پیامِ مشرق کی اشاعت (۱۹۲۳ء) پر اردو مجموعے کی اشاعت کے لیے قارئینِ اقبال کا اصرار بڑھا تو علامہ نے بانگِ درا مرتب کرنی شروع کر دی۔ اردو مجموعہ شائع کرنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ عین اسی زمانے میں حیدر آباد دکن کے مولوی عبدالرزاق راشد نے اقبال کا اردو کلام جمع کر کے بلا اجازت کلیاتِ اقبال شائع کر دی۔ اقبال بجا طور پر، اس پر معترض ہوئے۔ آخر سر اکبر حیدری کی وساطت سے طے ہوا کہ اوّل: مجموعے کی اشاعت و فروخت صرف دکن ہی تک محدود رہے گی۔ دوم: دوسرے مولوی عبدالرزاق راشد، علامہ اقبال کو رائلٹی بھی ادا کریں گے۔[۴۳] ستمبر ۱۹۲۴ء میں بانگِ درا تین ہزار کی تعداد میں شائع ہوئی۔

حوالے اور حواشی

۱۔ انوارِ اقبال، ص ۶۵
۲۔ اقبال اور کشمیر: صابر آفاقی، ص ۵۱
۳۔ اقبال اور کشمیر: جگن ناتھ آزاد، ص ۱۱۸
۴۔ زندہ رود، ص ۳۱۵
۵۔ ایضاً، ص ۳۱۵
۶۔ بحوالہ زندہ رود، ص ۳۱۵
۷۔ میاں عبد العزیز مالواڈہ، ص ۸۸
۸۔ مکاتیب بنام گرامی، ص ۲۱۵
۹۔ اس سلسلے میں تفصیل کے لیے دیکھیے: محمد حنیف شاہد کا مضمون 'اقبال بحیثیت ممتحن'، مشمولہ نقوش، اقبال نمبر ۷، ۱۹۷۷ء؛ نیز ملک حسن اختر کا مضمون 'اقبال اور پنجاب یونی ورسٹی'، مشمولہ اقبال: ایک تحقیقی مطالعہ۔
۱۰۔ ملفوظات، ص ۱۱۹-۱۲۰؛ نیز اقبال کے ہم نشین، ص ۶۶-۶۷
۱۱۔ مکاتیب بنام گرامی، ص ۲۲۱
۱۲۔ زندہ رود، ص ۳۲۰، ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے کوتروں کی منتقلی کی خبر دیتے ہوئے یہ بھی بتایا ہے کہ نئے مکان میں منتقل ہونے سے پیشتر اقبال کے بھائی شیخ عطا محمد، سیال کوٹ سے لاہور آئے اور یہیں رہ کر انھوں نے کوٹھی کی شکل و صورت بہتر بنانے کے لیے کام شروع کیا۔ (ص ۳۲۰) اس بیان کی بنیاد ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کی ایک روایت پر ہے، (صحیفہ اقبال نمبر، اکتوبر ۱۹۷۳ء، ص ۵۶) مگر شیخ اعجاز احمد اس کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شیخ عطا محمد اس موقع پر نہیں، بلکہ ۱۹۳۴ء میں لاہور آئے تھے۔ اور جاوید منزل، انھی کی نگرانی میں تعمیر ہوئی (مظلوم اقبال، ص ۲۴۳) یہ روایت اس لیے قرینِ قیاس ہے کہ اگر میکلوڈ روڈ والی کوٹھی کو بنایا سنوارا گیا ہوتا تو اس کی دیواروں میں اس طرح کے شگاف نہ ہوتے، جن کا

مثلاً: عبداللہ چغتائی نے ذکر کیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ کوٹھی کے درمیانی [بڑے] کمرے میں ایک دیوار کے ساتھ ملکہ وکٹوریا کی تصویر آویزاں تھی۔ یہ تصویر ایک شگاف کو ڈھانپنے کے لیے آویزاں کی گئی تھی۔ (صحیفہ، اقبال نمبر، اکتوبر ۱۹۷۳ء، ص ۵۸)

۱۳۔ مجالسِ اقبال، ص ۳۳۲

۱۴۔ مظلوم اقبال، ص ۲۹۰

۱۵۔ ذکرِ اقبال، ص ۸۷

۱۶۔ زندہ رود، ص ۳۲۰

۱۷۔ مکاتیب بنام نیاز، ص ۹۰

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۰۵

۱۹۔ زندہ رُود، ص ۳۶۲

۲۰۔ مے لالہ فام، ص ۲۱

۲۱۔ مظلوم اقبال، ص ۲۴۲

۲۲۔ ایضاً، ص ۲۱

۲۳۔ ذکرِ اقبال، ص ۱۱۸-۱۱۹

۲۴۔ ملفوظات، ص ۷۹

۲۵۔ زندہ رود، ص ۳۲۹

۲۶۔ ایضاً، ص ۳۲۹۔ ذکرِ اقبال، ص ۱۱۸-۱۲۰

۲۷۔ زندہ رود، ص ۳۳۰

۲۸۔ ذکرِ اقبال، ص ۱۱۷

۲۹۔ اقبال نامہ، ص ۱۹۵

۳۰۔ ایضاً، ص ۲۱۲

۳۱۔ مکاتیب بنام گرامی، ص ۱۸۸

۳۲۔ بحوالہ مفکرِ پاکستان، ص ۲۲۸

۳۳۔ ایضاً، ص ۲۲۷

۳۴۔ ذکرِ اقبال، ص ۱۱۹

۳۵۔ اقبال نامہ، ص ۲۱۲

۳۶۔ زندہ رُود، ص ۴۰۵۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: حفیظ رومانی کا مضمون: علامہ اقبال کی شاعری...... حکومت کی خفیہ رپورٹوں کے آئینے میں، مطبوعہ: نوائے وقت، ۲۱/اپریل ۱۹۸۳ء

۳۷۔ خیال رہے کہ آج کل بھی مختلف ممالک (بشمول پاکستان) میں حکومتیں اپنے شہریوں کو، زندگی کے مختلف شعبوں میں خدمات کی بنا پر خطابات دیتی ہیں۔ پاکستان میں اہلِ قلم کو عموماً 'صدارتی تمغائے حسنِ کارکردگی' (پرائڈ آف پرفارمنس) سے نوازا جاتا ہے۔ اس کا معنی یہ نہیں ہوتا کہ تمغا پانے والے سب

حکومت کے خوشامدی ہوتے ہیں یا اگر صدر کوئی فوجی آمر ہو تو تمغا لینے والے، اس کی آمریت پر صاد کر رہے ہوتے ہیں۔

۳۸۔ بحوالہ مفکر پاکستان، ص ۲۳۰

۳۹۔ تصانیفِ اقبال، ص ۱۳۰

۴۰۔ دیباچہ: پیامِ مشرق، ص ۱۱

۴۱۔ روزنامہ زمیندار، ۲۳/ جون ۱۹۲۳ء، ص ۱۲۳

۴۲۔ خطوطِ اقبال، ص ۱۵۵۔۱۵۶

۴۳۔ اس قضیے کی تفصیل کے لیے دیکھیے: انوارِ اقبال، ص ۳۱، ۳۲؛ نیز "کلیاتِ اقبال کی سرگذشت" از عبدالواحد معینی، مشمولہ نقشِ اقبال، ص ۵۶۔۸۴۔

❖......❖......❖

(۱۴)

الکشن، ممبری، کونسل......

۱

علامہ اقبال کی افتادِ طبع سیاسی نہیں، شاعرانہ تھی تاہم وہ سیاسیاتِ حاضرہ سے بخوبی واقف تھے۔ وہ ہندستانی، بلکہ عالمی سیاسیات سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔

دسمبر ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم لیگ قائم ہوئی۔ اس زمانے میں اقبال انگلستان میں تھے۔ ۱۹۰۷ء میں لاہور میں پنجاب پراونشل مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا، جس میں اقبال کے بہت سے قریبی اور بے تکلف دوست شامل تھے۔[۱] مرزا جلال الدین کہتے ہیں: ''علامہ اقبال اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۰۸ء میں وطن پہنچے تو قدرتی طور پر لیگ کی جاذبیت نے انھیں اپنی طرف متوجہ کیا اور وہ بھی ہمارے ساتھ اس میں شریک ہو گئے''۔[۲] کچھ عرصے بعد وہ پنجاب پراونشل لیگ کے اسسٹنٹ سیکرٹری بن گئے۔ وہ ۴۸ر افراد پر مشتمل اس وفد میں شامل تھے، جس نے یکم اپریل ۱۹۱۱ء کو لارڈ ہارڈنگ کو ایک سپاس نامہ پیش کیا۔[۳] جنگ عظیم کے زمانے میں وہ کسی نمایاں سیاسی سرگرمی میں شریک نہیں ہوئے، کیونکہ ان کی توجہ زیادہ تر تصنیف و تالیف اور نظم گوئی خصوصاً مثنوی نگاری کی طرف رہی، البتہ تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات میں اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق انھوں نے حصہ لیا۔

۱۹۲۳ء میں اقبال کے بعض دوستوں نے تجویز پیش کی کہ وہ پنجاب کی مجلس قانون ساز میں اہل لاہور کی نیابت کریں۔ جب معلوم ہوا کہ ان کے قریبی دوست میاں عبدالعزیز بھی اسی حلقے سے انتخاب میں حصہ لے رہے ہیں تو اقبال نے رکنیت کی امیدواری سے معذرت کر لی۔ ۱۹۲۵ء میں جب دوبارہ الیکشن ہونے والے تھے تو اقبال انتخاب میں حصہ لینے کے لیے رضامند ہو گئے۔ اس موقع پر میاں عبدالعزیز نے اپنا نام واپس لے کر اقبال کی تائید میں مہم چلانے کا اعلان کیا۔

علامہ اقبال نے اپنی غیر سیاسی افتادِ طبع کے باوجود انتخاب میں حصہ لینے (اپنے بقول:

'الیکشن کے ہنگامے' میں پڑنے) کا فیصلہ کیوں کیا؟...... اس لیے کہ عام مسلمانوں کے نزدیک وہ ایک مخلص، بے لوث اور قابلِ اعتماد شخص تھے اور اسمبلی میں نمائندگی کے لیے انھیں، سیاسی حلقوں میں اقبال سے بہتر آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ ۱۹۲۳ء ہی سے لوگ انھیں انتخاب میں حصہ لینے پر مجبور کر رہے تھے۔[۴] خود اقبال نے محسوس کیا کہ یہ اُمت کی خیر خواہی کا تقاضا بھی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس موقع پر علامہ نے ایک بیان میں کہا: ''مسلمانوں کو معلوم ہے کہ میں اب تک اس قسم کے مشاغل سے بالکل علیحدہ رہا، محض اس لیے کہ دوسرے لوگ یہ کام سرانجام دے رہے تھے اور میں نے اپنے لیے دوسرا دائرہ کار منتخب کر لیا تھا لیکن اب قوم کی مصیبتیں مجبور کر رہی ہیں کہ میں اپنا حلقۂ عمل قدرے وسیع کروں، شاید میرا ناچیز وجود اس طرح اس ملت کے لیے زیادہ مفید ہو سکے۔''[۵]

ذہناً ۱۹۱۲ء ہی سے وہ ''پبلک لائف بوجوہات ترک'' کر چکے تھے۔[۶] آئندہ عشرے میں پیشہ ورانہ مصروفیات کے علاوہ، وہ زیادہ تر تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ ۱۹۲۲ء سے خطبات [مدراس] کے سلسلے کے بعض فکری مسائل پر غور و فکر کرتے آ رہے تھے، چنانچہ اب قومی ضروریات کے علاوہ، اپنے بقول: طبیعت میں توازن قائم رکھنے کے لیے بھی عملی زندگی کے مسائل میں دلچسپی لینا، انھیں مفید اور ضروری معلوم ہوا۔[۷]

۲

علامہ اقبال کے مقابلے میں لاہور بلدیہ کے صدر ملک محمد حسین اور آرائیں برادری کے ایک سر برآوردہ رکن خان بہادر ملک محمد دین بھی امیدوار تھے۔ ملک محمد حسین تو اقبال کے حق میں دست بردار ہو گئے لیکن ملک محمد دین مقابلے میں ڈٹے رہے۔ انھیں اپنی آرائیں برادری پر بھروسا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چیف کورٹ لاہور کے جج سر شادی لال نے ملک محمد دین کو اقبال کے مدِ مقابل کھڑا ہونے کے لیے اکسایا تھا۔[۸] اقبال کے نیاز مندوں نے ان کی انتخابی مہم میں بڑے جوش و خروش اور ولولے سے کام کیا۔ اس زمانے کے اخبارات میں انتخابی جلسوں، جلوسوں اور دیگر سرگرمیوں کی جو تفصیل شائع ہوتی رہی، اس کے مطابق مختلف علاقوں میں علامہ اقبال کی حمایت میں کئی بار جلسے منعقد ہوئے جن میں عوام الناس کے ساتھ کالجوں کے طلبہ، پروفیسر اور دیگر معززینِ شہر بھی شریک ہوتے رہے۔ جلسوں کے اختتام پر جلوس نکالے جاتے، جن میں اقبال کے حامی رضا کار مختلف ٹولیاں بنا کر گیت گاتے ہوئے شہر کی سڑکوں پر گشت کرتے، پنجابی اور اردو میں علامہ کی عظمت کے گیت گائے جاتے۔ خود اقبال کے شعر بھی گا گا کر پڑھے جاتے، اگر کہیں

علامہ بھی جلوس میں موجود ہوتے تو انھیں پھولوں سے لاد دیا جاتا۔ رضا کاروں کی ترکی ٹوپیوں پر لفظ 'اقبال' نمایاں طور پر لکھا ہوا نظر آتا تھا۔ بعض رضا کار رنگا رنگ پگڑیاں باندھے جلوس میں شامل ہوتے۔ انتخابی مہم کے دوران میں خود اقبال نے تقریباً بیس جلسوں سے خطاب کیا۔[9] ایک جلسے میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے تقریر کرتے ہوئے کہا: یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب انتخاب کونسل کے سلسلے میں اِدھر اُدھر گھوم رہے ہیں...... چاہیے تو یہ تھا کہ ہم ڈاکٹر صاحب سے درخواست پر دستخط کراتے اور پھر بلا مقابلہ آپ کو ہار پہنا کر کونسل ہال میں چھوڑ آتے۔ مَیں سخت شرم اور رنج کے ساتھ کہہ سکتا ہوں، کیسی بدنصیب ہے وہ قوم، جس کے بعض افراد اقبال جیسی شخصیات کا مقابلہ کرنے سے باز نہیں آتے۔[10]

علامہ کی انتخابی مہم رضا کارانہ طور پر اور بڑے والہانہ انداز سے میں چلائی گئی۔ خود اقبال کو کچھ بھی خرچ نہ کرنا پڑا۔ ہر شخص اپنی اپنی استطاعت کے مطابق اقبال کو کامیاب کروانے کے لیے جان لڑا رہا تھا۔ مخالف امیدوار ملک محمد دین کی طرف سے ایک قدِ آدم اشتہار، دیواروں پر چسپاں کیا گیا۔ اقبال کے ایک حامی کاتب حاجی دین محمد نے ملک لال دین قیصر کے ایما پر راتوں رات، علامہ اقبال کا ایسا ہی قدِ آدم پوسٹر تیار کر دیا۔ لوگ حیران ہوئے، خود اقبال بھی متعجب ہوئے۔ بے ساختہ کہنے لگے: ''حاجی صاحب تو کاتب کن فیکون ہیں۔ اشتہار سے کہا: ''کن اور وہ اسی وقت فیکون ہو گیا''۔ اس پر کاتب صاحب 'کاتب کن فیکون' مشہور ہو گئے۔[11] لاہور کی متعدد برادریاں بھی اقبال کی حمایت کر رہی تھیں۔

علامہ نے اپنی تقریروں میں کچھ اصولی باتیں کہیں، مثلاً: ۱۱/ اکتوبر کو منعقدہ پہلے جلسے میں کہا: مَیں نے مسلمانوں کو زندگی کے صحیح مفہوم سے آشنا کرنے، اسلاف کے نقشِ قدم پر چلانے اور نااُمیدی، بزدلی اور کم ہمتی سے باز رکھنے کے لیے نظم کا ذریعہ استعمال کیا۔ مَیں نے پچیس سال تک اپنے بھائیوں کی مقدور بھر ذہنی خدمت کی، اب مَیں ان کی بطرز خاص عملی خدمت کے لیے اپنے آپ کو پیش کر رہا ہوں۔[12]

اقبال کے مدِ مقابل ملک محمد دین، آرائیں برادری کی عصبیت کو ہوا دے رہے تھے۔ اسی طرح بعض اخبارات میں اقبال کو وہابی، نجدی، کذاب، جھوٹا اور دشمن اسلام قرار دیا گیا، ان کے اعمال وعقائد پر حملے کیے گئے، مگر اقبال اور ان کے حامیوں نے تہذیب اور شائستگی سے تجاوز نہیں کیا۔ اگر کسی نے جوش میں آ کر حریف امیدوار ملک محمد دین کو برا بھلا کہا، یا جوابی الزام تراشی کی

کوشش کی تو اسے روک دیا گیا۔[۱۳]

انتخابی ہنگاموں میں بالعموم اعتدال و توازن ملحوظ نہیں رہتا، مگر علامہ اقبال کی شخصیت سے بعید تھا کہ وہ کسی طرح کی بے اعتدالی کریں۔ وہ اپنے موقف کا اظہار پُر خلوص طریقے سے اور دردمندی و دل سوزی کے ساتھ کرتے رہے۔ ایک موقعے پر انھوں نے کہا: 'مسلمانوں کی زندگی کا راز اتحاد میں مضمر ہے۔ میں نے برسوں مطالعہ کیا، راتیں غور و فکر میں گزار دیں، تاکہ وہ حقیقت معلوم کروں، جس پر کاربند ہو کر عرب؛ حضور سرورِ کائنات کی صحبت میں تیس سال کے اندر اندر دنیا کے امام بن گئے۔ وہ حقیقت اتحاد و اتفاق میں ہے۔ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو متحد ہو جاؤ، اختلاف بھی کرو تو اپنے آبا کی طرح۔ تنگ نظری چھوڑ دو...... مسلمانانِ ہند کے لیے دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ وہ ہندستان کی سیاسیات کے ساتھ گہری وابستگی پیدا کریں۔ جو لوگ خود اخبار نہ پڑھ سکتے ہوں، وہ دوسروں سے سنیں۔ اس وقت جو قوتیں دنیا میں کارفرما ہیں، ان میں سے اکثر اسلام کے خلاف کام کر رہی ہیں، لیکن لیظھرہٗ علی الدین کلہ' کے دعوے پر میرا ایمان ہے۔ لا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الا علون ان کنتم مو منین۔[۱۴]

انتخاب کا نتیجہ ۶ دسمبر ۱۹۲۶ء کو ضلع کچہری میں سنایا گیا۔ ریکارڈ کے مطابق رائے دہندگی کا تناسب (turn out) ۶۸ فیصد تھا۔ علامہ کو ۵۶۷۵ ووٹ اور مدِّ مقابل کو ۲۴۹۸ ووٹ ملے، یعنی علامہ نے اپنے حریف پر ۳۱۷۷ ووٹوں کی سبقت حاصل کر کے کامیابی حاصل کی۔

علامہ اقبال کے حامیوں نے انھیں ساتھ لے کر اظہارِ مسرت کے لیے ایک جلوس نکالا جو انارکلی، لوہاری، بھاٹی، ہیرا منڈی، سید مٹھا بازار کے راستے چوک جھنڈا میں پہنچا۔ یہاں ایک صاحب نے خواجہ فیروز الدین بیرسٹر رکن بلدیہ اور علامہ اقبال کے سروں پر پگڑیاں باندھیں۔ علامہ کو فٹن میں سوار کیا گیا اور پھر یہ جلوس پانی والے تالاب، ڈبی بازار، کشمیری بازار، پرانی کوتوالی سے ہوتا ہوا چوہٹا مفتی باقر پہنچا، جہاں کچھ نظمیں پڑھی گئیں۔ رات دس بجے جلوس منتشر ہوا۔ خاصے دنوں تک علامہ کو مبارک باد کے پیغامات اور خطوط موصول ہوتے رہے۔ ان کے اعزاز میں متعدد دعوتوں کا اہتمام بھی کیا گیا۔

۳

پنجاب کی قانون ساز اسمبلی کا افتتاحی اجلاس ۳ جنوری ۱۹۲۷ء کو منعقد ہوا۔ خیال رہے کہ عین انتخابی مہم کی ہنگامہ پرور مصروفیات کے درمیان زبورِ عجم کی تخلیق و تحریر بھی جاری رہی۔

(یہ سلسلہ ۱۹۲۴ء سے جاری تھا) ۳۱ جنوری کو اقبال نے مولانا گرامی کو مطلع کیا کہ زبورِ عجم ختم ہوگئی ہے، ایک دو روز تک کاتب کے ہاتھ میں جائے گی۔[۱۵]

تین سال کے عرصۂ رکنیت کے دوران انھیں کئی بار فنانس کمیٹی اور ایجوکیشن کمیشن کا رکن مقرر کیا گیا۔ اسی طرح وہ سائمن کمیٹی سے گفت و شنید کے لیے اسمبلی کی ۱۵ رکنی کمیٹی میں بھی شامل تھے۔

ہمارے ہاں یہ دیرینہ سیاسی روایت ہے کہ ارکانِ اسمبلی ہَوا کا رخ دیکھ کر کسی نہ کسی گروپ یا پارٹی سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ اس وابستگی میں عموماً مالی مفاد پیشِ نظر ہوتا ہے یا کسی منصب کا حصول یا حکامِ بالا کی خوش نودی پر نظر ہوتی ہے۔ علامہ اقبال کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ ان میں سے کوئی راستہ اختیار کرتے۔ بظاہر تو وہ یونینسٹ پارٹی کے ساتھ وابستہ تھے، مگر وہ ہر مسئلے پر ہمیشہ اپنی آزادانہ اور بے لاگ رائے کا اظہار کرتے، خواہ وہ کسی کو ناپسند ہی کیوں نہ ہو۔ اس سلسلے میں وہ حکومت کی پالیسیوں پر بھی نکتہ چینی کرتے۔ اسی طرح مختلف طبقوں اور گروہوں کے منفی رویوں کو بھی ہدفِ تنقید بناتے۔ اس زمانے میں سر فضل حسین کا ستارہ عروج پر تھا۔ ممبرانِ اسمبلی ان کی قربت حاصل کر کے اپنے کام نکلواتے یا زیادہ صحیح الفاظ میں اپنا اُلّو سیدھا کرتے۔ علامہ اقبال کے بارے میں لوگ شاکی رہتے، بلکہ سر فضل حسین کے بیٹے عظیم حسین نے تو یہ گلہ کیا ہے کہ میرے والد فضل حسین نے ہمیشہ اقبال کی مدد کرنے اور انھیں فائدہ پہنچانے کی کوشش کی، لیکن وہ حکومت پر، اس کی پالیسوں اور افسران پر تنقید کر کے ترقی کے مواقع کھوتے رہے۔ ان کا یہ شکوہ بجا ہے، لیکن اقبال، اقبال تھے؛ چودھری ظفر اللہ خاں نہیں تھے، جنھوں نے بقول عظیم حسین: فضل حسین کے فرمودات پر عمل پیرا ہو کر ''اپنے لیے روشن مستقبل متعین کر لیا''۔[۱۶]

۴

دراصل اقبال کو حصولِ مفادات یا حکام کی خوش نودی کے بجائے عوام کی فلاح و بہبود زیادہ عزیز تھی۔ یہ علامہ کی رکنیت کا پہلا سال تھا۔ مئی ۱۹۲۷ء میں لاہور میں ہندو مسلم فساد کی آگ بھڑک اٹھی، جسے فرو کرنے میں اقبال کا کردار بہت نمایاں رہا۔ روزنامہ انقلاب، لاہور نے اس موضوع پر ایک شذرے میں لکھا: سچ تو یہ ہے کہ فسادات کی مشتعل آگ کو فرو کرنے کے نیک کام میں سب سے پیش پیش علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال تھے۔ حضرت علامہ سے واقف لوگ حیران ہو رہے ہیں کہ وہ بڑی بڑی دعوتوں پر جانا پسند نہیں کرتے، مگر آج کل صبح سے شام اور شام سے صبح تک خدمتِ ملک و ملّت میں مصروف نظر آتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ علامہ اقبال نے مسلمانانِ لاہور کی

نمائندگی کا حق ادا کر دیا۔[۱۷]

اس فتنہ وفساد کا قصہ یہ ہے کہ ۳ رمئی کو شب کے ۹ بجے تقریباً اڑھائی سو سکھوں اور ہندوؤں نے کوچہ درزیاں، ڈبی بازار میں نمازِ عشا پڑھ کر مسجد سے نکلنے والے مسلمانوں پر لاٹھیوں اور کرپانوں سے حملہ کر دیا۔ تین مسلمان شہید اور چار زخمی ہو گئے۔[۱۸] شہر کی فضا کشیدہ ہو گئی اور بڑے پیمانے پر فسادات کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ یہ واقعہ، ان فسادات کا تسلسل تھا، جو گذشتہ تین چار برسوں سے رونما ہوتے چلے آ رہے تھے۔ ان فسادات کا مختصر پس منظر حسب ذیل ہے:

عبدالمجید سالک لکھتے ہیں: ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۷ء تک کا زمانہ ہندستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے فسادات کا زمانہ تھا۔[۱۹] ان کا آغاز تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات کے خاتمے کے بعد ہوا تھا۔ ان تحریکوں میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ کسی حد تک ہندو بھی شامل تھے، لیکن اس کے بعد دونوں کے راستے الگ ہو گئے۔ فسادات کی تاریخ یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ ۱۹۲۳ء میں ملتان میں بڑا فساد ہوا۔ اس کے بعد کئی شہروں (دہلی، الٰہ آباد، ناگ پور، لکھنؤ، جبل پور، گلبرگہ، شاہ جہان پور اور کوہاٹ) میں فسادات پھوٹتے رہے۔ سرکاری طور پر ان میں اڑھائی سو افراد کی ہلاکت کی تصدیق کی گئی۔ فسادات کبھی عمداً بھی کروائے جاتے، مثلاً: مساجد کے قریب نمازِ باجماعت کے اوقات میں گھنٹیاں اور سنکھ بجائے جاتے، مساجد کے سامنے برات روک کر پٹاخے چھوڑے جاتے؛ ہولی کے موقعے پر مسلمانوں پر رنگ کے علاوہ کیچڑ اور گوبر پھینکا جاتا؛ بقرعید کے موقعے پر مسلمانوں کو گائے کی قربانی سے روکا جاتا، اس طرح کے اقدامات سے قدرتی طور پر مسلمانوں میں اشتعال پیدا ہوتا اور جب وہ اپنے ردِعمل کا اظہار کرتے تو فسادات شروع ہو جاتے۔

علاوہ ازیں ہندوؤں کی بعض تحریکوں اور جماعتوں (آریا سماج، شُدھی، سنگھٹن اور ہندو مہاسبھا وغیرہ) کا معاندانہ طرزِ عمل بھی مسلمانوں میں اشتعال کا باعث ہوتا تھا۔ بعض ہندو تحریکوں نے ہندوؤں میں فوجی تربیت کو رائج کر کے نوجوان ہندوؤں کو عسکریت کی راہ پر لگایا۔ سوامی شردھانند، شُدھی اور سنگھٹن کے علمبردار تھے۔ وہ ہندستان میں خالصتاً ہندو راج کے قائل تھے۔ انھوں نے اعلانیہ کہا کہ ہندستان میں رہنے اور حکومت کرنے کا حق صرف ہندوؤں کو ہے۔ مسلمان اور دوسری قومیں غیر ملکی ہیں، انھیں یہاں رہنا ہے تو اپنا تشخص ختم کر دیں اور ہندوؤں میں ضم ہو جائیں، ورنہ ہندستان چھوڑ کر کہیں اَور چلے جائیں۔ مسلمانوں کے خلاف شردھانند کی زبان انتہائی اشتعال انگیز ہوتی تھی۔ آخر ایک جوشیلے مسلمان نے اسے قتل کر دیا۔

ہندو مسلم فسادات کا اصل سبب مہاسبھائی ذہنیت تھی، تاہم بعض معتدل مزاج ہندوؤں اور مسلمانوں نے نیشنل لبرل لیگ کے نام سے ایک انجمن قائم کی۔ اقبال بھی مختصر عرصے کے لیے اس میں شامل رہے، لیکن پھر مایوس ہو کر علیحدگی اختیار کر لی۔ ہندو مسلم فسادات سے وہ ہمیشہ آزردہ رہے۔ ان کی دِلی خواہش تھی کہ دونوں قوموں کے درمیان کشیدگی ختم ہو۔ ۶/اپریل ۱۹۲۶ء کو انھوں نے ایک بیان میں کہا: مَیں دل سے چاہتا ہوں کہ ہندو اور مسلمان اپنے اختلافات کو دور کر کے ملک میں بھائیوں کی طرح سے رہیں اور بات بات پر ایک دوسرے کا سر نہ پھوڑتے پھریں...... مَیں اب تک تمام سیاسی جماعتوں سے علیحدہ رہا ہوں، البتہ میری خواہش یہ رہی ہے اور ہے کہ ہندستان کی تمام سیاسی جماعتوں کے باہمی تعلقات بہتر ہو جائیں...... کسی سیاسی جماعت سے میرا کوئی تعلق نہیں۔[۲۰] اس پس منظر میں ۳/مئی ۱۹۲۷ء کو مذکورہ بالا سانحہ پیش آیا۔ اقبال کو اطلاع ملی تو انھوں نے اپنے بعض دوستوں سے رابطہ کیا۔ خواجہ فیروز الدین احمد اور مولوی غلام محی الدین قصوری کو ساتھ لے کر بارہ بجے شب موقع پر پہنچے اور صبح پانچ بجے تک وہاں موجود رہے۔[۲۱] دن میں پھر وہ مسلم اکابر کی مجلس مشاورت میں شریک ہوئے اور بعد دوپہر شہدا کے جنازے کے جلوس میں شامل ہو کر مشتعل نوجوانوں کو کنٹرول کیا۔ مسلمان ایک طرف تو بپھرے ہوئے تھے، دوسری طرف وہ دہشت زدہ بھی تھے۔ اقبال نے اکابرِ شہر کو ساتھ لے کر دوسرے روز اور پھر تیسرے روز بھی شہر کے مختلف علاقوں کا دَورہ کیا۔ مسلمانوں کی بند دُکانیں کھلوائیں، انھیں تسلی دی اور تلقین کی کہ وہ صبر و تحمل سے کام لیں؛ فرمایا: مسلمان کی شان یہ ہے کہ جوش سے وقت پر کام لے، خواہ مخواہ بے قابو نہ ہوتا پھرے [اور] جو قوم اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتی، اسے ہتھیار رکھنے کا حق حاصل نہیں۔[۲۲]

فسادات کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ سکھوں کو کرپان رکھنے کی آزادی تھی، مگر مسلمانوں کو تلوار رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ انگریز حکومت کے اس جانب دارانہ فیصلے پر مسلمان بجا طور پر رنجیدہ اور ناراض تھے۔ علامہ نے اس بے انصافی کے خلاف احتجاج کیا اور اسمبلی میں حکومت سے مطالبہ کیا کہ کرپان کی طرح تلوار کو بھی قانونِ اسلحۂ ہند سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ آخر بار بار کے احتجاج اور اسمبلی میں ان کی مسلسل جدوجہد کے نتیجے میں پنجاب کے نو ضلعوں میں مسلمانوں کو تلوار رکھنے کی اجازت مل گئی۔[۲۳] کچھ تگ و دَو کے بعد آٹھ مزید ضلعوں میں بھی استثنیٰ مل گیا۔[۲۴]

اقبال نے تلوار کے مسئلے پر مسلمانوں کو ان کا حق دِلایا، مگر وہ سب کے لیے یکساں طور پر امن اور

انصاف کے خواہاں تھے۔عبدالمجید سالک کے بقول: علامہ اقبال ہندستانی سیاسیات میں اپنا مخصوص نقطۂ نگاہ رکھنے کے باوجود بلا امتیازِ مذہب و ملت ہر ایک کے ساتھ تعاون پر آمادہ رہتے تھے، [۲۵] چنانچہ فسادات کے دنوں میں بعض دردمند مسلمانوں اور ہندوؤں نے مل کر انسدادِ فسادات کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی، جس کا پہلا اجلاس رائے بہادر موتی ساگر کے مکان پر منعقد ہوا، علامہ بھی اس میں شامل تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ لوگوں کی بے توجہی اور بے عملی کی وجہ سے اس کاوش کا نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ [۲۶] اقبال کئی بار مسلم ریلیف کمیٹی کی مجلسِ عاملہ کے اجتماعات میں بھی شریک ہوئے۔ [۲۷]

اسمبلی میں وہ عام آدمی کے مسائل حل کرنے پر برابر زور دیتے رہے، مثلاً: دیہات میں صحت و صفائی کا مسئلہ، عورتوں کے لیے طبی امداد کا مسئلہ اور ایلوپیتھی کے بجائے یونانی اور آیورویدک طریقِ علاج کی ترویج وغیرہ۔ اسی طرح ہم وطنوں کی تعلیمی ترقی کے لیے، اقبال نے ہمیشہ جبری تعلیم کے نفاذ پر زور دیا، دستکاری کی تعلیم کی طرف بھی متوجہ کیا اور انگریزی حکومت کی تعلیمی پالیسیوں پر تنقید بھی کرتے رہے۔ لاہور شہر میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، اقبال نے کئی بار زور دیا کہ میونسپلٹی کی ۴۱ نشستوں میں سے ۲۱ مسلمانوں کے لیے مختص ہونی چاہییں۔ اگر کل نشستیں ۴۵ ہوں تو ۲۳ مسلمانوں کو ملنی چاہییں۔ کبھی وہ تحریکِ التوا پیش کرتے اور کبھی وہ اس طرح کے سوالات کر کے، حکومت سے جوابات طلب کرتے کہ مثلاً میڈیکل کالجوں اور عام کالجوں کے شعبۂ تدریس میں اور بعض سرکاری محکموں کے ملازمین میں مسلمانوں اور غیر مسلموں (ہندو، سکھ، عیسائی) کا تناسب کیا ہے؟ یا فوجی خدمات کے عوض جن لوگوں کو زمین دی گئی، ان میں کتنے مسلمان ہیں؟ مقصود اس امر کی طرف توجہ دلانا ہوتا تھا کہ مسلمانوں کو اپنی آبادی کے تناسب سے ملازمتیں میسر نہیں ہیں اور ان کے ساتھ بے انصافی ہو رہی ہے۔

مختصر یہ کہ اقبال؛ صاحبانِ اقتدار کی ناراضی کی پروا کیے بغیر ہمیشہ با اصول اور بے لاگ سیاست کے راستے پر گامزن رہے۔ انھیں مسلمانوں کا مفاد عزیز تھا، مگر اس کے ساتھ ہی ان کی کوشش ہوتی تھی کہ مسلمان ہوں یا ہندو، کسی سے بے انصافی نہ ہو...... اور دونوں قومیں باہمی رواداری اور ہم آہنگی کی فضا میں زندگی گزاریں۔ ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں: ''اقبال نے پنجاب قانون ساز کونسل میں ساری مدت ایک تنہا رکن کی حیثیت سے گزاری انھیں کونسل میں کسی جماعت کی تائید یا حمایت حاصل نہ تھی، اس لیے صوبے کے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کونسل میں ان کی تقریریں بحیثیت مجموعی واویلا ثابت ہوئیں یا نقار خانے میں طوطی کی آواز۔'' [۲۸]

دراصل اقبال کی طبیعت ہماری سیاست کے مزاج سے لگا نہیں کھاتی تھی۔ وہ دنیا داری، موقع پرستی اور خوشامد سے کوسوں دور تھے اس لیے، اگر ان کی تقاریر کو ڈاکٹر جاوید اقبال نے بحیثیت مجموعی 'واویلا' یا 'نقار خانے میں طوطی کی آواز' قرار دیا تو کچھ بے جا نہیں۔ اقبال خود بھی اسمبلی کی رکنیت سے کچھ زیادہ خوش نہیں تھے۔ یہ بے ڈھب اور موقع پرستی کی سیاست ان کے بس کی بات نہ تھی، چنانچہ ۱۹۲۹ء میں ان کے احباب میں اگلی میقات کے لیے رکنیت کا مسئلہ زیر بحث آیا تو اقبال نے بلا تاخیر کہہ دیا کہ وہ رکن بننے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔

۵

اوپر سائمن کمیشن کا ذکر آیا ہے، یہ قضیہ بھی اقبال کے عرصۂ رُکنیت کے دوران میں پیش آیا۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ حکومتِ برطانیہ نے ہندستان میں بعض آئینی اصلاحات کے لیے نومبر ۱۹۲۷ء میں ایک سات رُکنی کمیشن قائم کیا، جس کے سربراہ سر جان سائمن (John Simon) تھے۔ اس کا کام یہ تھا کہ ہندستان کا دورہ کرے، تمام پارٹیوں اور سیاسی لیڈروں سے ملاقات کرے اور حالات کا مطالعہ کر کے دستوری اصلاحات کے لیے سفارشات پیش کرے...... اکثر سیاسی راہ نماؤں اور جماعتوں نے کمیشن کے مقاطعے کا فیصلہ کیا، کیونکہ اس کے ساتوں رُکن انگریز تھے، وفد میں ہندستانیوں کا کوئی نمائندہ شامل نہیں کیا گیا تھا۔ دہلی تجاویز، خصوصاً طریقِ انتخاب کے مسئلے پر مسلم لیگ دو حصوں میں بٹ چکی تھی۔ ایک دھڑے کے صدر محمد علی جناح تھے اور دوسرے کے صدر سر محمد شفیع اور سیکرٹری علامہ اقبال تھے۔ جناح لیگ کے برعکس شفیع لیگ کمیشن کے مقاطعے کے حق میں نہ تھی، چنانچہ جب سائمن کمیشن لاہور پہنچا تو عوام الناس نے اس کے خلاف زبردست مظاہرہ کیا، تاہم شفیع لیگ کے وفد نے کمیشن سے ملاقات کر کے اپنا مؤقف پیش کیا، اس وفد میں علامہ اقبال بھی شامل تھے۔[۲۹]

یہاں اس امر کی نشان دہی ضروری ہے کہ یہ سارا زمانہ، اقبال کے لیے انتہائی مصروفیت کا زمانہ تھا۔ وکالت، مجلس قانون ساز، سیاسی اور سماجی جلسے، مسلم اکابر سے مشاورتیں، شعر گوئی، خطباتِ مدراس کی تیاری، بیرونِ لاہور اسفار، مسلم مفادات کی ترجمانی کے لیے اخباری بیانات، بعض مسائل پر عوام سے اپیلیں، مقامی اور بیرونِ لاہور سے آنے والے ملاقاتی، گوناگوں جسمانی عوارض (دردِ گردہ اور نقرس وغیرہ)، غرض ''یک سرو ہزار سودا'' والا معاملہ تھا۔ مولانا غلام رسول مہر کو ایک طویل عرصے تک ان کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا۔ وہ لکھتے ہیں: عموماً چار پانچ گھنٹے

ان کے پاس گزرتے تھے، بعض اوقات متواتر گیارہ گیارہ گھنٹے بھی گزارے۔[۳۰] مہر صاحب کے علاوہ بھی طرح طرح کے ملاقاتی، ان کی مجالس میں آتے تھے۔ مہر صاحب کے روزنامچے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں علامہ کا اچھا خاصا وقت، ملاقاتیوں کی نذر ہو جاتا تھا۔ ملاقات کے لیے پیشگی اجازت کی ضرورت تھی، نہ وقت کی حد مقرر تھی۔[۳۱] دردِ گردہ کے پرانے مریض تھے۔ ۱۹۲۸ء میں مسلسل ایک ماہ تک اس عارضے کے ہاتھوں پریشان رہے۔[۳۲] نقرس کی شکایت ۱۹۲۲ء سے چلی آ رہی تھی، ۱۹۲۹ء میں ایک شدید حملہ ہوا، بہت دن کرب اور بے چینی میں گزرے۔

حوالے اور حواشی

۱۔ اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۹۔۱۱
۲۔ ملفوظات، ص ۶۴
۳۔ روزنامہ پیسہ اخبار لاہور، اپریل ۱۹۱۱ء بحوالہ اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۱۲
۴۔ مکتوبات بنام نیازی، ص ۱۱۶
۵۔ گفتارِ اقبال، ص ۱۵
۶۔ مکتوبات بنام نیازی، ص ۷
۷۔ مقالاتِ ممتاز، ص ۳۰۹
۸۔ بحوالہ اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۱۹
۹۔ سرگذشتِ اقبال، ص ۲۰۰
۱۰۔ اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۵۱
۱۱۔ ایضاً، ص ۱۹۔۲۰
۱۲۔ گفتارِ اقبال، ص ۱۶۔۱۷
۱۳۔ سرگذشتِ اقبال، ص ۲۰۲
۱۴۔ گفتارِ اقبال، ص ۱۸۔۱۹
۱۵۔ مکاتیب بنام گرامی، ص ۲۴۱
۱۶۔ زندہ رود، ص ۳۷۲
۱۷۔ بحوالہ اقبال کا سیاسی سفر، ص ۱۰۔۱۱
۱۸۔ انقلاب، ۵ مئی ۱۹۲۷ء؛ بحوالہ اقبال کا سیاسی سفر، ص ۳
۱۹۔ ذکرِ اقبال، ص ۱۳۱
۲۰۔ روزنامہ زمیندار، ۶ اپریل ۱۹۲۶ء، بحوالہ ذکرِ اقبال، ص ۱۳۲۔۱۳۳
۲۱۔ انقلاب، ۵ مئی ۱۹۲۷ء؛ بحوالہ اقبال کا سیاسی سفر، ص ۳

۲۲۔ انقلاب، ۶/مئی ۱۹۲۷ء؛ بحوالہ اقبال کا سیاسی سفر، ص ۵
۲۳۔ بحوالہ اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۹۷
۲۴۔ ایضاً، ص ۱۳۲
۲۵۔ ذکرِ اقبال، ص ۱۳۳
۲۶۔ اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۹۰-۹۱
۲۷۔ انقلاب، ۱۵/مئی ۱۹۲۷ء؛ بحوالہ اقبال کا سیاسی سفر، ص ۱۳
۲۸۔ زندہ رود، ص ۳۷۳
۲۹۔ اس موضوع پر تفصیل کے لیے دیکھیے: علامہ اقبال کی سیاسی زندگی، باب ۵
۳۰۔ اقبالیات [مہر]، ص ۲۴۸
۳۱۔ اقبالیاتِ خواجہ، ص ۵۳
۳۲۔ مکاتیب بنام نیاز، ص ۱۳۰

❖......❖......❖

(۱۴)

حرفِ تہ دارے باندازِ فرنگ

۱

ممتاز حسن کی روایت ہے کہ علامہ اقبال نے ایک بار انھیں بتایا: جب مَیں کیمبرج میں تھا تو فلسفے کے ساتھ ساتھ معاشیات کا مطالعہ بھی اس غرض سے کیا کرتا تھا کہ طبیعت کا توازن قائم رہے۔[۱] شاید طبیعت کا یہی توازن قائم رکھنے کے لیے وہ وکالت کی مصروفیات کے ساتھ ساتھ یونی ورسٹیوں کے پرچے بھی دیکھتے تھے اور علمی اور تعلیمی معاملات میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ ابھی تک کبوتر داری کا مشغلہ بھی جاری تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ پڑھنے پڑھانے اور مطالعے کا ذوق تو انھیں اوائل عمر ہی سے تھا، ۱۹۲۴ء میں Mohammadan Theories of Finance نام کی ایک کتاب ان کے ہاتھ لگی، جو انھیں اس قدر دلچسپ محسوس ہوئی کہ وہ مسلسل چھے سات گھنٹے تک اس کے مطالعے میں مصروف رہے۔[۲]

چھے سات گھنٹے کا یہ مطالعہ آئندہ چھے سات برسوں کی علمی جستجو کی تمہید بن گیا۔ اس علمی جستجو کا مرکزی نکتہ ''اسلام میں اجتہاد'' تھا۔ اس سلسلے میں اقبال نے تقریباً ڈیڑھ سال کے غور و فکر، متعدد علما (بشمول ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی اور مولانا اصغر علی روحی) سے گفتگوؤں، ملاقاتوں اور مطالعے کے بعد 'اجتہاد فی الاسلام' کے موضوع پر انگریزی میں ایک مضمون تیار کیا، جو اسلامیہ کالج لاہور میں ۱۳؍دسمبر ۱۹۲۴ء کو ایک جلسے میں پیش کیا گیا۔ صدرِ جلسہ شیخ عبدالقادر نے اس مضمون کو اقبال کا ایک ''علمی کارنامہ'' قرار دیا۔[۳]

چند ماہ بعد پنجاب کی مجلسِ قانون ساز کی رُکنیت کے لیے انتخابی مہم اور پھر تین برس تک مجلسِ قانون ساز سے وابستگی کی مصروفیات رہیں۔ اس دَوران میں پیشۂ وکالت کے ساتھ ساتھ سماجی ذمہ داریاں بھی ادا کرتے رہے۔ یہ ان کی جامع کمالات شخصیت کا کرشمہ تھا کہ اسی زمانے میں اور انھی گوناگوں مصروفیات کے درمیان بعض فقہی مسائل پر غور و فکر اور مطالعہ جاری رہا اور تحقیق بھی۔[۴]

اس اثنا میں مدراس کی مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف سدرن انڈیا نے اقبال کو اپنے ہاں علمی خطبات کی دعوت دی۔ اس سے پہلے سید سلیمان ندوی سیرت النبیؐ پر اور نومسلم محمد مارماڈیوک پکتھال، اسلامی تہذیب وتمدن پر وہاں چند لیکچر دے چکے تھے۔ علامہ نے یہ دعوت قبول کر لی اور ۳۰ دسمبر ۱۹۲۸ء کو ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی اور چودھری محمد حسین کی معیت میں بذریعہ ریل دہلی کے لیے روانہ ہو گئے، علی بخش بھی ہمراہ تھا۔

یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو وہ دہلی کی آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں شریک ہوئے۔ مسلم مطالبات کے سلسلے میں، سر محمد شفیع نے کانفرنس میں ایک قرارداد پیش کی، جس میں جداگانہ انتخاب، بمبئی سے سندھ کی علیحدگی، سرحد اور بلوچستان میں دوسرے صوبوں کے برابر آئینی اصلاحات، وفاقی طرزِ حکومت، صوبوں کو تفویض اختیارات اور مرکزی اسمبلی میں ایک تہائی مسلم نمائندگی کی نیابت کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ علامہ اقبال نے اس کی تائید میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اگر مسلمانوں کو ہندستان میں بحیثیت مسلمان کے زندہ رہنا ہے تو ...... جلد از جلد ایک پولیٹیکل پروگرام بنانا چاہیے۔[۵] اقبال نے اشارہ کیا کہ ہندستان کے بعض حصوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ اسی وقت سے ان کے ذہن میں شمال مغربی ہندستان میں مسلم مرکزیت کا تصور پرورش پا رہا تھا، جو آگے چل کر خطبہ الٰہ آباد کی بنیاد بنا۔

۲

علامہ اقبال، اپنے رفقا کے ساتھ ۲ جنوری کو دہلی سے فرنٹیر میل کے ذریعے روانہ ہو کر براستہ بمبئی ۵ جنوری کو مدراس پہنچے۔ مدراس کے اکثر علما و فضلا اور زعما و رؤسا اسٹیشن پر استقبال کے لیے موجود تھے۔ ہجوم اتنا بڑا تھا کہ علامہ کے لیے گاڑی سے اترنا مشکل ہو گیا۔[۶]

یہاں کے تین روزہ قیام میں علامہ اقبال نے گوکھلے ہال میں مدراس کے اہلِ علم کے سامنے تین خطبات پیش کیے۔[۷] یہی خطبات میسور اور حیدر آباد دکن کے جلسوں میں بھی پڑھے گئے۔ جنوبی ہند کے اس پورے دَورے میں محمد عبداللہ چغتائی اور چودھری محمد حسین اقبال کے ہم رکاب رہے۔[۸]

ایک شاعر کے طور پر اقبال کی شہرت پورے برعظیم میں پھیل چکی تھی، چنانچہ اس سفر میں وہ جہاں بھی گئے، ان کی زبردست پذیرائی ہوئی اور عوام وخواص نے والہانہ انداز میں ان کا استقبال کیا۔ عام سادہ دل مسلمان اقبال سے کس درجہ عقیدت رکھتے تھے، اس کا اندازہ ڈاکٹر محمد عبداللہ

چغتائی کے ایک بیان سے لگایا جا سکتا ہے، وہ لکھتے ہیں: ہم بنگلور سے میسور کی طرف جا رہے تھے، راستہ بہت پُر فضا تھا۔ دریائے کاویری کے پل سے گزر کر جب ہم سڑک کا ایک موڑ مڑنے لگے تو چند اشخاص نے ہماری موٹر کو روک لیا۔ ان کے ہمراہ ایک بوڑھا سا شخص بھی تھا، جس کی بینائی بہت کمزور تھی۔ ان کے پاس ایک میلی سی چائے دانی اور چند معمولی سے پیالے تھے، چنانچہ انھوں نے نہایت عقیدت سے حضرت علامہ سے ملاقات کی اور آپ کی خدمت میں چائے پیش کی۔ بوڑھے شخص نے علامہ سے کہا کہ مَیں نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسے میں آپ کی نظم "نالۂ یتیم" سنی تھی، آج اتنے برسوں کے بعد بھی وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آج مَیں آپ سے ملاقات کر رہا ہوں۔ ہم لوگ ایک دُور افتادہ گاؤں میں رہتے ہیں اور آپ سے ملاقات کے لیے صبح سے یہاں آئے ہوئے ہیں۔[۹]

میسور پہنچ کر اقبال نے میسور یونی ورسٹی میں اہل علم کے سامنے پہلا خطبہ پیش کیا۔ اس جلسے کی صدارت یونی ورسٹی کے وائس چانسلر نے کی تھی۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں کہ علامہ کا مدراس کے لیکچروں کی دعوت قبول کرنے کا سب سے بڑا مقصد سلطان ٹیپو کے مقبرے کی زیارت کرنا تھا۔[۱۰] چنانچہ ۱۱ر جنوری کو اقبال رفقائے سفر کی معیت میں ٹیپو سلطان کا مقبرہ دیکھنے گئے۔ اندر داخل ہو کر سب سے پہلے انھوں نے یہ آیت تلاوت کی:

وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ.

(اور جو اللہ کی راہ میں مارے جائیں، انھیں مردہ نہ کہو! ایسے لوگ تو حقیقت میں زندہ ہیں، مگر تمھیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہوتا۔)

پھر اس قدر عقیدت، خلوص اور رِقّت سے قبر پر فاتحہ خوانی کی کہ اس کی کیفیت الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔ محمد عبداللہ چغتائی کہتے ہیں کہ فاتحہ خوانی کے بعد اسی کیفیت کے زیرِ اثر ہم برآمدے میں چپ چاپ بیٹھ گئے۔ ایک مقامی شاعر اور موسیقار علی جان نے موقع محل کی مناسبت سے چند اشعار ترنم سے پڑھے۔ علامہ کی آنکھیں پُرنم تھیں اور جسم پر لرزے کی کیفیت طاری تھی۔[۱۱]

بالِ جبریل (ص ۲۷) کی نظم "سلطان ٹیپو کی وصیت" بھی ٹیپو شہید کو نہایت عمدہ خراجِ تحسین ہے اور اس کے یہ اشعار ٹیپو سلطان کی شخصیت کی سچّی ترجمانی کرتے ہیں:

صبحِ ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے — جو عقل کا غلام ہو، وہ دل نہ کر قبول!
باطل دُوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے — شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

جاوید نامہ (ص۱۷۲) میں ٹیپو سلطان کا تعارف بایں الفاظ کرایا گیا ہے:

آں شہیدانِ محبت را امام   آبروے ہند و چین و روم و شام
نامش از خورشید و مہ تابندہ تر   خاکِ قبرش از من و تو زندہ تر
عشق رازے بود بر صحرا نہاد   تو ندانی جاں چہ مشتاقانہ داد
از نگاہِ خواجۂ بدر و حنین   فقر و سلطاں وارثِ جذبِ حسین
رفت سلطاں زیں سراے ہفت روز   نوبتِ او در دکن باقی ہنوز

اس کے بعد رودِ کاویری کو پیغام دیتے ہوئے سلطان شہید کی زبانی 'حقیقتِ حیات و مرگ و شہادت' پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کا ماحصل یہ شعر ہے:

زندگی را چیست رسم و دِین و کیش؟
یک دمِ شیری بہ از صد سالِ میش

ان اشعار سے اُس عقیدت و محبت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، جو اقبال کو سلطان شہید سے تھی۔

۳

میسور سے حیدر آباد ہوتے ہوئے علامہ اقبال ۱۹ر جنوری کو واپس لاہور پہنچے۔ ۱۹۲۹ء میں معمول کی مصروفیات کے باوجود علامہ نے مزید تین خطبے تیار کر لیے، جو نومبر ۱۹۲۹ء میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے علمی اجتماعات میں پیش کیے گئے۔[۱۲] اقبال کے یہ فلسفیانہ خطبات عام طور پر *Six Lectures* کے نام سے معروف ہیں، بعد ازاں ایک اَور خطبے کا اضافہ کیا گیا اور اب یہ ساتوں خطبے *The Reconstruction of Religious Thought in Islam* کے نام سے مطبوعہ صورت میں موجود ہیں۔[۱۳]

دیباچے میں خطبات کی غرض و غایت کے سلسلے میں اقبال کہتے ہیں کہ ان کا مقصد مسلم دینی فلسفے کی نئی تشکیل ہے اور یہ تشکیل اسی وقت ممکن ہے، جب ہم اسلام کی فلسفیانہ روایت کے ساتھ ساتھ مختلف علوم و فنون میں معاصرانہ صورتِ حال کو بھی پیشِ نظر رکھیں۔ ڈیڑھ صفحے کے مختصر دیباچے میں اقبال نے قارئین کو بڑے حکیمانہ انداز میں فکرِ انسانی کی ترقی کی طرف متوجہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایک غیر تقلیدی اور فراخ دلانہ طرزِ عمل اختیار کرنے کی تلقین کی ہے، کیونکہ کامیابی کے ساتھ آگے بڑھنے کا یہی مؤثر اور کارگر ذریعہ ہے۔

ان خطبات میں علامہ اقبال نے خدا، انسان، کائنات، مذہب، فلسفہ، شاعری، خودی، جبر و

قدر، حیات بعد الممات، تصوف، زمان و مکان، وجدان، عبادت، دعا، ثقافت، اجتہاد اور عرفان جیسے موضوعات پر فلسفیانہ انداز میں بحث کی ہے۔ وہ کسی مسئلے پر چند سوالات پیش کرتے اور پھر ان کے امکانی جوابات تلاش کرتے ہیں، مثلاً اس کائنات کی نوعیت کیا ہے؟ اس میں انسان کا مقام کیا ہے اور کائنات سے انسان کا رشتہ کیا ہے؟ اس ضمن میں اسلام کے علاوہ عیسائیت اور یونانی فلسفیوں کا نقطۂ نظر کیا ہے؟...... ایک جگہ صوفیانہ اور مذہبی تجربات و مشاہدات پر بحث کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ صوفیانہ تجربہ بھی حصولِ علم کا ایک مفید ذریعہ ہے اور فلسفہ محض ایک نظریہ ہے، جب کہ مذہب ایک زندہ تجربہ ہے۔ مذہب کو فلسفے پر اس لیے برتری حاصل ہے کہ اس کے عزائم فلسفے کے عزائم سے بلند تر ہوتے ہیں۔

اقبال کے نزدیک دعا اور عبادت انسانی فطرت کا تقاضا ہیں۔ سائنس خواہ کتنی ترقی کر جائے، انسان ہمیشہ دعا مانگتا رہے گا، کیونکہ اسے کسی بالاتر ہستی کی رفاقت اور معاونت کی طلب رہتی ہے۔ اسی سے انسان کو اطمینانِ قلب کی دولت میسر آتی ہے۔ دعا یا عبادت انسان کے باطن کی آرزو ہے اور یہ حصولِ علم اور حقیقت مطلق تک رسائی کا ذریعہ بھی ہے۔

خودی، فکرِ اقبال کا ایک اہم اور مرکزی نکتہ ہے۔ چوتھے خطبے میں علامہ نے کائنات میں انسان کی منفرد حیثیت اور مقام (unique individuality) کا ذکر کیا ہے۔ خودی کے سلسلے میں وہ عبدیت کو ناگزیر سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ خودی کی معراج یہ ہے کہ مشاہدۂ ذات کے باوجود عبودیت قائم رہے۔

اقبال نے خطبات میں اسلامی تہذیب و تمدن اور ثقافت پر بھی کلام کیا ہے۔ ان کے نزدیک اسلامی تہذیب کو سمجھنے سمجھانے کے لیے ختم نبوت کا عقیدہ اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلامی تہذیب کی روح حرکی ہے، اسی لیے یورپ کی ترقی کے بیشتر پہلوؤں میں اس کے اثرات موجود ہیں۔ انھی اثرات کی بدولت یورپ میں زندگی کی روشنی نمودار ہوئی؛ گویا اسلامی تہذیب کوئی جامد چیز نہیں ہے۔ یہ زمانے کی رَو کی نبض شناس ہے، بلکہ اس کا رُخ متعین کرنے میں بھی اس کا حصّہ ہے۔ اسلامی تہذیب کے اسی حرکی اصول کو انھوں نے اجتہاد کا نام دیا۔ اس سلسلے میں چھٹا خطبہ (الاجتہاد فی الاسلام یا اسلام میں اصولِ حرکت) سب خطبوں میں اہم ہے۔ اسے جملہ خطبات کی رُوح کہنا چاہیے۔ اسے علامہ نے سب سے پہلے لکھنا شروع کیا تھا اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سب سے زیادہ محنت بھی اسی خطبے پر کی۔ اقبال کے نزدیک اجتہاد ایک اسلامی اصول

اورفطرت کا تقاضا ہے۔ان کے بقول: اسلامی قانون کی اصطلاح میں [اجتہاد] کا معنی، وہ کوشش ہے، جو کسی قانونی مسئلے میں آزادانہ رائے قائم کرنے کے لیے کی جائے۔[۱۴] اقبال کہتے ہیں کہ جب انسانی زندگی جمود کا شکار ہونے لگتی ہے تو فطرت کا اصولِ تغیر و تبدل بروے کار آتا ہے اور اس طرح اجتہاد کا دَر وا ہوتا ہے۔ اس خطبے میں اقبال نے مسلم دنیا کے جمود کا ذکر کرتے ہوئے فقہی جمود کے تین بڑے سبب بتائے ہیں: عباسی دَور کی عقل پرستانہ تحریک، راہبانہ تصوف اور بغداد کی تباہی۔ اس جمود کو توڑنے کے لیے عالمِ اسلام میں جو بھی کاوشیں ہوئیں، اقبال نے انھیں سراہا ہے۔ اس ضمن میں وہ خصوصی طور پر ترکوں کے اجتہادی روّیوں کے مداح ہیں اور ترک دانش ور سعید حلیم پاشا کی تعریف کرتے ہیں۔ اقبال نے اسلامی فقہ کے چار اہم سرچشموں کا ذکر کیا ہے: (۱) قرآنِ حکیم، (۲) حدیثِ نبوی، (۳) اجماع، (۴) قیاس۔

خطبات میں اقبال نے انسانی زندگی کے لیے مذہب کی ضرورت، اہمیت اور افادیت کو مختلف دلائل سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ دَورِ حاضر کا انسان روحانی طور پر مردہ ہو چکا ہے۔ وہ روحانی ضروریات کو مادی تقاضوں پر قربان کر چکا ہے اور یہ زبوں حالی مغرب سے مشرق تک ہر جگہ مسلط ہے۔

اقبال کے خطبات پر مجموعی نظر ڈالیں تو احساس ہوتا ہے کہ وہ اسلامی فکر کی جدید توضیح و تشریح کے طالب ہیں اور اس ضمن میں وہ اسلاف سے اختلاف میں بھی کوئی حرج نہیں سمجھتے، کیونکہ ان کے نزدیک فلسفیانہ فکر میں قطعیت یا حتمیت (finality) نہیں ہوتی، اس لیے ہمارا طرزِ عمل تقلید اور جمود کا نہیں، اجتہاد، تحرک اور نقد و انتقاد کا ہونا چاہیے:

آئینِ نو سے ڈرنا ، طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں[۱۵]

ہم جوں جوں آگے بڑھتے ہیں، فکر کے تازہ افق نظر آتے ہیں اور نئے نئے راستے کھلتے جاتے ہیں۔

علامہ اقبال کے یہ خطبات ان کی بلند پایہ عالمانہ فکر اور فلسفیانہ بصیرت کے ترجمان اور ان کی خوب صورت انگریزی نثر کا شاہکار ہیں، مگر ان میں کہیں کہیں ابہام محسوس ہوتا ہے، چنانچہ خطبات سے دلچسپی رکھنے والے بیشتر اہلِ علم کا احساس یہ ہے کہ خطبات کے فلسفیانہ مباحث کو بار بار سمجھنے سمجھانے اور اس کے مزید گہرے مطالعے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال کے خیال میں خطبات کا اندازِ تحریر نہایت پیچیدہ ہے۔ انگریزی زبان میں استدلال نا قابلِ فہم ہے اور اس کے بار بار تعارف کرنے سے بھی معانی صاف نہیں ہوتے۔[۱۶] خطبات کے پیچیدہ اندازِ تحریر اور مشکلات کا احساس خود علامہ اقبال کو بھی تھا۔ انھوں نے عباس آرام کے نام ایک خط میں واضح کیا ہے کہ ان خطبات کو سمجھنے کے لیے جدید سائنس اور فلسفے میں حالیہ ترقی اور پیش رفت سے آشنائی ضروری ہے۔[۱۷]

خطبات پر مذہبی نقطۂ نظر سے اعتراضات بھی کیے گئے ہیں، خصوصاً علامہ کا جنت اور دوزخ کو 'کیفیات' (نہ کہ مقامات) قرار دینا۔ مصری مصنف محمد البہی نے بھی خطبات کے بعض تسامحات پر تنقید کی ہے۔ غالباً اسی لیے مولانا ابوالحسن علی ندوی نے لکھا ہے کہ خطبات میں اقبال کے بعض افکار و خیالات ایسے ہیں، جن کی تاویل یا توجیہ نہیں کی جا سکتی اور اسی لیے سید سلیمان ندوی نے فرمایا تھا کہ یہ لیکچر شائع نہ ہوتے تو اچھا تھا۔[۱۸] یہ امر پیش نظر رہنا چاہیے کہ علامہ کی نظر میں یہ خطبات حرفِ آخر نہیں تھے۔

یکم مارچ ۱۹۳۳ء کو اقبال نے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں جو تقریر کی، اس سے بھی خطبات پر نظر ثانی کا عندیہ ملتا ہے۔ علامہؒ نے کہا: ''میں نے اپنی زندگی کے گذشتہ ۳۵ سال اسلام اور موجودہ تہذیب و تمدن کی تطبیق کی تدابیر کے غور و فکر میں بسر کر دیے ہیں اور اس عرصے میں یہی میری زندگی کا مقصد وحید رہا ہے۔ میرے حال کے سفر نے مجھے کسی حد تک اس نتیجہ پر پہنچا دیا ہے کہ ایسے مسئلے کو اس شکل میں پیش نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اس کا مطلب بجز اس کے کچھ نہیں کہ اسلام موجودہ تمدن کے مقابلے میں ایک کمزور طاقت ہے۔ میری رائے میں اس کو یوں پیش کرنا چاہیے کہ موجودہ تمدن کو کس طرح اسلام کے قریب تر لایا جائے۔''[۱۹] خطبات کے دیباچے میں تو انھوں نے واشگاف انداز میں یہ کہہ ہی دیا تھا کہ فلسفیانہ غور و فکر میں قطعیت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔[۲۰]

۴

دراصل ان خطبات کی اہمیت یہ ہے کہ ایک ایسے زمانے میں، جب بقول مولانا مودودی: اسلامی فکر و نظر اور دستورِ حیات پر مغرب کی یلغار نے دنیائے اسلام میں بڑی انقلاب انگیز شکل اختیار کر لی تھی اور اس پر ہلچل برپا تھی، اقبال نے ان خطبات کے ذریعے اسلامی عقائد، اسلامی نظامِ فکر و عمل کو از سرِ نو مرتب کرنے اور تہذیب و تمدنِ اسلامی کے مختلف عناصر کی از سرِ نو بازیافت کی کوشش کی...... اس طرزِ خاص کے لٹریچر میں مقدمۃ الجیش کی حیثیت سے اس کی قدر نا قابلِ

انکار ہے۔[۲۱] یہ تقریباً وہی بات ہے، جو علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں یوسف سلیم چشتی سے گفتگو کرتے ہوئے کہی تھی: ''دراصل میری یہ کتاب آئندہ فلسفۂ اسلام پر قلم اٹھانے والوں کے لیے ایک مقدمے کا کام دے گی۔''[۲۲]

خطبات میں علامہ اقبال نے ایک بلند پایہ متکلم کے طور پر قارئین کو حسب ذیل نکات کی طرف متوجہ کیا ہے:

۱۔ انسانی شعور کی بیداری کے لیے باطنی مشاہدہ ضروری ہے، جس کا سرچشمہ قلبِ انسانی ہے۔ باطنی مشاہدے میں دعا اور عبادت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

۲۔ کائنات اور زندگی کا مزاج تغیّر و تبدل اور تحرک و پیش رفت کا ہے، لہٰذا مسلم دنیا کو جمود اور ذہنی غلامی کو ترک کر کے اجتہاد کی راہ اپنانی چاہیے۔ یہ انسانی خودی کا ایک بڑا مظہر ہے۔

۳۔ انسانیت کے دُکھوں اور امراض کا علاج مذہب ہی سے ممکن ہے۔ مذہب زندگی کی بقا کے لیے ناگزیر ہے اور مذہب کو فلسفے پر فوقیت حاصل ہے۔

علامہ اقبال نے عصر حاضر کی فکری و ذہنی استعداد ملحوظ رکھتے ہوئے خطبات میں انھی نکات کی وضاحت کی ہے۔

قریبی زمانے میں مطالعۂ خطبات کے رجحان میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ اس ضمن میں بعض اصحاب نے مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے، خطبات کو اقبال کی شاعری پر برتر اور فائق قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اقبال کا اصل کارنامہ شاعری نہیں، خطبات ہیں۔ ہمارے خیال میں اقبال کے اصل کارنامے کی بازیافت ان کی شاعری اور خطبات، یعنی نظم و نثر دونوں کے مطالعے اور ربط و ارتباط کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ اقبال عقل و عشق، دونوں کو اہم سمجھتے ہیں اور تکمیل حیات کے لیے دونوں کو ناگزیر قرار دیتے ہیں:[۲۳]

زیرکی از عشق گردد حق شناس — کارِ عشق از زیرکی محکم اساس
عشق چوں با زیرکی ہم بر شود — نقش بندِ عالمِ دیگر شود
خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ — عشق را با زیرکی آمیز دہ[۲۴]

حوالے اور حواشی

۱۔ مقالاتِ ممتاز، ص ۳۰۹

۲۔ اقبال کی صحبت میں، ص ۳۰۰-۳۰۱؛ نیز اقبال نامہ، ص ۱۵۰، جہاں مصنف کا نام Nicolas P. Aghnides بتایا گیا ہے۔

۳۔ زندہ رُود، باب ۱۶؛ نیز اقبال کی صحبت میں، ص ۳۰۲-۳۰۴۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۲۴ء کو اقبال نے چودھری محمد حسین کو لکھا: ''مضمون اجتہاد آج ٹائپ ہو کر تیار ہو گیا ہے۔ ۳۲ ٹائپ شدہ صفحات ہیں۔'' (علامہ اقبال اور چودھری محمد حسین، ص ۹۱) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدائی صورت میں یہ مضمون خاصا طویل تھا۔

۴۔ دیکھیے: اس زمانے کے خطوطِ اقبال بنام سید سلیمان ندوی، مشمولہ اقبال نامہ، ص ۱۱۰-۱۹۷

۵۔ گفتارِ اقبال، ص ۴۳

۶۔ نقوش، اقبال نمبر اوّل، ستمبر ۱۹۷۷ء، ص ۵۵۲

۷۔ تصانیفِ اقبال، ص ۳۱۵۔ اقبال کی صحبت میں، ص ۳۲۲-۳۲۶

۸۔ اس سفر کی تفصیل کے لیے دیکھیے: اقبال کی صحبت میں، ص ۳۰۷-۳۰۹ اور ص ۳۱۹-۳۲۰؛ نیز محمد عالم مختار حق کا مضمون ''علامہ اقبال کے سفر کی رُوداد اور خطبات''، مشمولہ نقوش، اقبال نمبر اوّل، ستمبر ۱۹۷۷ء

۹۔ اقبال کی صحبت میں، ص ۳۳۴

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۳۶

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۳۶، ۳۴۹

۱۲۔ اس کی تفصیل اصغر عباس کی کتاب سرسید، اقبال اور علی گڑھ، ص ۱۴-۱۷ میں دیکھیے۔

۱۳۔ خطبات کا پہلا اڈیشن چھے خطبوں پر مشتمل تھا اور اپریل ۱۹۳۰ء میں لاہور میں چھپا تھا۔ دوسرا اڈیشن ایک نئے خطبے کے اضافے کے ساتھ اوکسفر ڈیونی ورسٹی پریس، لندن سے ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۸۶ء میں پروفیسر سعید شیخ نے خطبات کا ایک تحقیقی اڈیشن تیار کیا تھا، جو صحت متن اور تحقیقی حواشی کی بنا پر ایک معتبر اڈیشن ہے اور مطالعہ و تحقیق کے لیے سب سے کار آمد اور مفید ہے۔

۱۴۔ *Reconstruction*، ص ۱۱۷

۱۵۔ بانگِ درا، ص ۱۷۴

۱۶۔ زندہ رُود، ص ۴۳۵

۱۷۔ *Iqbal and Tagore*، ص ۷۴

۱۸۔ نقوشِ اقبال، ص ۴۰

۱۹۔ گفتارِ اقبال، ص ۱۶۸-۱۶۹

۲۰۔ دیباچہ: *Reconstruction*

۲۱۔ اقبال اور مودودی، ص ۷۲

۲۲۔ مجالسِ اقبال، ص ۸۵

۲۳۔ اقبالیات: تفہیم و تجزیہ، ص ۵۶-۵۷

۲۴۔ جاوید نامہ، ص ۶۵

☆ حال ہی میں ڈاکٹر جاوید اقبال کی تازہ تصنیف: خطباتِ اقبال: تسہیل و تفہیم شائع ہوئی ہے (سنگ میل، لاہور، ۲۰۰۸ء)۔ خطبات کو سمجھنے کے لیے، اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔

(۱۵)

جہانِ تازہ کی، افکارِ تازہ سے ہے نمود

پنڈت موتی لال نہرو، کانگرس کے بااثر اور سینیر راہ نما تھے۔ انھوں نے محمد علی جناح کو یقین دلایا تھا کہ مسلم لیگ جداگانہ انتخاب کے مؤقف سے دستبردار ہو جائے تو وہ دہلی تجاویز (مارچ ۱۹۲۷ء) کے مطابق مسلمانوں کو تمام مراعات دلوانے اور انگریزوں سے ان کے جملہ مطالبات منوانے کے لیے تیار ہیں، مگر نہرو رپورٹ (اگست ۱۹۲۸ء) سراسر اس کے برعکس نکلی۔ کانگرس کا انتہا پسند اور مسلمانوں سے شدید عصبیت رکھنے والا عنصر اس قدر مؤثر اور طاقت ور تھا کہ اس نے جداگانہ شناخت، سیاسی حقوق اور مذہبی حیثیت سے متعلق مسلمانوں کے جملہ مطالبات کو سبوتاژ کر دیا۔

۱

علامہ اقبال کی سیاسی بصیرت قابلِ داد ہے کہ انھوں نے ابتدا ہی سے جداگانہ انتخاب کا اصولی مؤقف اپنایا اور کسی وقتی اور موہوم فائدے کی خاطر اصولوں سے دستبردار نہیں ہوئے۔ علامہ کے اس طرزِ عمل سے دو باتوں کا پتا چلتا ہے، اوّل: ان کے نزدیک مسلمانوں کا ملّی تشخص ہر طرح کی منفعت اور مراعات سے بالاتر تھا، دوم: وہ ہندوؤں کی ذہنیت کا بخوبی ادراک رکھتے تھے۔

پنجاب مسلم لیگ کا ایک اجلاس یکم مئی ۱۹۲۷ء کو برکت علی محمڈن ہال، لاہور میں منعقد ہوا، جس میں مخلوط انتخاب کے خلاف علامہ اقبال کی پیش کردہ قرارداد منظور کر لی گئی۔[۱] نہرو رپورٹ میں مسلمانوں کے اس مطالبے پر غور کرنے کے بجائے مخلوط انتخاب پر اصرار کیا گیا تھا۔ منطق یہ تھی کہ "جداگانہ انتخاب" سے فرقہ وارانہ جذبات بیدار ہوتے ہیں۔[۲] نہرو رپورٹ میں سندھ، سرحد اور بلوچستان کو مستقل صوبے بنانے، مرکزی اسمبلی میں ۳۳ فیصد نمائندگی اور بنگال میں نشستوں کے تحفظ جیسے مطالبات کو بھی رَد کر دیا گیا تھا۔ اس زمانے میں محمد علی جناح یورپ میں تھے۔ واپسی پر انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کی ازسرِ نو کوشش کی، مگر ان کی کوششوں کو بھی ہندو مہاسبھا نے ناکام بنا دیا۔

علامہ اقبال ہمیشہ سے قائل رہے کہ رواداری اور ہم آہنگی ہی ہندو مسلم اتحاد کا واحد راستہ

ہے۔ وہ ہمیشہ، ہر موقع پر اس کے لیے کوشاں رہے، مگر فریقِ ثانی کا طرزِ عمل ہمیشہ حوصلہ شکن رہا تھا، بایں ہمہ وہ مایوس نہیں ہوئے۔ ہندستان میں مسلمانوں کے مستقبل پر وہ برابر غور و فکر کرتے رہے۔

دسمبر ۱۹۲۸ء کے اوائل میں روزنامہ انقلاب، لاہور میں مرتضیٰ احمد خان میکش کا ایک مفصل مضمون قسط وار شائع ہوا، جس کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ ہندو مسلم مناقشات اور ہندستان کی سیاسی الجھنوں کا واحد حل یہ ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کے لیے الگ وطن قائم کیا جائے۔ دراصل یہ تجویز علامہ اقبال کی تھی، جسے میکش نے تحریری رُوپ دے کر اپنے نام سے شائع کر دیا تھا۔ اس کا انکشاف، بعد ازاں عبدالمجید سالک نے کیا۔ انھوں نے اپنے بیٹے عبدالسلام خورشید کے ایک استفسار پر بتایا: ''علامہ اس وقت بھی مسلم مملکت کے قیام ہی کو ہندو مسلم مسئلے کا حل سمجھتے تھے، لیکن مسلم لیگ سے وابستگی کی بنا پر، اس حالت میں نہیں تھے کہ [اپنے نام سے] یہ تجویز عوام میں پیش کرتے، اگر کرتے تو باقی مسلم قیادت سے ان کا رابطہ ٹوٹ جاتا۔''[۳]

کلکتہ کنونشن (دسمبر ۱۹۲۸ء) میں ہندو مہاسبھا نے محمد علی جناح کی تمام تجاویز رَدّ کر دیں، حالانکہ وہ مخلوط انتخاب قبول کرنے کے لیے آمادہ تھے، چنانچہ ہندوؤں کے روّیے نے انھیں ہندو مسلم مفاہمت سے بالکل مایوس کر دیا۔[۴] اسی موقع پر کانگرس کے سابق صدر مولانا محمد علی جوہر سے بھی نہایت توہین آمیز سلوک کیا گیا، چنانچہ وہ کلکتہ سے دہلی پہنچے اور آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں شریک ہو کر جداگانہ انتخاب کی حمایت کر دی۔[۵] کلکتہ کنونشن کے شر سے ایک اَور خیر یہ برآمد ہوا کہ مسلم لیگ کے دونوں دھڑوں کے اتحاد کی صورت گری ہونے لگی۔ محمد علی جناح نے مارچ ۱۹۲۹ء میں دہلی کے مسلم لیگ اجلاس میں چودہ نکات پیش کیے[۶] اور کانگرس نے حسب سابق انھیں ''فرقہ وارانہ'' قرار دیتے ہوئے رَدّ کر دیا، اس کے نتیجے میں لیگ کے دونوں دھڑے رفتہ رفتہ قریب آتے گئے اور بالآخر متحد ہو گئے۔

۲

۱۹؍ دسمبر ۱۹۲۹ء کو برکت علی اسلامیہ ہال میں منعقدہ ایک جلسے میں علامہ اقبال نے ایک بار پھر مسلمانوں کو فہمائش کرتے ہوئے آپس میں اتحاد اور اتفاق کی تلقین کی۔ انھوں نے فرمایا کہ:

آپ اگر اپنی حالت پر غور نہیں کرتے تو خدا کے لیے آنے والے مسلمانوں کے تحفظ کے لیے کچھ کریں...... پہلے مسلمان آپس میں اتحاد کریں اور پھر ہندو مسلم کا اتحاد ہو گا۔[۷]

مارچ ۱۹۳۰ء میں گاندھی نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی۔ جون ۱۹۳۰ء میں سائمن کمیشن کی رپورٹ بھی

شائع ہوگئی۔ علامہ اقبال اور سر ذوالفقار علی خاں نے ایک مشترکہ بیان میں رپورٹ کو مایوس کن قرار دیا۔ اس اثنا میں حکومتِ برطانیہ نے اکتوبر ۱۹۲۹ء میں لندن میں ایک گول میز کانفرنس بلانے کا اعلان کر دیا۔ غالباً علامہ اقبال کے سخت موّقف کی وجہ سے انھیں کانفرنس میں مدعو نہیں کیا گیا۔ اگر دعوت ملتی، تب بھی شاید وہ معذرت ہی کرتے، کیونکہ انھوں نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (متوقع انعقاد: ستمبر) میں شرکت کا وعدہ کر رکھا تھا۔ انھیں خدشہ تھا کہ یہ گول میز کانفرنس بے نتیجہ رہے گی اور ہوا بھی یہی کہ اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا ــــ یہ تھا پس منظر؛ ہندستانی سیاست کا، جب مسلم لیگ نے لکھنؤ میں اپنا سالانہ اجلاس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کی صدارت کے لیے علامہ اقبال کو دعوت دی گئی۔ [۸]

علامہ ہندستانی سیاست، ہندو مسلم تعلقات اور مسلمانوں کے مستقبل پر سالہا سال سے غور و فکر کرتے چلے آرہے تھے۔ اب انھوں نے سوچا: ان حالات میں اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کا یہ اچھا موقع ہے، چنانچہ جولائی ۱۹۲۹ء میں انھوں نے مذکورہ اجلاس کے لیے صدارتی خطبہ لکھنا شروع کر دیا۔ [۹]

اسی اثنا میں علامہ اقبال کو ایک اَور خیال سوجھا۔ ان کی تحریک پر روزنامہ انقلاب کے ذریعے سے ''شمالی ہند کے مسلمانوں کی کانفرنس'' کی تجویز سامنے آئی۔ لاہور کے مسلم اکابر نے نہ صرف اس کی تائید کی، بلکہ مجلس استقبالیہ قائم کر کے کانفرنس کے انعقاد کے لیے عملاً تیاری شروع کر دی۔ نام 'آل انڈیا مسلم کانفرنس' اور انعقاد دسمبر میں طے پایا۔ بعدازاں علامہ کی مصروفیات کے پیشِ نظر جنوری ۱۹۳۱ء کا آخری ہفتہ مقرر ہوا۔ عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں: ''یہ کانفرنس حقیقت میں پاکستان کا پیش خیمہ تھی۔'' [۱۰]

اس زمانے میں مسلم لیگ کی تنظیمی صورتِ حال خاصی ابتر تھی۔ اگرچہ لیگ کے دونوں دھڑے متحد ہو چکے تھے، مگر لیگ کے عام اراکین اور مختلف عہدے داروں کی عدم دلچسپی کے سبب ۱۹۲۹ء میں سالانہ اجلاس ہی منعقد نہ ہو سکا۔ [۱۱] کئی ماہ تک معتمد اعزازی کا عہدہ خالی رہا۔ ملک بھر میں ممبران کی تعداد صرف دو ہزار تھی۔ [۱۲] اور ان کی اکثریت بھی غیر فعال تھی۔ محمد علی جناح انھی ''ہمرہانِ سست عناصر'' اور ہندستانی سیاست سے بددل ہو کر انگلستان چلے گئے تھے اور غالباً وہاں بس جانے کے خیال سے ذاتی مکان بھی خرید لیا تھا۔ مسلم لیگ کی ابتری اور انتشار و افتراق کا ذکر کرتے ہوئے سید نور احمد لکھتے ہیں کہ مسلم لیگ کا پلیٹ فارم، طفلانہ حرکتوں کا میدان بن گیا تھا۔ [۱۳]

اس مایوس کن صورتِ حال کے باوجود، علامہ اقبال مسلمانوں کا مستقبل سنوارنے کے لیے

پُرعزم تھے اور اسی لیے انھوں نے لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت قبول کی تھی، (اب یہ اجلاس لکھنؤ کے بجائے الٰہ آباد میں ہو رہا تھا) مگر حصولِ مقاصد کے لیے محض مسلم لیگ کا پلیٹ فارم کافی نہ تھا، مزید، مسلسل اور پیہم کوششوں کی ضرورت تھی۔ علامہ اقبال نے اسی لیے 'آل انڈیا مسلم کانفرنس' کا ڈول ڈالا تھا۔

۳

سر شیخ عبدالقادر اور ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی بھی اقبال کے ہم سفروں میں شامل تھے۔ ۲۸ر دسمبر ۱۹۳۰ء کو یہ قافلہ لاہور سے الٰہ آباد روانہ ہوا۔ مزاجاً علامہ اقبال ہنگاموں، جلوسوں اور شور و شغب سے گھبراتے تھے، چنانچہ بہت پہلے جب لکھنؤ جانے کا پروگرام بنا تھا تو انھوں نے میزبانوں کو لکھ دیا تھا کہ میرے استقبال کے لیے کسی قسم کی تیاری نہ کی جائے اور میرے لکھنؤ پہنچنے کے وقت سے کسی کو بھی آگاہ نہ کریں[۱۴] لیکن اقبال کے مداح اس طرح کی ہدایات کو خاطر میں لانے والے نہیں تھے، چنانچہ احمد الدین مارہروی کے مشاہدے کے مطابق الٰہ آباد ریلوے اسٹیشن پر علامہ اقبال کے استقبال کے لیے تمام شہر اُمڈ آیا تھا۔ ان میں کچھ ہندو بھی شامل تھے۔ اسٹیشن کے باہر بھی تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ ہر شخص اقبال کو ایک جھلک دیکھنا چاہتا تھا۔ بعض استقبالیہ گروہ بھی موجود تھے۔

الٰہ آباد یونی ورسٹی کے مسلم طلبہ ایک تہنیتی نظم اور اسلامیہ سکول کے بچے ملّی ترانہ گا کر پڑھنا چاہتے تھے، مگر انھیں اس کا موقع ہی نہ ملا، بلکہ دھینگا مشتی میں دو طلبہ کے بازو ٹوٹ گئے، تاہم الٰہ آباد کے قصابوں نے بڑے منظم اور پُرجوش انداز میں استقبال کیا۔ اپنی روایت کے مطابق یہ لوگ جلوس کے موقع پر لاٹھیاں لے کر ایک دستے کی شکل میں چلتے اور معمولی وقفے کے بعد کمال ہم آہنگی سے ان کو نعرۂ تکبیر کے ساتھ اس زور سے سڑک پر مارتے کہ نہ صرف زمین دھمک جاتی، بلکہ سننے والوں کے دل کی حرکت بھی ایک ساعت کے لیے رُک جاتی تھی، چنانچہ ان لوگوں نے نعرۂ تکبیر کے ساتھ پورے پلیٹ فارم کو متزلزل کر دیا۔ ناواقف لوگ گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوئے اور مجمع میں وقتی طور پر ایک تلاطم سا برپا ہو گیا۔ علامہ قدرے مسکرائے۔ ریل گاڑی کی چھت پر کھڑا ہوا ایک نوجوان دُوربین لیے رواں تبصرہ کر رہا تھا، جب اس نے اعلان کیا کہ شاعرِ اعظم مسکرا رہے ہیں تو لوگوں کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔[۱۵] ـــــ استقبال کے اس منظر کو تصور میں لائیے ـــــ شاید آپ بھی مسکرا دیں گے۔

الٰہ آباد میں علامہ کو نواب سر محمد یعقوب کے مکان پر ٹھہرایا گیا۔[۱۶]

اجلاس ۲۹ر دسمبر کو صبح گیارہ بجے دوازدہ منزل، واقع محلہ یاقوت گنج میں شروع ہوا۔[۱۷] ابتدا میں حاضرین کی تعداد خاصی کم تھی، رفتہ رفتہ لوگ آتے گئے اور صحن بھرتا گیا، پھر بھی سامعین کی تعداد پانچ چھے سو سے زیادہ نہ ہوگی۔ یہ غنیمت ہے کہ دوسرے شہروں سے مسلم لیگ کے بعض راہ نما آ گئے تھے، مثلاً میرٹھ سے نواب محمد اسماعیل خان، کراچی سے سیٹھ عبداللہ ہارون، سندھ سے مولانا عبدالمجید سندھی اور بدایوں سے مولانا عبدالماجد وغیرہ۔ سید محمد حسین کے استقبالیہ کلمات کے بعد علامہ اقبال نے انگریزی میں خطبہ پڑھنا شروع کیا، جس کی مطبوعہ کاپیاں سامعین میں تقسیم کر دی گئی تھیں۔

۴

علامہ اقبال کا یہ خطبہ اپنے مفاہیم و مطالب کے اعتبار سے بہت اہم ہے اور جس موقعے پر یہ پیش کیا گیا، اس کے اعتبار سے اس کی حیثیت بہت تاریخی بنتی ہے۔ اس کے اہم نکات کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ اسلام کی انفرادی اور امتیازی حیثیت کو واضح کرتے ہوئے اقبال نے کہا کہ اسلام میں خدا اور کائنات، روح اور مادہ، کلیسا اور ریاست ایک کل کے مختلف اجزا ہیں...... اسلام اب بھی ایک زندہ قوت ہے، جو اسلام کے تصور کو جغرافیائی حدود سے آزاد کر سکتی ہے۔ [میرا] یہ عقیدہ ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست کی زندگی میں بے انتہا اہمیّت حاصل ہے اور [میرا] ایمان ہے کہ اسلام بجائے خود تقدیر ہے، اسے کسی دوسری تقدیر کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ کیا مذہب فرد کا ذاتی معاملہ ہے؟ اس سوال پر بحث کرتے ہوئے اقبال نے واضح کیا کہ اسلام اور دیگر مذاہب میں مذہب کی نوعیت و حیثیت اور اس کے دائرۂ کار میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ کہتے ہیں: جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، مذہب فقط فرد کا ذاتی معاملہ نہیں ہے۔ اسلام ایک کل ہے، جو ساری زندگی کو محیط ہے۔ اسلام دین اور سیاست کی دوئی کا قائل نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام صرف اخلاقی ہی نہیں، ایک سیاسی نصب العین بھی رکھتا ہے۔ وہ اپنی ثقافت اور روایات کی آزادانہ نشو و نما کے ساتھ اپنے نظامِ سیاست کو بھی بروے کار دیکھنا چاہتا ہے۔

۳۔ ہندستانی سیاسیات اور ہندو مسلم تعلقات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اقبال نے کہا کہ ہندستانی قوم کا اتحاد ہی برطانوی غلامی سے نجات کی بنیاد بن سکتا ہے، اس لیے ہندو مسلم اتحاد وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اقبال نے کانگرس اور ہندوؤں کا نام لیے بغیر کہا کہ انھیں یہ مطالبہ نہیں کرنا چاہیے کہ مسلمان اپنی انفرادی حیثیت کو ترک کر کے ہندستانی قومیت میں اپنے

آپ کو گم کردیں۔ انھوں نے کہا کہ ہندستانی قوموں کا اتحاد جماعتوں کی نفی سے نہیں، بلکہ ان کے باہمی اشتراک اور ہم آہنگی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ علامہ نے ہندستان کے مختلف گروہوں اور فرقوں کو مشورہ دیا کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف تنگ نظری اور معاندانہ رویّے سے اجتناب کریں، کیونکہ فرقہ پرستی بدخواہی کے مترادف ہے۔ خود اپنے بارے میں علامہ نے کہا کہ مَیں دوسری قوموں کے رسوم، قوانین، معاشرتی اور مذہبی اداروں کا بے حد احترام کرتا ہوں۔ یہی نہیں، بلکہ قرآن پاک کی تعلیم کے مطابق ضرورت پڑے تو ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت بھی میرا فرض ہے۔

۴۔ اس تاریخی خطبے میں اقبال نے متعدد آئینی مسائل اور سیاسی امور پر اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کیا اور بڑے خلوص کے ساتھ چند تجاویز پیش کیں، مثلاً یہ کہ صوبے خود مختار ہوں اور وفاقی حکومت کے پاس صرف ایسے اختیارات ہوں، جنھیں صوبے اپنی رضامندی سے ان کے سپرد کریں۔ سائمن کمیشن اور گول میز کانفرنس پر بھی انھوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

۵۔ اقبال نے جداگانہ انتخابات کو مسلمانوں کے لیے ضروری، بلکہ ناگزیر قرار دیا۔

۶۔ مسلمانوں کے اس مطالبے کو کہ ہندستان کے اندر ایک مسلم ہندستان قائم کیا جائے، اقبال نے حق بجانب قرار دیا۔ شاید یہی اس خطبے کا سب سے اہم نکتہ تھا، جسے اقبال نے ٹھوس دلائل کے ساتھ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ میری خواہش ہے کہ پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبے، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک ریاست بنا دیا جائے...... یہ ریاست سلطنتِ برطانیہ کے اندر حکومتِ خود اختیاری حاصل کرے یا اس کے باہر، ہندستان کے شمال مغربی مسلمانوں کا، آخر کار مقدر ہے...... یہ مربوط ریاست غیر مسلموں کے حقوق کی حفاظت بہتر طریق سے کر سکے گی۔ اس تحریک سے نہ ہندوؤں کو پریشان ہونا چاہیے، نہ انگریزوں کو...... اسلام کو بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کر سکیں۔

خطبے کی نوعیت زیادہ تر علمی تھی، تاہم ایک مسلم ہندستان کی تجویز پر سب نے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ احمد الدین مارہروی کہتے ہیں کہ ہماری زبان سے بے ساختہ سبحان اللہ نکلا اور ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ علامہ کا چہرہ دمک اٹھا اور گردن کے اشارے سے انھوں نے یہ داد قبول فرمائی۔[۱۸]

دلچسپ بات یہ ہے کہ بیشتر سامعین کو اس خطبے کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہوا۔ جونہی خطبہ ختم ہوا اور علامہ ابھی بیٹھے بھی نہ پائے تھے کہ حاضرین نے یک زبان ہو کر شعر خوانی کا مطالبہ کر دیا۔ اقبال کا یہ مزاج نہ تھا اور نہ شعر خوانی کا یہ موقع تھا، لیکن جب بہت اصرار ہوا تو انھوں نے

بادلِ نخواستہ خودی کے متعلق چند اشعار سنائے۔ لوگوں نے پھر مطالبہ کیا تو علامہ نے بڑے تحمل اور خلوص کے ساتھ کہا کہ اب مَیں آپ کو ایک حدیث سناؤں گا اور اگر آپ نے اس پر غور کیا تو قوم کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ پھر فرمایا: من عرف نفسهٗ فقد عرف ربه (جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا، اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔) اتنا کہہ کر علامہ بیٹھ گئے۔[۱۹] یہ تو عوام کا حال تھا، خواص بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھے، کیونکہ نہ تو اس جلسے میں موجود خواص میں سے بقول چودھری خلیق الزماں: ''کسی ایک فردِ واحد نے بھی اس کا کوئی نوٹس نہ لیا، نہ کسی نے اپنی تقریر میں اس کی تائید میں کوئی تجویز پیش کی اور ہوتی کیسے؟...... مسلم لیگ محض زمینداروں، تعلقہ داروں اور خطاب یافتوں کا ایک سودمند گہوارہ تھا۔''[۲۰]

اخبارات نے بھی اسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ مقامی اخبار لیڈر نے بھی کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔[۲۱] بعض اخبارات نے خطبے کی صرف چند سطریں شائع کیں۔ سٹار نے اقبال کے خیر مقدمی جلوس اور جلسے کا حال تفصیل سے شائع کیا، مگر اس کی اشاعت ۲۰۰ بھی نہ تھی۔[۲۲]

علامہ نے اپنے خطبے کے شروع میں یہ کہا تھا کہ مَیں کسی پارٹی کی لیڈری کا دعویٰ نہیں کرتا اور نہ کسی لیڈر کی پیروی کرتا ہوں۔ مَیں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسلام، اس کے قوانین، سیاست و ثقافت اور تاریخ و ادب کے مطالعے میں صرف کیا ہے۔[۲۳] اس طرح علامہ اقبال نے اپنے تئیں یہ خطبہ بڑے خلوص کے ساتھ اور اس نیت کے ساتھ پیش کیا تھا کہ ہندستانی سیاست کے سارے گروہ صورتِ حال پر غور کر کے مسائل کا قابلِ قبول حل نکالیں۔ یہ ان کی بڑائی تھی کہ انھوں نے کسی کے خلاف کوئی منفی بات نہیں کی اور سب کو مشورہ دیا کہ وہ تعصبات سے بالاتر ہو کر آپس میں اتحاد پیدا کریں، کیونکہ سب کے لیے نجات کا یہی راستہ ہے۔ لیکن ہر معاملے کو تعصب کی نگاہ سے دیکھنے والوں نے اقبال کی ان پُرخلوص تجویزوں کو گروہی عصبیت کی نظر سے دیکھا اور خطبۂ الٰہ آباد پر بے جا اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی، مثلاً یہ کہا گیا کہ اقبال کو گول میز کانفرنس میں نہیں بلایا گیا، اس لیے انھوں نے کانفرنس سبوتاژ کرنے کی کوشش کی ہے یا اقبال نے متحدہ قومیت کی جڑوں پر کلھاڑا چلا دیا ہے، وغیرہ۔ ہندو پریس نے تو گالم گلوچ اور بہتان تراشی کی حد کر دی۔ ان کی اس زہرافشانی، سب و شتم اور تہمت تراشیوں سے عام مسلمانوں کو بھی ہندوؤں کے تعصب کا اندازہ ہو گیا، بلکہ اس سے اقبال کے خطبۂ الٰہ آباد کی اہمیت مزید اجاگر ہو گئی۔[۲۴]

۵

یہاں بقول عبدالسلام خورشید: اس ''غلط العام تصور کی تردید'' مناسب ہوگی کہ علامہ اقبال نے خطبہ الٰہ آباد میں پاکستان کی خودمختار مسلم مملکت کے قیام کا مطالبہ کیا تھا۔ بلاشبہ انھوں نے کہا تھا کہ برطانوی حکومت کے اندر یا باہر، ایک مسلم ریاست کا قیام، کم ازکم شمال مغربی ہندستان کے مسلمانوں کا مقدر ہے، مگر جیسا کہ علامہ نے ڈاکٹر تھامپسن کے جواب میں وضاحت کی کہ یہ مطالبہ نہیں تھا، ایک طرح کی پیش گوئی تھی۔ اقبال اپنی سیاسی بصیرت کی بنا پر کہہ رہے ہیں کہ مستقبل میں ایسا ہوکر رہے گا۔[۲۵]

اقبال نے خطبے میں ''پاکستان'' کا نام نہیں لیا، مگر ان کی تجویز میں ''پاکستان'' کی روح موجود ہے۔ ویسے لفظ ''پاکستان'' تو قراردادِ لاہور میں بھی موجود نہیں۔[۲۶] لہٰذا اگر کچھ لوگوں نے اسے خودمختار اسلامی ریاست کا مطالبہ سمجھا تو یہ کچھ غلط بھی نہ تھا۔ ۱۷ رسال بعد، ان کی وہ پیش گوئی پوری ہوئی، جس پر ہندو ہی نہیں، برطانیہ کے وزیراعظم ریمزے میک ڈانلڈ بھی سخت برہم ہوگئے تھے۔[۲۷]

حوالے اور حواشی

۱۔ گفتارِ اقبال، ص ۲۶-۲۸
۲۔ حصولِ پاکستان، ص ۱۴۶
۳۔ سرگذشتِ اقبال، ص ۲۹۲
۴۔ گفتارِ اقبال، ص ۸۷
۵۔ سرگذشتِ اقبال، ص ۲۴۵
۶۔ حصولِ پاکستان، ص ۱۵۲
۷۔ گفتارِ اقبال، ص ۱۰۶
۸۔ اقبال کا سیاسی سفر، ص ۲۰۹
۹۔ انقلاب، ۲۶ رجولائی ۱۹۳۰ء، بحوالہ اقبال کا سیاسی سفر، ص ۲۱۰
۱۰۔ سرگذشتِ اقبال، ص ۳۰۲
۱۱۔ آرکائیوز آف فریڈم موومنٹ (اے ایم ایف)، جلد نمبر ۱۵۴، ص ۶۳ بحوالہ: علامہ اقبال کا خطبۂ الٰہ آباد ۱۹۳۰ء، ص ۳۰
۱۲۔ ایضاً
۱۳۔ مارشل لا سے مارشل لا تک، ص ۱۴۱
۱۴۔ اقبال کا سیاسی سفر، ص ۲۱۰
۱۵۔ اردو ڈائجسٹ، اپریل ۱۹۶۷ء، ص ۳۴-۳۵

۱۶۔ ساؤتھ روڈ، الٰہ آباد پر واقع اس تاریخی کوٹھی میں قائداعظم بھی قیام کر چکے تھے۔ ۱۹۷۷ء میں اس کی حالت شکستہ ہو رہی تھی اور یہاں یوپی حکومت کا کوئی دفتر قائم تھا۔ روایت: مفتی فخر الاسلام، نقوش، اقبال نمبر، ستمبر ۱۹۷۷ء، ص ۵۰۱

۱۷۔ یہ ایک قسم کی حویلی ہے، اس کے صحن یا ہال کے چاروں طرف ۱۲ دروازے برآمدے میں کھلتے ہیں۔ یہاں مسلمانوں کے اکثر جلسے اور مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔ ۱۹۷۷ء میں جب مختار زمن نے اسے دیکھا تو یہ عمارت گودام کے طور پر استعمال ہو رہی تھی۔ وہ بتاتے ہیں کہ کرائے کے اس گودام کی گیلریوں میں کچھ تھیلے اور بوریاں بکھری پڑی تھیں۔ صحن کے ایک کونے میں ایک گائے بندھی ہوئی سست رفتاری سے جگالی کر رہی تھی۔ ایضاً، ص ۴۹۹۔۵۰۰

۱۸۔ اردو ڈائجسٹ، اپریل ۱۹۶۷ء، ص ۳۷

۱۹۔ ایضاً، ص ۳۷

۲۰۔ بحوالہ نقوش، اقبال نمبر، ستمبر ۱۹۷۷ء، ص ۵۰۲

۲۱۔ ایضاً، ص ۵۰۱

۲۲۔ اردو ڈائجسٹ، اپریل ۱۹۶۷ء، ص ۳۷

۲۳۔ نقوش، اقبال نمبر، ستمبر ۱۹۷۷ء، ص ۵۰۲

۲۴۔ اقبال کو بُرا بھلا کہنے والوں میں پرتاپ، ملاپ، بندے ماترم، تیج، ٹریبیون اور ہندو ہیرالڈ شامل تھے۔ پرتاپ کے ایک مضمون کا عنوان تھا: ''شمالی ہند کا ایک خوف ناک مسلمان: ڈاکٹر اقبال کی گستاخیوں پر چند خیالات''۔ ہمارے ہاں مذکورہ بالا اخبارات کا ریکارڈ موجود نہیں، تاہم انقلاب کے حوالے سے ایک حد تک ہندو صحافت کی تنقید کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس کی تفصیل کے لیے اقبال کا سیاسی سفر کا باب: ''خطبہ الٰہ آباد کی موافقت میں مہر کے اداریے'' (ص ۲۳۵۔۲۶۳) دیکھیے، نیز سرگذشتِ اقبال کا باب ۲۱

۲۵۔ *Letters & Writings of Iqbal*، ص ۱۱۹

۲۶۔ مختار زمن: نقوش، اقبال نمبر، ستمبر ۱۹۷۷ء، ص ۵۰۲۔ خطبۂ الٰہ آباد اور لفظ ''پاکستان'' کے حوالے سے ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ یہ غلط فہمی اوکسفرڈ یونی ورسٹی کے پروفیسر ایڈورڈ تھامپسن (م: ۱۹۴۶ء) کی پھیلائی ہوئی ہے۔ یہ شخص دس بارہ برس ہندستان میں بھی رہا۔ تقسیم ہند اور پاکستان کا مخالف اور ہندو مہاسبھا کا زبردست حامی تھا۔ اس نے علامہ کے ۴؍ مارچ ۱۹۳۴ء کے ایک خط سے ایک جملہ ''پاکستان، میرا منصوبہ نہیں ہے'' سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے اس پر ردّا چڑھایا کہ اقبال، پاکستان کے خلاف تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال نے جس منصوبۂ پاکستان سے لاتعلقی ظاہر کی، وہ چودھری رحمت علی کا منصوبہ تھا، جس کی تصدیق علامہ کے اسی مذکورہ بالا خط سے ہوتی ہے، جس میں وہ کہتے ہیں: ''اس منصوبے کی پیدائش کیمبرج میں ہوئی تھی۔ اس منصوبے کے خالق یہ سمجھتے ہیں کہ گول میز کانفرنس کے ہم مسلمان نمائندوں نے مسلم قوم کو ہندوؤں یا نام نہاد ہندستانی قومیت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا ہے۔'' (علامہ اقبال: چند جہتیں، ص ۱۵۸) یہ واضح طور پر چودھری رحمت علی کے خیالات اور اُن کی سرگرمیوں کی طرف اشارہ ہے۔

۲۷۔ بحوالہ: علامہ اقبال کی سیاسی زندگی، ص ۷۶

(۱۶)

کون سی منزل میں ہے......

''مَیں ایک بوڑھا آدمی ہوں، جس کی صحت بھی ڈانواں ڈول رہتی ہے۔'' اقبال نے سر اکبر حیدری کو ۲ر مئی ۱۹۳۱ء کو لکھا۔

وہ مجلسِ قانون ساز پنجاب کی رکنیت سے فارغ ہو چکے تھے، لیکن باقی مصروفیات بدستور جاری تھیں۔ ۵۴ سال کی عمر میں اقبال خود کو بوڑھا سمجھنے لگے تھے۔ کیا واقعی بڑھاپے نے اقبال کو آلیا تھا؟

اگرچہ اقبال کی جسمانی صحت بھی بہت اچھی نہ تھی، اس کے باوجود انھیں بوڑھوں میں شمار کرنا درست نہ تھا۔ ان کی گذشتہ تین سال کی کارکردگی ان کے بوڑھے ہونے کی نفی کر رہی تھی۔

۱

اقبال کا ''بڑھاپا'' کیا تھا؟ فقط ایک حساس انسان کی فکرمندی اور مضطرب ذہن کا احساس، جس میں وہ ایک عرصے سے مبتلا چلے آ رہے تھے۔ ملتِ اسلامیہ کے زوال و انحطاط پر وہ رنجیدہ و افسردہ رہتے۔ احیائے دین اور غلبۂ اسلام کے لیے شیخ نور محمد کے بیٹے کی آرزو فطری تھی۔ یہ آرزو وہ بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں ہی سے پال رہے تھے۔ ''شمع و شاعر'' (فروری ۱۹۱۲ء)[۱] میں انھوں نے بڑے پُر تیقّن لہجے میں کہا تھا:

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

آخری شعر تک پہنچتے پہنچتے یہ یقین اور اعتقاد ایک طرح کی پیش گوئی میں تبدیل ہو گیا:

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

پھر اسی تسلسل میں، ۱۹۲۱ء میں انھوں نے ''خضرِ راہ'' میں کہا:

عام حرّیت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے
اے مسلماں! آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ
کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دَور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ[۲]

یہ سب کچھ کہتے ہوئے "طلوعِ اسلام" (مارچ ۱۹۲۳ء) میں اقبال نے اپنا یہ خواب تازہ کیا تھا۔

آنے والے ۷، ۸ برسوں میں انھیں ہندی معاشرے، ہندی سیاست اور ہندستان کے سیاسی راہ نماؤں کو مزید قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ مجلسِ قانون ساز کے عرصۂ رکنیت میں تو قدرتی طور پر ان سب سے قریبی اور براہِ راست واسطہ رہا۔ اس واسطے اور رابطے نے ان کے تجربے اور مشاہدے کو کہیں زیادہ وسیع اور پختہ کر دیا۔

وہ سوچتے تھے کہ ان کا خواب کیسے پورا ہوگا؟ ان کا اضطراب بڑھتا گیا اور اس کا اظہار کئی طرح سے ہوتا رہا۔ ۱۸/اپریل ۱۹۳۱ء کو منشی محمد صالح کے نام لکھتے ہیں: "اسلام پر ایک بہت نازک وقت ہندستان میں آرہا ہے۔ سیاسی حقوق و ملی تمدن کا تحفظ تو ایک طرف، خود اسلام کی ہستی معرضِ خطر میں ہے۔"[۳] چار روز بعد ۲۲/اپریل ۱۹۳۱ء کو انھیں دوبارہ لکھا: "مَیں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کو ابھی تک اس کا احساس نہیں کہ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، اس ملک ہندستان میں کیا ہو رہا ہے اور اگر وقت پر موجودہ حالت کی اصلاح کی طرف توجہ نہ گئی تو مسلمانوں اور اسلام کا مستقبل اس ملک میں کیا ہو جائے گا، ہم تو اپنا زمانہ حقیقت میں ختم کر چکے، آئندہ نسلوں کی فکر کرنا ہمارا فرض ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ان کی زندگی گونڈ اور بھیل اقوام کی طرح ہو جائے اور رفتہ رفتہ ان کا دین اور کلچر اس ملک سے فنا ہو جائے۔"[۴]

۲

مسلمانوں کے مستقبل کا مسئلہ اقبال کے نزدیک زندگی اور موت کا مسئلہ تھا، بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ اہم۔ وہ اس مسئلے پر اپنا دردِ دل اور اپنی تڑپ دوسروں تک، خصوصاً اپنے دوست احباب تک منتقل کرنا چاہتے تھے۔ کہتے ہیں کہ اگر ہم نے کچھ نہ کیا تو "ہم لوگ قیامت کے روز خدا اور رسولؐ کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔"[۵] یہ اضطراب اور یہ فکرمندی ان کے ذہن پر اس درجہ حاوی تھی کہ وہ دن رات اسی سوچ میں مستغرق رہتے:

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی، کبھی پیچ و تابِ رازی[6]

وہ برابر سوچتے کہ "اس نازک زمانے میں اسلام کی حفاظت"[7] کیسے ہوگی؟ شاید اسی فکرمندی نے انھیں "بوڑھا" کردیا تھا۔

احیاے ملّت اور نشاتِ ثانیہ کی منزل خاصی دُور تھی، اقبال عالمِ تخیل میں اپنے آپ سے استفسار کرتے:

کون سی وادی میں ہے، کون سی منزل میں ہے
عشقِ بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں[8]

ہندی مسلمانوں کے مستقبل کے راستے کی دو بڑی رکاوٹوں (ہندو مسلم مناقشات اور مسلمانانِ ہند کا باہمی انتشار و افتراق) کو دُور کرنے کے لیے وہ سال ہا سال سے طرح طرح کی تدبیریں اور کوششیں کرتے چلے آئے تھے۔ ایک طرف مسلمانوں کو باہمی اتحاد و اتفاق کے ذریعے اپنی صفوں کو مرتب و منظم کرنے کی تلقین کرتے،[9] اور دوسری طرف وہ ہندو مسلم سمجھوتوں کے لیے بھی شدید آرزومند رہے۔[10] ۱۴ مئی ۱۹۳۱ء کو مولوی صالح محمد کے نام خط میں لکھتے ہیں:

"مَیں ابھی صبح بھوپال سے واپس آیا اور آپ کا خط ملا۔ ریاست بھوپال میں بھی نواب صاحب کی دعوت پر مَیں اسی مطلب کے واسطے گیا تھا کہ مسلمانوں کے سیاسی اختلافات رفع کرنے کی کوشش کر کے ان کو ایک مرکز پر متحد کیا جائے۔ معاملہ امید افزا ہے، مگر افسوس ہے کہ ہر روز قریباً دو بجے رات تک کام کرنا اور جاگنا پڑا۔ مَیں وہیں بیمار ہوگیا۔"[11]

بعض اوقات اُمت کے مختلف طبقوں سے شدید مایوسی کا اظہار بھی کرتے۔ اس کے باوجود، اصلاحِ احوال کی جو تجویز بھی انھیں سوجھتی، برملا اس کا اظہار کردیتے۔ کانگرس کا رویّہ دیکھ دیکھ کر وہ رفتہ رفتہ ہندو مسلم سمجھوتے سے مایوس ہوتے جارہے تھے، اس لیے شمال مغربی ہندستان میں مسلم مرکزیت کا تصور ان کے ذہن میں تقویت پکڑتا جارہا تھا۔ اسی پس منظر میں انھوں نے خطبۂ الٰہ آباد پیش کیا تھا۔ آل انڈیا مسلم کانفرنس کی تجویز بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ ان ساری تجاویز کا مقصد مسلمانوں کا بہتر مستقبل اور مستقبل کے نازک زمانے میں، اسلامی تہذیب و تمدن کی حفاظت اور آئندہ نسلوں کے لیے دین اور کلچر کی بقا کو یقینی بنانا تھا۔

مسلمانانِ ہند کی تنظیم کے علاوہ کچھ اَور تجویزیں بھی ان کے ذہن میں تشکیل پذیر ہو رہی

تھیں، جن میں سے ایک نیشنل فنڈ کا قیام تھا۔ اس کی ضرورت اور افادیت پر کلام کرتے ہوئے، ۲۲ر اپریل ۱۹۳۱ء کو مولوی صالح محمد کے نام خط میں لکھتے ہیں: ''فی الحال تجویز یہ ہے کہ ایک قومی فنڈ قائم کیا جائے کہ بغیر اس کے، اسلام کے سیاسی و دینی مقاصد کی تکمیل و اشاعت ناممکن ہے۔ مسلمان اخباروں کو قومی کیا جائے۔ نئے اخبار اور نیوز ایجنسیاں قائم کی جائیں۔ مسلمانوں کو مختلف مقامات میں دینی اور سیاسی اعتبار سے منظم کیا جائے۔ قومی عساکر بنائے جائیں اور تمام وسائل سے اسلام کی منتشر قوتوں کو جمع کر کے اس کے مستقبل کو محفوظ کیا جائے۔''[۱۲]

اقبال جس تحریک کا آغاز کرنا چاہتے تھے، اس میں دوسری اہم تجویز یہ تھی کہ قدیم سجادوں کے نوجوانوں کو کسی مرکزی مقام پر جمع کر کے ان سے حفاظت ملی کا کام لیا جائے۔ وہ اپنے دوست مولوی صالح محمد کو بار بار تلقین کرتے ہیں کہ نوجوان سجادہ نشینوں کو جمع کر کے انھیں اطلاع دیں، تاکہ وہ خود آکر مشاورت کریں کہ کس طرح اس درخت کی حفاظت کی جا سکتی ہے، جو ان کے بزرگوں کی کوششوں سے پھلا پھولا۔[۱۳]

یہ ٹھیک وہی زمانہ تھا، جب وہ جاوید نامہ کے آخر میں ''خطاب بہ جاوید'' (ص ۱۹۹) کے نام سے وہ طویل نظم مکمل کر رہے تھے، جس میں خطاب براہِ راست نوجوان نسل سے ہے۔ شاید وہ نوجوان سجادہ نشینوں سے یہی باتیں کہنا چاہتے تھے:

اے پسر ذوقِ نگہ از من بگیر ـــــ سوختن در لا الٰہ از من بگیر

اگرچہ علامہ اقبال پنجاب اسمبلی کے ممبر تو نہ تھے، مگر مسلمانوں کے ایک قابلِ اعتماد راہ نما کی حیثیت سے تمام سیاسی حلقوں میں ان کا احترام کیا جاتا تھا۔ ۳ر اپریل ۱۹۳۱ء کو آل انڈیا مسلم کانفرنس کے دہلی اجلاس میں شریک ہوئے۔ ۳ر مئی کو جداگانہ انتخاب کی حمایت میں ان کی صدارت میں مسلمانانِ لاہور کا ایک جلسہ بیرونِ موچی دروازہ لاہور منعقد ہوا۔ پھر ۱۰ر مئی ۱۹۳۱ء کو نواب بھوپال کی دعوت پر بھوپال گئے۔ مسلم سیاست کے اختلافات ختم نہ ہو سکے اور اقبال بیمار ہو کر واپس آئے۔

۳

اسی زمانے میں ہندستان کے کئی مقامات پر ہندو مسلم فسادات رونما ہوئے۔ کان پور میں تو مسلمانوں کے گھر جلائے گئے، انھیں چن چن کر قتل کیا گیا اور بعض مساجد مسمار کر دی گئیں۔ اس اثنا میں اقبال کو رواں سال کے آخری مہینوں میں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کا موقع ملا۔ ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں: کان پور کے مسلم کش فساد نے اقبال پر گہرا اثر چھوڑا۔ وہ نہ صرف ہندو

مسلم اتحاد کے متعلق ایک بار پھر مایوسی کا شکار ہوئے، بلکہ سنجیدگی سے یہ بھی سوچنے لگے کہ آئندہ گول میز کانفرنس میں حکومتِ برطانیہ نے ہندو اکثریت کو خوش کرنے کے لیے مسلمانوں کو نظر انداز کیا تو مسلمان سوویت یونین یا اشتراکیت کی طرف مائل ہونے میں حق بجانب ہوں گے۔[۱۴]

اسی سال موسمِ گرما میں مغل پورہ انجینئرنگ کالج لاہور کے انگریز پرنسپل نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اشتعال انگیز باتیں کیں۔ اس پر لاہور میں احتجاجی جلوسوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس ضمن میں ۳؍جون ۱۹۳۱ء کو موچی دروازے کے باہر ایک جلسہ منعقد ہوا۔ اقبال نے اپنے صدارتی خطبے میں مسلمانوں کے باہمی اتحاد پر زور دیا کہ یہی ان کے انتشار اور مصیبتوں کا علاج ہے۔ اسی سلسلے میں ۳؍جولائی کے جلسے میں اقبال نے کہا: مسلمانوں کا اتحاد حضورؐ کے مطابق برہانِ قاطع ہے۔[۱۵] جولائی میں کشمیری مسلمانوں پر جو مظالم ہوئے، ان کے سدِّ باب کے لیے آل انڈیا کشمیر کمیٹی قائم کی گئی۔ ۱۴؍اگست ۱۹۳۱ء کو لاہور میں منعقدہ یومِ کشمیر کے جلسے میں علامہ نے مظلومینِ کشمیر کی مدد کے لیے چندے کی اپیل کی اور جو رقوم جمع ہوئیں، وہ مستحقین کے لیے کشمیر بھجوائیں۔ مظلوم کشمیریوں کی قانونی مدد کے لیے بعض نامور وکلا کو کشمیر بھیجا، لیکن مہاراجا ہری سنگھ کی حکومت نے ان وکلا کو ریاست میں داخل نہ ہونے دیا گیا، بلکہ خود اقبال کا داخلہ بھی ممنوع قرار دیا۔

۴

دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ ملا تو وہ ۸ ستمبر کو لاہور سے روانہ ہوئے۔ دہلی ریلوے اسٹیشن پر تین ہزار افراد ان کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ اقبال نے سپاس نامے کے جواب میں تقریر کرتے ہوئے کہا: ''میرے پاس حق و صداقت کی ایک جامع کتاب [قرآن مجید] ہے، جس کی روشنی میں مسلمانانِ ہند کے حقوق کی ترجمانی کرنے کی کوشش کروں گا............ اب اگر لندن میں بھی فرقہ وارانہ اتحاد کی کوئی قابلِ اطمینان صورت نہ نکلی اور مکمل پروونشل اٹانومی نہ دی گئی اور مرکزی حکومت میں ان کا کافی خیال نہ رکھا گیا تو مسلمانانِ ہند کو اجتماعی زندگی پر انفرادی زندگی کو قربان کرنا پڑے گا۔''[۱۶]

علامہ ۱۰؍ستمبر کو بمبئی پہنچے۔ قیام خلافت ہاؤس میں تھا۔ شام کو ایوانِ رفعت میں ایک استقبالیے میں شریک ہوئے، جس کا اہتمام عطیہ فیضی اور ان کے شوہر فیضی رحمین نے ان کے اعزاز میں کیا تھا۔ بمبئی کے اسی دو روزہ قیام میں ان کی ملاقات اپنے افغان دوست سردار صلاح الدین سلجوقی سے بھی ہوئی۔ وہ بمبئی میں افغان قونصل خانے کے ناظم تھے۔ صاحب علم، باذوق اور اقبال

کے قدر دان تھے۔ اس زمانے میں پان اسلام ازم کے بارے میں مختلف حلقوں میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پائی جاتی تھیں۔ روانگی سے قبل اقبال نے بمبئی کرانیکل کے نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ اس اصطلاح کی بنیاد قرآنی تعلیمات پر ہے۔ یہ کوئی سیاسی منصوبہ نہیں، بلکہ ایک سماجی تجربہ ہے۔ اسلام رنگ، نسل اور ذات پات کے امتیاز کو قبول نہیں کرتا۔ یہ صرف اسلام ہے، جس نے رنگ کے مسئلے کو خوش اسلوبی سے حل کر دیا ہے، جسے یورپی تہذیب فلسفے اور سائنس کے شعبوں میں تمام تر ترقی کے باوجود حل نہ کر پائی تھی۔ [۱۷]

۱۲ ستمبر ۱۹۳۱ء کو ''ملوجا'' نامی بحری جہاز سے انگلستان روانہ ہو گئے۔

اس جہاز میں سید علی امام، نواب صاحب چھتاری، جسٹس سہروردی، مشیر حسین قدوائی اور خان بہادر حافظ ہدایت حسین بھی اقبال کے ہم سفر تھے۔ ان لوگوں کی صحبت میں اقبال کا سفر بہت اچھا کٹا۔ مختلف موضوعات و مسائل پر گفتگو رہتی تھی اور کبھی کبھی شعر و شاعری بھی ہو جاتی۔

اقبال نے ایک خط میں لکھا کہ جب ہمارا جہاز ساحلِ مدینہ کے سامنے سے گزر رہا تھا تو سید علی امام پر رِقت طاری ہو گئی۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ بے اختیار ہو کر بولے: بَلِّغْ سَلَامِیْ رَوْضَةً فِیْهَا النَّبِیُّ الْمُحْتَرَم۔ اقبال کہتے ہیں کہ ان کے قلب کی اس کیفیت نے مجھے بے انتہا متاثر کیا۔ خیال رہے کہ اقبال نے اسرار خودی کا پہلا اڈیشن انھی کے نام منسوب کیا تھا۔ خط میں اقبال نے سید علی امام کی بیگم اور ان کی نیک نفسی کا ذکر کیا ہے، جو اپنے شوہر کی ہم سفر تھیں۔ بتاتے ہیں کہ ان کی عنایت سے غیر مشتبہ ذبیحہ اور مغلئی کھانا قریباً ہر روز ہماری میز تک پہنچ جاتا تھا۔ ملوجا جہاز عدن سے ہوتا ہوا پورٹ سعید پہنچا تو انجمن شبان المسلمین کے بعض ممبران اقبال سے ملنے آئے تو ان کی ''طبیعت نہایت خوش ہوئی''۔ قاہرہ کے معروف بیرسٹر لطفی بے نے واپسی پر قاہرہ میں قیام کی دعوت دی۔ یہاں نوجوانوں سے سوال جواب بھی ہوئے۔ اقبال نے ہندستان کے سیاسی مسائل اور مسلمانانِ ہند کے موضوع پر ایک لیکچر دیا۔ نوجوان صحیح صورتِ حال معلوم کر کے بہت متاثر معلوم ہوتے تھے۔ [۱۸] ۲۷ ستمبر کو انگلستان پہنچ گئے۔

۵

لندن میں وہ ۲۱ نومبر تک مقیم رہے۔ قیام سینٹ جیمز کورٹ میں تھا۔ اس کے قریب ہی سینٹ جیمز پیلس واقع تھا، جہاں گول میز کانفرنس ہونے والی تھی۔ اقبال ابتدائی زمانے ہی سے ایک شاعر اور مفکر فلسفی کے طور پر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ گذشتہ چار پانچ برسوں سے انھیں

ہندی مسلمانوں کے ایک نمایاں راہ نما اور ایک اہم سیاسی شخصیت کی حیثیت بھی حاصل ہو گئی تھی۔ چنانچہ لندن پہنچتے ہی وہاں کے علمی، تعلیمی، سیاسی اور صحافتی حلقوں کے عوام و خواص ان سے ملاقات اور تبادلۂ خیال کے لیے آنے لگے۔ برطانیہ میں انتخابات ہونے والے تھے، اس لیے کانفرنس کا کام کچھ التوا کا شکار ہو گیا۔ اس دَوران میں اقبال سے ملاقات کے لیے آنے والوں میں سر سیموئیل ہور (وزیر ہند)، سر ڈینی سن راس، کرنل فیرر (ترکِ موالات کے زمانے کے ڈپٹی کمشنر، لاہور) لارڈ لائیڈ (سابق گورنر بمبئی اور ہائی کمشنر مصر)، چودھری رحمت علی، خواجہ عبدالرحیم، رؤف بے، سعید شامل اور بعض مسلم طلبہ شامل تھے۔ خود اقبال بھی کئی اصحاب سے ملنے کے لیے گئے۔ اقبال کے مداحوں اور قدر دانوں نے ان کے اعزاز میں طعام کی کئی دعوتوں کا اہتمام کیا۔

۴ر نومبر کو انڈیا سوسائٹی کے علمی جلسے میں آپ نے ایک عالمانہ خطبہ دیا اور فارسی شاعری کا ایک حصہ بھی سنایا۔ ۶ر نومبر کو ان کے اعزاز میں اقبال لٹریری ایسوسی ایشن کی طرف سے ایک استقبالیہ لندن کے ہوٹل والڈ روف میں منعقد ہوا۔ کم و بیش ۴۰۰ منتخب افراد شریکِ محفل تھے، جن میں گول میز کانفرنس کے تقریباً تمام مندوبین بھی شامل تھے۔ سر عبدالقادر کی صدارت میں یہ ایک یادگار اجتماع تھا۔ ڈاکٹر نکلسن نے اپنی تعارفی تقریر میں اقبال کو خراجِ تحسین پیش کیا اور کہا کہ اقبال نے دنیا کو ایک ایسا پُر امید پیغام دیا ہے، جو اسے یاس و ناامیدی کی حالت سے نکال سکتا ہے...... آپ نے دنیا کے سامنے اس کے ذہنی، اقتصادی اور معاشرتی مسائل کی کلید پیش کی ہے...... آپ کی ساری حیاتِ ادبی اس بے پناہ ملحدانہ مادیت کے خلاف ایک جرأت آموز جہاد ہے، جس نے قوم پرستی کے لباس میں مغرب کی تمام قوتوں کو اپنا غلام بنا رکھا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ عصرِ حاضر کے کسی مصنف نے اس جہاد میں آپ سے زیادہ جسارت سے کام نہیں لیا...... آپ کے تمام مداحوں کی دلی دعا ہے کہ آپ مدتِ دراز تک علم و دانش کا نور پھیلاتے رہیں۔[19] علامہ نے بطور اظہارِ تشکر مختصراً اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تقریب میں شامل ایک بزرگ شیخ نور محمد، علامہ عبداللہ یوسف علی، مسز سروجنی نائیڈو اور سر عبدالقادر نے بھی تقاریر کیں۔ مسز نائیڈو نے اقبال کو ''ایشیا کا ملک الشعراء'' قرار دیتے ہوئے کہا: میرے نزدیک اقبال اس متحدہ ہندستان کا نشان ہیں، جس پر دنیا کی امید اور امنِ عالم کا قیام ہے۔[۲۰]

۱۸ر نومبر کو اقبال کے اعزاز میں ایک استقبالیہ کیمبرج میں منعقد ہوا۔ یہاں اقبال کے بعض اساتذہ (پروفیسر ڈکنسن اور پروفیسر سارلے) کے علاوہ یونی ورسٹی کے کچھ اَور اساتذہ بھی موجود

تھے۔اس موقعے پر پروفیسر سارلے، ڈاکٹر نکلسن اور ڈاکٹر لیوی نے بھی مختصر تقریریں کیں۔اقبال نے کیمبرج میں زیرِ تعلیم نوجوانوں کو دہریت اور مادیت سے بچنے کی تلقین کی اور کہا کہ اہلِ یورپ کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے مذہب وحکومت کو علیحدہ علیحدہ کر دیا، اس طرح ان کی تہذیب، روحِ اخلاق سے محروم ہوگئی اور اس کا رُخ دہریانہ مادیت کی طرف پھر گیا۔[۲۱]

علامہ اقبال ۲۳ سال بعد لندن آئے تھے، اور اس عرصے میں وہ ایک فلسفی شاعر اور دانش ور کی حیثیت سے خاصی شہرت حاصل کر چکے تھے، اس لیے ان کی غیر معمولی پذیرائی قدرتی بات تھی۔ملاقاتوں، استقبالیوں، دعوتوں اور ضیافتوں میں وہ بے حد مصروف رہے۔

اقبال نے لندن کا یہ سفر گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے اختیار کیا تھا، مگر یہ دورہ زیادہ سودمند ثابت نہ ہوا۔''انگریزوں اور ہندوؤں کی ریشہ دوانیوں'' اور گاندھی جی کی ''غیر منصفانہ'' شرائط کی وجہ سے اقبال بے حد مایوس ہوئے۔۲۲/اکتوبر کو مختار احمد کے نام خط میں لکھتے ہیں: ''مائی نورٹی کمیٹی کے تین اجلاس ہوئے اور تینوں دفعہ کمیٹی پرائیویٹ گفتگو کے لیے ملتوی ہوگئی، اس واسطے مجھے اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ہوا [کذا] .... افسوس کہ ہندو سبھا اور سکھ بہت روڑا اٹکاتے ہیں۔''[۲۲] ۳/نومبر کو محمد عبداللہ چغتائی کے نام خط میں لکھتے ہیں: ''ہندو اور سکھ مسلمانوں کے مطالبات کی مخالفت پر اڑے ہوئے ہیں۔''[۲۳] مختصر یہ کہ اجلاس نتیجہ خیز نہ ہوسکا۔خود مسلم وفد کی سرگرمیوں نے بھی اقبال کو بہت رنجیدہ کیا۔[۲۴] چنانچہ انھوں نے ۱۶/نومبر کو مسلم وفد کے سربراہ سر آغا خان کو کانفرنس سے اپنی لاتعلقی سے مطلع کر دیا۔

۶

۲۱/نومبر کو علامہ اقبال، غلام رسول مہر کے ساتھ لندن سے روم روانہ ہوگئے۔پیرس کے ریلوے اسٹیشن پر کچھ دیر سردار امراؤ سنگھ سے ملاقات رہی۔اگلے اسٹیشن پر اقبال شیدائی سے بھی ملاقات ہوئی۔ٹرین ۵ بجے شام پیرس سے روانہ ہوئی، روم تک ستائیس گھنٹے کا یہ ایک طویل سفر تھا۔وہ جرمنی کے قریب سے گزر رہے تھے۔روم جاتے ہوئے جرمنی بائیں ہاتھ پڑتا ہے۔شب و روز کے اس سفر میں یقیناً انھیں ویگے ناسٹ کا خیال آیا ہوگا؛ ممکن ہے، کئی بار۔

اقبال نے لندن کے دو ماہی قیام کے زمانے میں ویگے ناسٹ کو دو تین خط لکھے اور گول میز کانفرنس کے اختتام پر جرمنی آنے کا وعدہ کیا، تاکہ وہ ویگے ناسٹ سے مل کر ان ''پُرمسرت دنوں کی یاد'' تازہ کریں، جو دونوں نے دریائے نیکر کے کنارے ایک ساتھ گھوم کر گزارے تھے، لیکن

پھر اقبال نے وہ یگے ناسٹ کو لکھا کہ میرے پروگرام میں بعض ایسے ضروری تغیّرات یکا یک نمودار ہو گئے ہیں، جن کے پیشِ نظر اب میرے لیے جرمنی کے راستے سفر کرنا ممکن نہیں رہا،[۲۵] لیکن ساتھ ہی وہ یگے ناسٹ کو یہ امید بھی دلائی کہ شاید اگلے سال مَیں پھر یورپ آؤں۔[۲۶]

روم کے ریلوے اسٹیشن پر رات پونے آٹھ بجے پروفیسر اریسٹا (شعبۂ فلسفہ، روم یونی ورسٹی) اور پروفیسر سکارپا نے دونوں مہمانوں کا استقبال کیا۔ اگلے دو روز ملاقاتوں اور تاریخی مقامات دیکھنے میں گزرے۔ پروفیسر جینٹلی، ناظم انسائی کلوپیڈیا اطالیانہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ اقبال نے اس دائرۂ معارف کے دفتر میں ترتیب و تدوین کا طریقہ دیکھا۔ معلوم ہوا کہ سو افراد کا مستقل عملہ اس کام پر مامور ہے۔ کل ۳۶ جلدوں کا منصوبہ ہے، جن میں سے ۱۲ جلدیں چھپ چکی تھیں۔ ۱۹۳۷ء کے اختتام تک منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔

سابق شاہِ افغانستان امان اللہ خاں ان دِنوں روم میں مقیم تھے۔ ۲۵ رنومبر کو ان سے تین گھنٹے ملاقات رہی۔ ۲۶ رنومبر کو اقبال نے رائل اکیڈمی میں لیکچر دیا۔[۲۷] انھوں نے کئی عجائب گھر اور آثارِ قدیمہ بھی دیکھے۔ ۲۸ رنومبر کو اقبال اور مہر نیپلز پہنچے۔ دن کا کچھ وقت وہاں گزارنے کے بعد شام کو وہاں سے برنڈزی روانہ ہو گئے۔

اٹلی میں قیام کے دوران میں یوں تو بیسیوں لوگوں سے اقبال کی ملاقاتیں ہوئیں، لیکن اٹلی کے مطلق العنان حکمران مسولینی اور تاریخ اسلام کے ایک دل دادہ عالم پرنس کیتانی سے ان کی ملاقاتیں زیادہ اہم ہیں۔

بوقتِ ملاقات و گفتگو مسولینی نے اٹلی کے بارے میں اقبال کے تاثرات جاننا چاہے تو اقبال نے کہا: ''اطالوی ذہین و فطین، خوب رو اور فن پرست ایرانیوں سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ ان کی پشت پر تہذیب و تمدن کی کئی صدیاں ہیں، مگر ان میں خون نہیں۔'' مسولینی کو تعجب ہوا تو اقبال نے وضاحت کی کہ ایرانیوں کے اردگرد افغان، کرد اور ترک جیسی مضبوط اور توانا قومیں آباد ہیں، جن سے وہ تازہ خون حاصل کر سکتے ہیں، مگر اطالوی ایسا نہیں کر سکتے؛ اس لیے وہ کمزور ہی رہیں گے۔

مسولینی نے پوچھا: پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

اقبال نے کہا: یورپ سے منہ موڑ کر مشرق کا رُخ کرو، یورپ کا اخلاق ٹھیک نہیں ہے۔ مشرق کی ہوا تازہ ہے، اس میں سانس لو۔

پھر مسولینی نے پوچھا: کوئی اور مفید مشورہ دیجیے۔ اقبال نے کہا: ہر شہر کی آبادی مقرر کر کے

اسے حد سے نہ بڑھنے دو۔ مسولینی نے حیرت سے پوچھا: اس میں کیا مصلحت ہے؟ اقبال نے کہا: آبادی بڑھنے سے شہر کی تہذیبی اور اقتصادی توانائی کم ہو جاتی ہے اور ان کی جگہ محرکاتِ شر (evil forces) زور پکڑتے ہیں۔ اقبال نے وضاحت کرتے ہوئے کہا: میرے پیغمبرؐ نے یہ ہدایت تیرہ سو سال قبل فرمائی تھی کہ جب مدینہ منورہ کی آبادی ایک حد سے تجاوز کر جائے تو مزید لوگوں کو آباد ہونے کی اجازت دینے کے بجائے دوسرا شہر آباد کیا جائے۔ یہ بات سنتے ہی مسولینی بے حد متعجب ہوا اور کہنے لگا: کیسا شاندار خیال ہے۔

باہر نکلے تو اقبال کو صحافیوں نے گھیر لیا اور مسولینی کے بارے میں ان کی رائے پوچھی۔ اقبال پہلے تو رائے دینے سے گریزاں رہے، پھر فرمایا: آپ کا ڈوچے لوتھر ہے، مگر انجیل کے بغیر۔

بہت بعد میں اقبال نے آلِ احمد سرور کو ایک خط میں لکھا کہ مجھے اس ''بندۂ خدا میں devil اور saint دونوں کے خصوصیات'' نظر آئے۔ مزید یہ کہ اس کی نگاہ میں ایک ناممکن البیان تیزی ہے، جسے شعاعِ آفتاب سے تعبیر کر سکتے ہیں۔[۲۸] شاید اسی ملاقات کا ایک تاثر بالِ جبریل کی نظم بعنوان: ''مسولینی'' میں نظر آتا ہے۔ آغاز یوں ہوتا ہے[۲۹]:

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوقِ انقلاب
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملّت کا شباب

اور اس نظم کا آخری شعر ہے:

فیض یہ کس کی نظر کا ہے؟ کرامت کس کی ہے؟
وہ کہ ہے جس کی نگہ مثلِ شعاعِ آفتاب

چار سال بعد ۱۹۳۵ء میں مسولینی نے حبشہ پر حملہ کر دیا۔ یہ سراسر جارحیت تھی، اقبال نے نظم ''ابی سینیا'' لکھ کر مسولینی کے اس اقدام کی سخت مذمت کی[۳۰]:

تہذیب کا کمال، شرافت کا ہے زوال
غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش
ہر گرگ کو ہے برّۂ معصوم کی تلاش!
اے وائے آبروے کلیسا کا آئنہ
روما نے کر دیا سرِ بازار پاش پاش
پیرِ کلیسیا! یہ حقیقت ہے دِل خراش!

اور چند روز بعد علامہ نے 'مسولینی' کے عنوان سے ایک اور نظم لکھ کر مسولینی کی زبان سے مغربی استعمار پر اس طرح تنقید کی[۳۱]:

تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام
تم نے لوٹی کشتِ دہقاں، تم نے لوٹے تخت و تاج!
پردۂ تہذیب میں غارت گری ، آدم کشی
کل رَوا رکھی تھی تم نے ، مَیں رَوا رکھتا ہوں آج

اٹلی میں ان کی دوسری اہم ملاقات پرنس کیتانی سے ہوئی۔ اقبال کہتے ہیں: وہ شخص اسلامی تاریخ کا بہت دل دادہ تھا اور اس نے تاریخ پر اتنی کتابیں لکھیں اور تاریخی مواد جمع کیا کہ کوئی اسلامی سلطنت اتنا اہتمام نہیں کر سکتی۔ میرے اس سوال پر کہ آپ کو اسلامی تاریخ سے دل چسپی کیوں ہے؟ اس نے جواب دیا: اسلامی تاریخ عورتوں کو مرد بنا دیتی ہے۔[۳۲]

۲۹ر نومبر کی سہ پہر علامہ اور مہر صاحب اٹلی کی بندرگاہ برنڈزی سے بذریعہ بحری جہاز ''وکٹوریا'' مصر کی طرف روانہ ہو گئے۔ مولانا شفیع داؤدی بھی ان کے ہم رکاب تھے۔

حوالے اور حواشی

۱۔ بانگِ درا، ص ۱۹۴
۲۔ ایضاً، ص ۲۶۶
۳۔ اقبال نامہ، ص ۶۲۵
۴۔ ایضاً، ص ۶۲۶-۶۲۷
۵۔ ایضاً، ص ۶۲۷
۶۔ بالِ جبریل، ص ۱۷
۷۔ اقبال نامہ، ص ۶۲۶
۸۔ بالِ جبریل، ص ۹۹
۹۔ اقبال نامہ، ص ۴۱۳
۱۰۔ Speeches، ص ۱۴۱
۱۱۔ اقبال نامہ، ص ۶۲۷-۶۲۸
۱۲۔ ایضاً، ص ۶۲۶
۱۳۔ ایضاً، ص ۶۲۵، ایسا نہ ہو سکا۔ اگر علامہ اقبال سجادوں کو جمع بھی کر لیتے تو کیا انھیں کامیابی ہوتی؟

۱۴۔ زندہ رُود، ص ۴۹۸
۱۵۔ ایضاً، ص ۴۹۹
۱۶۔ انقلاب، ۱۲ر ستمبر ۱۹۳۱ء، بحوالہ سفر نامۂ اقبال، ص ۲۲
۱۷۔ *Letters and Writings of Iqbal*، ص ۵۶
۱۸۔ اس سفر کے تفصیلی حالات چودھری محمد حسین کے نام ایک خط میں ملتے ہیں، جو روز نامہ انقلاب، لاہور کی اشاعت ۱۵ر اکتوبر ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا۔ انقلاب میں یہ بتایا گیا کہ اقبال نے یہ خط اپنے ''ایک دوست'' کے نام تحریر کیا تھا۔ غلام رسول مہر کی روایت کے مطابق مکتوب الیہ منشی طاہر الدین ہیں، لیکن اس خط کی جو عکسی نقل گورنمنٹ کالج، لاہور کے مجلّہ تحقیق نامہ: ۵ میں شائع ہوئی ہے، اس کے مطابق مکتوب الیہ چودھری محمد حسین ہیں۔ خط کا متن خطوطِ اقبال اور سفر نامۂ اقبال میں بھی شامل ہے۔
۱۹۔ سفر نامۂ اقبال، ص ۸۸۔ لندن کی مصروفیات اور واپسی کے سفر کی تفصیلات زیادہ تر سفر نامۂ اقبال سے اخذ کی گئی ہیں۔
۲۰۔ انقلاب، ۲۱ر نومبر ۱۹۳۱ء، بحوالہ سفر نامۂ اقبال، ۹۰-۹۱
۲۱۔ ایضاً، ص ۹۳
۲۲۔ مظلوم اقبال، ص ۳۶۲
۲۳۔ اقبال نامہ، ص ۵۹۵
۲۴۔ *Letters and Writings of Iqbal*، ص ۸-۹
۲۵۔ اقبال یورپ میں، ص ۲۱۳
۲۶۔ ایضاً
۲۷۔ اس لیکچر کا ذکر دیکھیے: *Letters and Writings of Iqbal*، ص ۸۰
۲۸۔ اقبال نامہ، ص ۵۸۰۔ مسولینی سے ملاقات کے سلسلے میں متعدد روایات ملتی ہیں، جن میں تھوڑا بہت اختلاف ہے، مگر ان کا خلاصہ یہی ہے، جو ہم نے بیان کیا ہے۔
۲۹۔ بالِ جبریل، ص ۱۵۰-۱۵۱
۳۰۔ ضربِ کلیم، ص ۱۴۵
۳۱۔ ایضاً، ص ۱۴۹-۱۵۰
۳۲۔ روز نامہ انقلاب، ۱۳ر جون ۱۹۳۲ء، بحوالہ گفتارِ اقبال، ص ۱۵۳-۱۵۴

❖......❖......❖

(۱۷)

قافلۂ حجاز میں......

برطانیہ کی ملکہ عالیہ سے منسوب ''وکٹوریا'' جہاز خاصا تیز رفتار ثابت ہوا۔ اس نے ۲۷ گھنٹے کا سفر ۴۰ گھنٹوں میں طے کر لیا۔ علامہ اقبال اور مہر صاحب یکم دسمبر ۱۹۳۱ء کو صبح نو بجے اسکندریہ پہنچ گئے، جہاں مختلف تنظیموں کی طرف سے ان کا خیر مقدم کیا گیا۔

۱

مصر میں وہ پانچ دن تک مقیم رہے۔ اس دوران میں وہ قاہرہ بھی گئے، جہاں بہت سے حضرات سے ملاقاتیں ہوئیں، ان میں علامہ رشید رضا (مدیر: المنار)، سلیمان فوزی (مدیر: کشکول)، محمد حسین ہیکل (مدیر: السیاسۃ) کے علاوہ ڈاکٹر منصور فہمی، مصطفیٰ بے، عبدالرزاق، عبدالوہاب عزام پاشا، ڈاکٹر عبدالرحمٰن شہبن بدر وغیرہ شامل تھے۔

علامہ کو اندازہ ہوا کہ زیادہ تر لوگ مسلمانانِ ہند کے سیاسی مؤقف کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور کانگرس کے پروپیگنڈے کے زیر اثر سمجھتے ہیں کہ مسلمان، ہندستان کی جدوجہدِ آزادی میں روڑے اٹکا رہے ہیں۔ انھوں نے ملاقاتوں میں صورتِ حال کی وضاحت کی اور اس غلط تاثر کو دُور کرنے میں خاصی حد تک کامیاب رہے۔ مولانا مہر بھی اپنے طور پر متعدد اخبارات کے دفاتر میں گئے اور ان کے اڈیٹروں سے مل کر اپنا مؤقف واضح کیا۔

قاہرہ میں بہت سے مصری اکابر خاصے عرصے سے اقبال کی زیارت و ملاقات کے لیے ان کی آمد کے منتظر تھے۔ اس سے پہلے جب وہ اسکندریہ پہنچے تو اسٹیشن پر بہت سے اخباری فوٹوگرافر بھی آئے ہوئے تھے۔ اقبال استقبال کے ہنگاموں سے طبعاً گھبراتے تھے، اس لیے وہ خاموشی سے ایک طرف کھسک گئے۔ فوٹوگرافروں نے تصاویر بنائیں، چنانچہ تین دن تک مولانا مہر کی تصویر اقبال کے نام سے چھپتی رہی۔ جب تین روز بعد اخبارات والوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انھوں نے معذرت کی اور علامہ اقبال کی تصویر شائع ہونے لگی۔ ایک نوجوان مصری صحافی کے

اصرار پر اقبال نے نوجوانانِ مصر کو یہ مختصر پیغام دیا: نوجوانانِ مصر سے میری درخواست ہے کہ وہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وفادار رہیں۔[۱] اقبال کو بہت سے استقبالیوں کی دعوتیں ملیں اور مختلف انجمنوں نے اپنے ہاں تقریروں کی دعوت بھی دی، مگر اس مختصر قیام میں سب کی دعوت قبول کرنا ممکن نہ تھا، البتہ وہ میزبانوں کی معیت میں اہرامِ مصر دیکھنے گئے۔ انھوں نے وہ میوزیم بھی دیکھا، جہاں فراعنہ کے زمانے کے آثار جمع تھے۔ پھر عربی عجائب گھر میں اسلامی دَورِ تمدن کی یادگاروں کی زیارت کی۔ اپنے قیام کے آخری دن فسطاط کا تاریخی شہر، حضرت عمروؓ بن العاص کی مسجد اور حضرت امام شافعیؒ کا مزار بھی دیکھا۔ علامہ اقبال مزار پر دیر تک قرآنِ پاک کی تلاوت کرتے رہے۔

۲

مصر میں پانچ دن گزارنے کے بعد بذریعہ ریل فلسطین کی طرف روانہ ہوئے۔ مولانا شوکت علی اور حافظ عبدالرحمٰن بھی ان کے ہم سفر ہو گئے۔ چھے دسمبر کی صبح اقبال اور مہر بیت المقدس پہنچے تو ریلوے اسٹیشن پر ان کی پذیرائی اور استقبال کے لیے مفتی امین الحسینی بذاتِ خود موجود تھے۔ مولانا شوکت علی اور ان کے چند ساتھی بھی انھیں لینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ علامہ اقبال اور مہر صاحب کو گرینڈ نیو ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔

فلسطین میں اقبال کا قیام نو روز رہا۔ یہ شب و روز شدید مصروفیت میں گزرے۔ اس سفر کا اصل مقصد مؤتمر عالمِ اسلامی (اسلامی کانفرنس) میں شرکت تھی۔ مؤتمر اس سے قبل بھی دو بار منعقد ہو چکی تھی۔ پہلی مؤتمر قاہرہ میں محدود پیمانے پر ہوئی تھی۔ دوسری مؤتمر ۱۹۲۶ء میں سلطان ابنِ سعود نے مکہ معظمہ میں منعقد کی تھی۔ اگرچہ پہلی مؤتمر کی نسبت اس میں نمائندگی زیادہ تھی، تاہم اس میں بھی چند ممالک کے نمائندے شامل نہ ہو سکے تھے اور موضوع بھی مسئلہ حجاز تک محدود رہا۔[۲] موجودہ کانفرنس کے داعی سید امین الحسینی، مفتی اعظم فلسطین تھے، اور یہ نسبتاً بڑے پیمانے پر ہو رہی تھی۔ اس میں تقریباً ۲۷ ملکوں اور علاقوں کے مندوبین شامل تھے۔ ان میں اربابِ علم و فضل بھی تھے اور سیاسی اور ملّی راہ نما بھی۔ اسی طرح متعدد واجب الاحترام بزرگ شخصیات اور مجاہدینِ آزادی اور اپنے اپنے ملکوں کی سیاست میں سرگرم ممبرانِ پارلیمنٹ بھی۔ گویا قبلۂ اوّل کے شہر میں عالمِ اسلام کی منتخب شخصیتیں جمع تھیں۔

گذشتہ کئی ماہ سے اس کانفرنس کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ عالمِ اسلام کے مخدوش اور پریشان کن

حالات بھی اس کے انعقاد کا ایک سبب تھے، مثلاً لیبیا پر اطالوی فوج کشی اور فلسطین میں انگریزوں کی سرپرستی میں بین الاقوامی صہیونیت کی تیزی سے پیش رفت وغیرہ؛ لیکن کانفرنس کا سب سے اہم مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو فلسطین پر یہودیوں کے ناجائز قبضے کے سنگین مسئلے کا احساس دلایا جائے اور صہیونی خطرے کے خلاف اتحادِ عالمِ اسلام کی تدابیر پر غور کیا جائے۔ کانفرنس کا پہلا تعارفی اور افتتاحی اجلاس چھے دسمبر کی شام منعقد ہوا۔ ابتدائی نشست روضۃ المعارف میں اور باقی کارروائی مسجد اقصیٰ میں منعقد ہوئی۔ افتتاحی خطبے میں مفتی اعظم فلسطین نے مسلمانوں میں اتحاد و تعاون اور اسلامی اخوت کی نشو و نما، اجتماعی اسلامی فرائض کی پابندی، دین اسلام کے الحاد سے بچاؤ اور اسلامی کلچر اور اس کی اشاعت کے فروغ پر زور دیا۔

۷ دسمبر سے کانفرنس کے باقاعدہ اجلاس شروع ہوئے۔ کانفرنس کے انعقاد پر عالمِ اسلام کے مختلف حکمرانوں، وزرا، ممبرانِ پارلیمنٹ، مختلف پارٹیوں اور علمی اداروں کے سربراہوں، خطیبوں اور عام شہریوں کی طرف سے سیکڑوں کی تعداد میں خطوط اور تار موصول ہوئے، جن میں کانفرنس کی کامیابی کے لیے نیک جذبات کا اظہار کیا گیا تھا۔ فلسطین کے آرتھوڈاکس یہودیوں نے بھی جذبۂ خیر سگالی کے طور پر خط بھیجا تھا۔

کانفرنس کے سامنے ایک وسیع اور مختلف النوع ایجنڈا تھا، چنانچہ مسائل کی نوعیت کے لحاظ سے سات کمیٹیاں بنا دی گئیں، تاکہ ہر کمیٹی متعلقہ موضوع اور مسئلے پر ضروری معلومات حاصل کر کے رپورٹ تیار کرے اور قرارداد کا متن بھی مرتب کرے۔ کمیٹیاں حسب ذیل تھیں:

۱۔ حجاز ریلوے کمیٹی
۲۔ مسجد اقصیٰ یونی ورسٹی کمیٹی
۳۔ مالیات کمیٹی
۴۔ دعوتِ دین کمیٹی
۵۔ نشر و اشاعت یا پروپیگنڈا کمیٹی
۶۔ مقاماتِ مقدسہ بشمول مسجد القدس کمیٹی
۷۔ قانونِ اساسی کمیٹی

کانفرنس کے دنوں میں علامہ اقبال اور مہر صاحب کانفرنس کی مختلف نشستوں میں شریک رہے۔ ایک نشست میں علامہ اقبال کو نائب صدر بنا کر سٹیج پر بٹھایا گیا۔ انھوں نے بعض کمیٹیوں

کے اجلاسوں میں شریک ہو کر رپورٹیں مرتب کرنے میں بھی مدد کی۔ مسجد اقصیٰ یونی ورسٹی کمیٹی کی رپورٹ میں ایک ایسی یونی ورسٹی کے قیام کی سفارش کی گئی تھی، جو مسلمانوں کو غیر مسلم یونی ورسٹیوں سے بے نیاز کر دے۔ علامہ اقبال کے نزدیک یہ بات محلِ نظر تھی۔ انھوں نے فرمایا: مَیں اس جذبے کی تو تعریف کرتا ہوں، جو اس تجویز میں کارفرما ہے، لیکن مجھے شک ہے کہ آیا یہ تجویز عملی طور پر ممکن بھی ہے یا نہیں۔[۳] بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ اقبال یروشلم میں ایک اسلامی یونی ورسٹی قائم کرنے کے مخالف تھے۔ اقبال نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ مجھے علم نہیں کہ یہ غلط فہمی کیسے ہوئی۔ مَیں نے تو قدیم اور پس ماندہ جامعہ الازہر کی طرز پر یونی ورسٹی کے قیام کی مخالفت کی تھی، ورنہ میری خواہش تو ہے اور مَیں نے اس پر زور بھی دیا ہے کہ مجوزہ یونی ورسٹی کا ملاً جدید انداز کی ہو، بلکہ میری تمنا ہے کہ عرب ممالک میں ایک کے بجائے کئی یونی ورسٹیاں قائم ہوں۔[۴]

۳

فلسطین کے نو روزہ قیام کے دوران میں اقبال اور مہر کو جتنا بھی وقت اور موقع ملتا، وہ مقاماتِ مقدسہ اور آثارِ قدیمہ کی زیارت کو نکل جاتے۔ کانفرنس کی طرف سے حسب ضرورت سواری (کار) اور راہ نما میسر رہتا تھا۔ ایک روز بیت المقدس سے چالیس میل دُور جنوب میں واقع الخلیل (حبرون) دیکھنے گئے۔ راستے میں تھوڑی دیر کے لیے بیت اللحم رُکے، یہاں کلیسائے مولدِ مسیح کی زیارت نے اقبال کو بہت متاثر کیا۔ بیت اللحم حضرت داؤد علیہ السلام کی جائے ولادت بھی ہے۔ بیت اللحم سے الخلیل جاتے ہوئے بڑے بڑے تالاب دکھائی دیے۔ روایت ہے کہ یہ حضرت سلیمان کے تعمیر کردہ ہیں۔ الخلیل بنی اسرائیل کے بہت اولوالعزم پیغمبروں حضرت ابراہیم، حضرت اسحٰق، حضرت یعقوب، حضرت یوسف اور بعض انبیا کی ازواجِ مطہرات کا مدفن بھی ہے۔

حرمِ مقدس کے اندر جانے، وہاں نمازیں پڑھنے اور مسجد عمر فاروق، قبۃ الصخراء وغیرہ کی زیارت کا تو اقبال کو بار بار موقع ملا ہو گا، بیت المقدس شہر میں بھی انھوں نے بہت سے قابلِ دید مقامات، عمارات اور آثار دیکھے۔ ایک دن موقع پا کر فلسطین کے اسلامی اوقاف کا بھی معائنہ کیا، جس کا انتظام مجلس اسلامیہ اعلیٰ کے ذمے تھا۔ مجلس کے سربراہ چالیس سالہ مفتی سید امین الحسینی تھے۔ انھوں نے مسلسل کوشش کر کے اوقافِ فلسطین کو منظم کر دیا تھا، جس کے تحت فلسطین کے مختلف شہروں میں درس گاہیں قائم تھیں۔ القدس کے دارالا تیام میں اقبال اور مہر صاحب نے بچوں کی بنائی ہوئی اشیا دیکھیں اور مختلف شعبوں کا معائنہ کیا۔ یہاں نابیناؤں کی تعلیم و تربیت کا انتظام بھی

تھا۔ ادارے کی طرف سے آپ کو قرآن مجید کا ایک خوب صورت نسخہ ہدیہ کیا گیا۔ اقبال نے مٹھائی کے لیے پانچ پاؤنڈ بچوں کی نذر کیے۔ ایک شب دارالایتام کے بوائے اسکاؤٹس نے بہت دل کش عربی قومی گیت سنائے۔ ایک شب فتح اندلس کے متعلق ڈراما دکھایا گیا اور حاضرین کے اصرار پر علامہ اقبال کو بھی ڈرامے کی مناسبت سے فارسی قطعہ بعنوان ''الملک للہ'' [۵] سنانا پڑا:

طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت — گفتند کارِ تو بہ نگاہِ خرد خطاست
دوریم از سوادِ وطن باز چوں رسیم؟ — ترک سبب زرُوے شریعت کجا رواست
خندید و دستِ خویش بہ شمشیر برد و گفت
ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

ایک مندوب نے اس کا عربی ترجمہ سنایا تو حاضرین نے بڑی مسرت کے ساتھ ''ڈاکٹر اقبال: زندہ باد'' کے نعرے لگائے۔

کانفرنس کے مندوبین کو فلسطین کے دوسرے شہروں سے بھی دعوتیں ملیں، مگر وہ سب جگہ نہیں جا سکے، البتہ مقامی طور پر دو تین ظہرانوں اور دعوتوں میں شرکت کی۔ یہاں ایک دلچسپ واقعے کا ذکر مناسب ہوگا۔ غلام رسول مہر لکھتے ہیں: ایک روز صدرِ بلدیہ یروشلم کی طرف سے ہماری قیام گاہ سے قریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر واقع ایک ہوٹل میں عصرانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ہم موٹر میں وہاں پہنچے۔ چائے پی چکنے کے بعد واپسی کے لیے فوری طور موٹر نہ ملی۔ انتظار کے بجائے مَیں نے عرض کیا کہ ہماری قیام گاہ کچھ دُور تو ہے نہیں، کیوں نہ ٹہلتے ٹہلتے پیدل وہاں پہنچ جائیں؟ فرمایا: ٹھیک ہے، چلو۔ لیکن پانچ دس قدم چل کر رُک گئے اور فرمایا: مہر صاحب! ہم تھک جائیں گے۔ حسنِ اتفاق سے اسی وقت ایک موٹر آگئی اور ہم اس میں سوار ہو کر قیام گاہ پر پہنچ گئے۔ مہر صاحب کہتے ہیں کہ فطری انہماک کے سبب وہ نقل و حرکت سے گریزاں رہتے تھے اور ان کے لیے دو فرلانگ بھی چلنا مشکل تھا۔ [۶]

۱۴ دسمبر فلسطین میں اقبال اور مہر کے قیام کا آخری دن تھا۔ اس روز شام کی نشست میں اقبال نے ایک مؤثر تقریر کی، جس میں عالمِ اسلام کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا کہ اسلام کو الحادِ مادی اور وطنی قومیت سے خطرہ ہے۔ مَیں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ آپ دل سے مسلمان بنیں۔ مجھے اسلام کے دشمنوں سے اندیشہ نہیں ہے، لیکن خود مسلمانوں سے مجھے اندیشہ ہے۔ [۷] اقبال نے کانفرنس سے متعلق دیگر مسائل پر بھی اظہارِ خیال کیا۔ انھوں نے نوجوانوں کا خاص طور پر ذکر کیا اور

مندوبین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اگر ہم اسلامی اخوت کی سچی روح سے معمور ہو کر کام کریں گے تو اپنے مقاصد حاصل کرلیں گے۔ اپنے وطنوں کو واپس جاؤ تو روحِ اخوت کو ہر جگہ پھیلا دو اور اپنے نوجوانوں پر خاص توجہ دو۔[۸] روانگی سے پہلے انھوں نے نیوز ایجنسی رائٹر کے نمائندے سے باتیں کرتے ہوئے کہا کہ مؤتمر اسلامی کو بے حد کامیابی حاصل ہوئی ہے۔[۹]

۴

۱۵ دسمبر کی صبح علامہ اقبال اور مہر صاحب بیت المقدس سے ریل کے ذریعے پورٹ سعید روانہ ہو گئے۔

قنطرہ کے راستے پورٹ سعید تک یہ تقریباً ایک شب و روز کا سفر تھا۔ یہ سارا وقت نہ تو اقبال سوتے رہے ہوں گے، نہ ممکن تھا کہ ہمہ وقت مہر صاحب سے ہم کلام رہیں؛ یقیناً وہ گذشتہ ۹ دنوں کی مصروفیات، ملاقاتوں، زیارات اور عالمِ اسلام کی مشکلات، مسائل اور مستقبل میں احیائے ملت کے امکانات پر غور کرتے رہے ہوں گے۔ ان کے ذہن کی سکرین پر ایک فلم چل رہی ہوگی۔ اس میں بیت المقدس، الخلیل، انبیا کی قبریں، قبۃ الصخرا کے مناظر کے ساتھ یقیناً فلسطین کی حدود سے آگے سرزمینِ حجاز کی وادیِ بطحا، طائف اور مدینہ کے مناظر بھی سامنے آتے ہوں گے۔ اقبال نے سوچا (اور ممکن ہے، کسی نے توجہ بھی دلائی ہو) کہ واپسی کا سفر حجاز کے راستے کیا جائے، مگر عملاً ایسا نہ ہو سکا، کیوں؟

اقبال کہتے ہیں: ”مدینۃ النبی کی زیارت کا قصد تھا، مگر میرے دل میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا کہ دُنیوی مقاصد کے لیے سفر کرنے کے ضمن میں حرمِ نبوی کی زیارت کی جرأت کرنا سوءِ ادب ہے۔ اس کے علاوہ بعض مقامی احباب سے وعدہ تھا کہ جب حرمِ نبوی کی زیارت کے لیے جاؤں گا تو وہ میرے ہم عناں ہوں گے۔ ان دونوں خیالوں نے مجھے باز رکھا، ورنہ کچھ مشکل امر نہ تھا۔ یروشلم سے سفر کرنا آسان ہے۔“[۱۰] بعد ازاں، ایک موقع پر نذیر نیازی سے فرمایا: ”اس بات سے شرم آتی تھی کہ میں گویا ضمناً دربارِ رسولؐ میں حاضر ہوں۔“[۱۱] بیت المقدس سے قنطرہ اور پورٹ سعید کی طرف جاتے ہوئے اقبال کے احساسات کیا ہوں گے؟ زیارتِ مدینہ سے محرومی کے جذبات! جدائی اور فراق کے جذبات! اقبال اکثر ”عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق“ کے قائل نظر آتے ہیں۔ یقیناً اس وقت بھی ”ہجر میں لذتِ طلب“ نے ڈھارس بندھائی ہوگی، بایں ہمہ دل میں کھدبُد تو جاری ہوگی۔ گرمیِ آرزو، قیامِ فلسطین کے دَوران میں اور واپسی

کے سفر کے دوران میں بھی شعر پاروں کی صورت ڈھلتی رہی۔

نظم "ذوق و شوق" سفر فلسطین کا فکری اور شعری ماحصل ہے۔ نظم کے ساتھ اقبال نے یہ توضیح لکھنا ضروری سمجھا کہ ان اشعار میں سے اکثر فلسطین میں لکھے گئے:

قلب و نظر کی زندگی، دشت میں صبح کا سماں
چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں
حسنِ ازل کی ہے نمود، چاک ہے پردۂ وجود
دل کے لیے ہزار سود، ایک نگاہ کا زیاں!
سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحابِ شب!
کوہِ اِضم دے گیا رنگ برنگ طیلساں!
گرد سے پاک ہے ہوا، برگِ نخیل دھل گئے
ریگِ نواحِ کاظمہ نرم ہے مثلِ پرنیاں!

یہ اشعار لکھتے ہوئے فلسطین کے مختلف علاقوں کے خوب صورت مناظر ان کے ذہن میں تازہ ہوں گے۔ سرسبز و شاداب علاقہ، پھلوں اور پھولوں کے قطار اندر قطار درخت اور پودے، دُور دُور تک پھیلے ہوئے سبزیوں کے کھیت، انگور، انجیر اور مالٹوں کے باغات اور پھر موسم بہار کا۔ بقول غلام رسول مہر: عرب دنیا میں اس سے زیادہ حسین خطہ اَور کوئی نہ تھا۔[۱۲]

بہت سی معروف شخصیات (سر اکبر حیدری اور ان کی بیگم، محمد مارماڈیوک پکتھال، ڈاکٹر شفاعت احمد خان اور سلطنت آصفیہ کے ولی عہد، شہزادے اور ان کی بیگمات) بھی اسی جہاز میں سوار تھیں۔ دورانِ سفر سب لوگوں سے اقبال کی ملاقات ہوتی رہی۔ جہاز ۲۸ ردسمبر کو بمبئی پہنچا۔ دن کا وقت خلافت ہاؤس میں گزار کر، علامہ شام کو بمبئی سے بذریعہ ریل روانہ ہوئے اور براستہ دہلی ۳۰ ردسمبر ۱۹۳۱ء کو صبح آٹھ بجے لاہور پہنچ گئے، جہاں عوام اور عمائدینِ شہر نے ان کا بھرپور استقبال کیا۔[۱۳] اقبال نے ایک بیان میں کہا: میرا یہ سفر زندگی کا نہایت دلچسپ واقعہ ثابت ہوا ہے۔

حوالے اور حواشی

۱۔ سفرنامۂ اقبال، ص ۱۶۹۔ اقبال کے اس سفرِ یورپ (۱۹۳۱ء۔ ۱۹۳۲ء) کے حالات کا تفصیلی ماخذ روزنامہ انقلاب ہے یا پھر علامہ کے خطوط۔ جناب حمزہ فاروقی نے انقلاب اور چند ایک متفرق ماخذ کی

بنیاد پر سفر نامۂ اقبال مرتب کیا ہے، ہم نے زیر نظر باب میں زیادہ تر استفادہ اسی کتاب کے طبع دوم سے کیا ہے۔

۲۔ سفر نامۂ اقبال، ص ۲۲۸

۳۔ انقلاب، ۲۰ر دسمبر ۱۹۳۱ء، بحوالہ سفر نامۂ اقبال، ص ۲۳۶

۴۔ *Speeches*، ص ۲۵۲-۲۵۳

۵۔ پیام مشرق، ص ۱۲۹

۶۔ پیش لفظ: اقبال درُون خانہ [اوّل]، ص ۲۴

۷۔ سفر نامۂ اقبال، ص ۲۴۲

۸۔ ایضاً، ص ۲۴۳

۹۔ روزنامہ انقلاب، ۲۰ر دسمبر ۱۹۳۱ء، بحوالہ سفر نامۂ اقبال، ص ۲۴۲

۱۰۔ اقبال نامہ، ص ۶۳۳

۱۱۔ اقبالیاتِ نذیر نیازی، ص ۷۹

۱۲۔ سفر نامۂ اقبال، ص ۲۱۷

۱۳۔ گفتارِ اقبال، ص ۱۴۵

❖......❖......❖

۱۸

رفتم بہ تماشائے خراباتِ فرنگ

تقریباً چار ماہ تک، یورپ اور مصر و فلسطین کے سفر کے بعد، علامہ اقبال لاہور پہنچے تو خیال تھا کہ اب وہ اپنی مخدوش صحت کے پیش نظر کچھ عرصہ خاموشی کے ساتھ گھر میں رہ کر آرام کریں گے، لیکن شاید آرام، اطمینان اور بے فکری کا ان کی زندگی میں گذر نہ تھا۔ امتِ مسلمہ، خصوصاً ہندی مسلمانوں پر جب کوئی افتاد پڑتی تو وہ اپنا آرام، اطمینان یا خرابیِ صحت، سب باتوں کو بھلا کر مسلمانوں کی دست گیری کے لیے آگے بڑھ کر سرگرمِ عمل ہو جاتے۔

۱

دوسری گول میز کانفرنس سے وہ مایوس لوٹے تھے۔ خواجہ عبدالرحیم کے نام ۱۷ر جنوری ۱۹۳۲ء کے خط میں لکھتے ہیں: ''ولایت کا تجربہ میرے لیے بڑا تلخ ثابت ہوا۔''[۱] اس سے ایک روز پہلے وہ سیٹھ عبداللہ ہارون کے نام ایک خط میں اپنی مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے لکھ چکے تھے کہ ''تجربے نے مجھے سکھایا ہے کہ بہت ہی کم لوگوں پر اعتبار کرنا چاہیے۔''[۲]

اقبال نے گول میز کانفرنس سے مایوس ہو کر ہی مسلم وفد سے علیحدگی اختیار کی تھی۔ خود حکومتِ برطانیہ کا طرزِ عمل بھی مسلمانوں کے لیے پریشان کن تھا۔ ہندستانی سیاست، خصوصاً مسلمانوں کا مستقبل غیر یقینی اور غیر واضح تھا۔ ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں: ''جن ایام میں اقبال واپس آئے، ہندستان کے حالات پھر سے خراب ہو چکے تھے۔ فرقہ وارانہ مسئلے کے حل کے متعلق دوسری گول میز کانفرنس کی ناکامی کے سبب مسلم ہند کا سیاسی مستقبل غیر یقینی تھا۔ کانگرس انگریزی حکومت کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک چلانے کے درپے تھی۔ صوبہ سرحد میں عبدالغفار خان اور ان کے بھائی ڈاکٹر خان صاحب (جن کی سرخ پوش جماعت اگست ۱۹۳۰ء سے کانگرس کے ساتھ وابستہ ہو چکی تھی) جیلوں میں بند تھے اور ان کے حامیوں کے ایجی ٹیشن کو سختی سے دبایا جا رہا تھا۔ ادھر تحریک کشمیر بھی زوروں پر تھی اور کشمیری مسلمان ریاستی حکام کے ظلم کے دَور سے گزر رہے

تھے۔ اسی طرح ریاست اَلوَر میں بھی مسلمانوں پر تشدد کا دَور دَورہ تھا۔[۳] علامہ کو پھر وہی ''کرتا جمع پھر جگرِ لخت لخت کو'' کا مرحلہ درپیش تھا۔ اپنی ملّت سے محبت اور مسلمانوں کے مصائب انھیں مجبور کر رہے تھے کہ وہ خطرات میں گھری ہوئی ناؤ کو ڈوبنے سے بچانے کے لیے کچھ نہ کچھ اقدام کریں۔ ایک ایسے وقت میں جب بقول اقبال: ''قوم کے اہم ترین مفادات کی بازی لگی ہوئی'' [۴] تھی، آل انڈیا مسلم کانفرنس کا اجلاس بلانے کا فیصلہ ہوا۔

اس اجلاس میں ۲۱ر مارچ ۱۹۳۲ء کو علامہ نے جو صدارتی خطبہ پیش کیا، وہ موضوعات و مفاہیم کی جامعیت اور مسائل کے حل کے لیے علامہ کی ٹھوس تجاویز کے اعتبار سے شاید خطبۂ الٰہ آباد سے بھی زیادہ اہم تھا۔ اقبال نے جس بصیرت و بالغ نظری سے ہندی مسلمانوں کے سیاسی و سماجی اور ثقافتی امور و مسائل پر گفتگو کی تھی، وہ اس وقت ہندستان کے کسی اَور مسلم راہ نما سے ممکن نہ تھی۔ عبدالمجید سالک لکھتے ہیں: ''علامہ اقبال کے اس خطبۂ صدارت سے ہندستان اور انگلستان کے سیاسی حلقوں میں خاصی سنسنی پھیل گئی، کیونکہ یہ خطبہ صاف گوئی، خلوص، خودداری اور صداقت کا مظہر تھا اور ضروریاتِ وقت کے مطابق سیاسی تدبر کا بھی شاہکار تھا۔''[۵] اس زمانے میں مسلمانوں کے بعض فوری اور روزمرہ مسائل کے حل کے لیے علامہ مستعد اور فعال رہے۔ ان کے بروقت اقدامات کی بنا پر مسلمانوں کو آزادی کی منزل تک پہنچنے میں بہت مدد ملی۔

اسی سال اقبال نے اپنے انگریزی خطبات کا ساتواں خطبہ Is Religion Possible? لکھا۔ اس کی فرمائش لندن کی ارسطا طالین سوسائٹی نے کی تھی۔ خطبے کی تیاری و تحریر میں تقریباً ایک ماہ صرف ہوگیا۔ نومبر ۱۹۳۲ء میں جب وہ تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے تو وہاں مذکورہ سوسائٹی کے تحت منعقدہ ایک علمی مجلس میں یہ خطبہ پیش کیا۔ واپسی پر اسپین کی سیاحت کی اور اس کے نتیجے میں اردو شاعری کو چند لازوال نظمیں عطا کیں۔

۲

اس اجمال کی تفصیل سے پہلے دو باتوں کا ذکر مناسب ہوگا۔ اوّل: لاہور پہنچتے ہی ماہِ جنوری میں انھیں اپنے عزیز دوست سر میاں محمد شفیع کی وفات (۷ جنوری ۱۹۳۲ء) کا صدمہ سہنا پڑا۔ وہ مسلم لیگ کے ایک نمایاں راہ نما تھے۔ جب لیگ دو دھڑوں میں بٹ گئی تو ایک دھڑا انھی کے نام پر شفیع لیگ کہلاتا تھا، وہ اس کے سیکرٹری اور علامہ اقبال صدر تھے۔ سر محمد شفیع طویل عرصے تک قومی اور ملّی کاموں میں شریک رہے۔

دوم: فروری میں اقبال کا تیسرا فارسی مجموعۂ کلام جاوید نامہ شائع ہوا۔ جس کا آغاز ۱۹۲۷ء میں ہوا تھا۔ اس کی اشاعت اس اعتبار سے حیاتِ اقبال کا نہایت اہم واقعہ ہے کہ علامہ نے اس کی تالیف و ترتیب میں حد درجہ محنت سے کام لیا اور اسے اپنی ادبی کاوشوں کا حاصلِ زندگی (life work) بنانے کے لیے کوشاں رہے۔[6] اس کوشش میں ان کے اپنے بقول ان کے "دل و دماغ نچڑ گئے"۔[7] علامہ کی اس کیفیت پر میر تقی میر کا یہ شعر برمحل معلوم ہوتا ہے:

مصرع کبھی کبھی کوئی موزوں کروں ہوں مَیں
کس خوش سلیقگی سے جگر خوں کروں ہوں مَیں

اقبال کی اپنی نظر میں جاوید نامہ کا مقام کیا تھا، یہ حسب ذیل شعر سے واضح ہوتا ہے[8]:

آنچہ گفتم از جہانے دیگر است　　　　این کتاب از آسمانے دیگر است

اقبال نے ایک خط میں لکھا ہے۔ "یہ ایک قسم کی ڈوائن کامیڈی ہے اور مولانا روم کی طرز پر لکھی گئی ہے۔[9] ایک خط میں اسے ڈوائن کامیڈی کی طرح ایک اسلامی کامیڈی قرار دیا ہے،[10] مولانا اسلم جیراج پوری نے اسے شاہنامۂ فردوسی، مثنویِ رومی، گلستانِ سعدی اور دیوانِ حافظ کے بعد فارسی کی بہترین کتاب قرار دیا ہے۔

جاوید نامہ ایک طرح کی ڈرامائی نظم ہے۔ علامہ اقبال مرشد و عارف رومی کی راہ نمائی میں افلاک کی سیر پر روانہ ہوتے ہیں۔ تلاشِ حقیقت کے اس سفر میں مختلف سیاروں میں وہ مشاہیر کی روحوں سے ملاقات کرتے ہیں۔ ان ملاقاتوں میں عصر حاضر کے بیشتر سیاسی، معاشی اور اخلاقی مسائل پر گفتگو ہوتی ہے اور حیات و ممات، زمان و مکان، اقوام کے عروج و زوال، روحانی ارتقا اور حیاتِ جاوداں وغیرہ پر بصیرت افروز نکات سامنے آتے ہیں۔[11] اس منظوم ڈرامے کی بنیاد واقعۂ معراج النبی پر استوار ہے اور اس کے ذریعے علامہ اقبال نے مقامِ ولایت پر مقامِ نبوت کی برتری کو واضح کیا ہے۔ دنیا کی گیارہ زبانوں میں جاوید نامہ کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ ان میں سے بعض تراجم جزوی ہیں۔

سفر یورپ سے واپسی پر علامہ اقبال کی روزمرہ مصروفیات اَور بڑھ گئی تھیں۔ وہ ہندستانی سیاست کی ایک اہم شخصیت (figure) اور مسلم مفادات کے تحفظ کی ایک علامت بن چکے تھے، اس لیے لوگ بکثرت ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ جاوید اقبال کے بقول: گھر میں ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا۔[12] علاوہ ازیں انھیں بیرونِ لاہور کے سفر بھی کرنے پڑتے، مثلاً: فروری ہی میں

دوبار دہلی کا سفر درپیش ہوا، مگر اتفاق سے ایک بار نقرس کی اچانک تکلیف اور دوسری بار جاوید کی شدید بیماری کے سبب یہ سفر منسوخ کرنے پڑے۔[۱۳]

مارچ میں لاہور میں پہلا یومِ اقبال منایا گیا۔ اس سلسلے میں ۶ تاریخ کو وائی ایم سی اے میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ اہتمام ایک تقریب منعقد ہوئی، جس میں صوفی تبسم، حکیم احمد شجاع، ممتاز حسن، سید محمد عبداللہ، محمد دین تاثیر اور شیخ اکبر علی ارسطو نے اقبال کے فکروفن پر مقالے پیش کیے۔ اگلے روز لورینگ ہوٹل میں علامہ اقبال کے اعزاز میں دعوتِ چاے کا اہتمام کیا گیا۔ تقریباً ڈیڑھ سو معززین موجود تھے۔ اس موقع پر علامہ نے ایک مختصر، مگر عالمانہ تقریر بھی کی۔[۱۴]

۳

۲۱ر مارچ کو باغ بیرونِ دہلی دروازہ، لاہور میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کا اجلاس علامہ اقبال کی صدارت میں منعقد ہوا۔ علامہ نے اپنا مطبوعہ صدارتی خطبہ بزبانِ انگریزی پڑھا۔[۱۵] جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، یہ خطبہ ہندستانی سیاست میں مسلمانوں کے مستقبل کے سلسلے میں انتہائی اہمیّت کا حامل ہے۔ سب سے پہلے علامہ اقبال نے قومیت کے بارے میں اپنے اصولی اور دیرینہ موٌقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ''سیاست کی جڑیں ایک آدمی کی روحانی زندگی میں مستور ہیں...... مَیں قوم پرستی کے خلاف ہوں...... اس میں الحادی مادیت کے جراثیم دیکھتا ہوں، جنھیں جدید انسانیت کے لیے خطرۂ عظیم تصور کرتا ہوں...... جو چیز ازبس ضروری، وہ ہے: آدمی کا ایمان، اس کی ثقافت، اس کی تاریخی روایت؛ میری نظر میں یہ چیزیں ایسی ہیں، جن کی خاطر جینا اور مرنا قبول کیا جا سکتا ہے۔ زمین کے ایک ٹکرے کے لیے نہیں۔''[۱۶]

علامہ نے دوسری گول میز کانفرنس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ انگریزی حکومت کی سیاسی پالیسی، غیر جانبدارانہ توازن برقرار رکھنے کے بجائے ملک کو ہندو مسلم خانہ جنگی کی طرف دھکیل رہی ہے۔ برطانوی وزیرِاعظم رمزے میکڈانلڈ کا جھکاؤ ہمیشہ کانگرس کی طرف رہا ہے۔ علامہ نے کانگرس کے رویے پر بھی تنقید کی اور کہا کہ کانگرس کی سول نافرمانی کی دھمکی کا مقصد صرف یہ ہے کہ حکومتِ برطانیہ کو فرقہ وارانہ مسئلے پر اپنے منشا کے مطابق فیصلہ کرنے پر مجبور کیا جائے۔

علامہ اقبال نے صوبہ سرحد میں انگریزوں کی ظالمانہ پالیسی پر نکتہ چینی کی۔ اسی طرح مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں انھوں نے کشمیریوں کے انسانی حقوق، ڈوگرہ شاہی کے مظالم اور ریاست میں لاقانونیت کا ذکر کیا اور کہا کہ ہندوؤں پر تنقید کے ساتھ ہمیں مسلم معاشرے کے سیاسی اور سماجی

رویّوں اور اپنی انفرادی اور اجتماعی کمزوریوں کا جائزہ بھی لینا چاہیے۔ انھوں نے اظہارِ افسوس کیا کہ ہندی مسلمانوں نے مدّتِ مدید سے اپنی باطنی زندگی میں جھانکنا چھوڑ دیا ہے، چنانچہ یہ خطرہ ہے کہ وہ مخالف اور منفی قوتوں کے ساتھ بزدلانہ مفاہمت نہ کر بیٹھیں۔ انھوں نے مزید کہا: اللّٰہ کسی قوم کی حالت تبدیل نہیں کرتا، تا آنکہ وہ خود اپنے حالات بدلنے کی غرض سے پہل نہ کرے۔ پھر سامعین کو خودی اور ایمان وایقان کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا: محض یقین ہی سے کسی قوم کو منزلِ مقصود کی یکسوئی ملتی ہے اور وہ دائمی بے چینی سے محفوظ رہتی ہے۔ اقبال نے نصیحت کی کہ اپنی خودی کی ساری توانائیاں تکمیلِ ذات پر صرف کر دیجیے۔ سخت کوش ہو جایئے اور محنت سے کام کیجیے۔

علامہ اقبال نے مستقبل کے لائحہ عمل کے بارے میں چند تجاویز پیش کیں:

اوّل: مسلمانوں کی منتشر قوتوں میں یک جہتی اور نظم وضبط کے لیے مسلمانانِ ہند کی صرف ایک سیاسی تنظیم ہونی چاہیے، جس کی شاخیں پورے ملک میں قائم کی جائیں۔

دوم: مرکزی تنظیم کم سے کم پچاس لاکھ روپے کا قومی فنڈ جمع کرے۔

سوم: مرکزی تنظیم کی نگرانی میں نوجوان رضا کاروں کی جماعتیں منظم کی جائیں، جو اصلاحِ رسوم، سماجی خدمت اور اقتصادی تنظیم کا کام کریں، بالخصوص پنجاب کے مسلمان کسانوں کو موجودہ معاشی غلامی سے نجات دلانا انتہائی ضروری ہے۔

علامہ نے کہا: میری رائے میں ہندستان میں اسلام کے مستقبل کا بڑی حد تک دار و مدار پنجاب کے مسلمان کسانوں کی [قرضے کی غلامی سے] آزادی پر ہے۔ آتشِ شباب کو آتشِ ایمان سے ملا دو، تا کہ زندگی کی چمک دمک دو آتشہ ہو جائے۔

چہارم: تمام بڑے شہروں میں عورتوں اور مردوں کے الگ الگ قطعاً غیر سیاسی وثقافتی ادارے قائم کیے جائیں، تا کہ نئی نسل کی خوابیدہ روحانی توانائی کو مجتمع کیا جائے۔ اس سے باطنی آزادی کا شعور اور خودی کی تعمیرِ نَو کا امکان پیدا ہوگا۔ اس سلسلے میں علامہ نے نئے اور پرانے تعلیمی مراکز کے ساتھ ربط وضبط کی ہدایت بھی کی، تا کہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی دُور ہو سکے۔

پنجم: علما کی ایک مجلس قائم کی جائے، جس میں ایسے مسلمان وکلا شامل کیے جائیں، جو جدید فقہ کی تعلیم حاصل کر چکے ہوں، تا کہ جدید حالات کی روشنی میں اسلامی قانون کی حفاظت، اس کی توسیع اور اگر ضروری ہو تو اسلام کے بنیادی اصولوں کی روح کے قریب رہتے ہوئے نئی تعبیر کا اہتمام کیا جائے۔

کانفرنس کے دوروزہ اجلاس میں کئی قراردادیں بھی منظور ہوئیں، جن میں مطالبہ کیا گیا کہ مرکزی حکومت کی ملازمتوں میں مسلمانوں کو ایک تہائی حصّہ اور فوج میں پچاس فی صد ملازمتیں دی جائیں۔ اسی طرح یہ کہ فرقہ وارانہ مسئلے پر حکومت برطانیہ جلد از جلد اپنے فیصلے کا اعلان کرے۔

یہ زمانہ تھا، جب ہندی مسلمان فرقہ وارانہ فیصلے (کمیونل اوارڈ) کا بڑی بے تابی سے انتظار کر رہے تھے، چنانچہ کانفرنس نے طے کیا کہ ۳۰ر جون ۱۹۳۲ء تک مذکورہ فیصلے کا اعلان نہ ہوا تو کانفرنس کی مجلس عاملہ ۳ر جولائی کو اپنا اجلاس منعقد کر کے راست اقدامات کے سلسلے میں مناسب لائحہ عمل طے کرے گی۔ بعد ازاں اقبال سے مشورے کے بعد مولانا شفیع داؤدی نے بحیثیت سیکرٹری جنرل، مجلس عاملہ کا اجلاس آخر جولائی تک ملتوی کر دیا۔ اس پر بعض جلد باز اور جذباتی لوگوں نے اقبال پر آمرانہ رویّے کا الزام لگایا، بلکہ یہ تک کہا کہ اجلاس شملہ والوں (انگریزی حکومت) کے اشارے پر ملتوی کیا گیا ہے۔[17] علامہ اقبال کو اس بہتان تراشی پر دلی رنج ہوا۔ انھوں نے ایک وضاحتی بیان جاری کیا، جس میں کہا کہ اپنی خانگی اور پبلک زندگی میں کسی دوسرے شخص کے ضمیر کی پیروی کبھی نہیں کی۔ ایسے وقت میں، جب کہ جماعت کے بہت ہی اہم مفادات کی بازی لگی ہوئی ہے، اس آدمی کو جو دوسروں کے ضمیر کی پیروی کرتا ہے، مَیں اسلام اور انسانیت کا غدار سمجھتا ہوں۔[18] چند دن کے بعد اقبال پر الزام تراشی کرنے والوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انھوں نے اپنے موقف سے رجوع کر لیا۔

برطانوی وزیراعظم ریمزے میکڈانلڈ نے ۱۶ر اگست ۱۹۳۲ء کو کمیونل اوارڈ (فرقہ وارانہ فیصلے) کا اعلان کیا، جس میں مسلمانوں کے کئی اہم مطالبات تسلیم کر لیے گئے تھے، مثلاً جداگانہ انتخاب، صوبہ سرحد میں مکمل اصلاحات، اقلیتی صوبوں میں مسلم پاسنگ، مگر دوسری طرف پنجاب میں مسلمانوں کو اکثریت سے کم نشستیں دی گئی تھیں، جب کہ سکھوں کو اپنی آبادی (۱۳ء۲ فیصد) کے مقابلے میں ۱۸ء۳ فیصد نشستیں مل گئیں، اسی طرح پنجاب اور بنگال میں مسلم اکثریت کو اقلیت میں بدل دیا گیا۔ اس سے مسلم اکثریت کے صوبوں میں بھی مسلمان غیر مسلموں کے پوری طرح محتاج ہو کر رہ گئے۔[19] مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ نے کمیونل اوارڈ پر غور کر کے اس کے نقائص کی نشان دہی کی۔ مذکورہ اوارڈ اگرچہ مسلمانوں کی خواہشات کے عین مطابق [تو] نہیں تھا، لیکن اس سے بڑی حد تک مسلمانوں کے قومی تشخص کے محفوظ رہنے کا بندوبست موجود تھا،[20] اسی لیے اسے عبوری طور پر منظور کر لیا گیا۔[21]

۴

اس دوران میں وکالت کے ساتھ علامہ اقبال کی سیاسی وغیر سیاسی اور سماجی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔ ۱۹ر جولائی کو عید میلاد النبی کی تقریب میں حصہ لینے کے لیے وہ جالندھر گئے۔ جلوس کے بعد جلسے میں انھوں نے سیرت پر ایک جامع تقریر کی۔ پھر چائے پارٹی میں اقبال کو سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ شام کو لاہور واپس آ گئے۔[۲۲]

اسی زمانے میں مولانا شوکت علی نے شیخ عبدالمجید سندھی سے مل کر ابوالکلام آزاد اور پنڈت مدن موہن مالویہ سے ہندو مسلم مفاہمت کے نام پر گفت و شنید شروع کر دی۔ علامہ اقبال نے بحیثیت صدر مسلم کانفرنس اپنے بعض رفقا کی شراکت میں ۱۶ر اکتوبر کو ایک بیان میں تنبیہ کی کہ اس نازک وقت میں جداگانہ یا مخلوط انتخابات کا مسئلہ قطعاً نہ چھیڑا جائے۔ اس اثنا میں ان لوگوں نے لکھنؤ میں ایک کانفرنس بلانے کا اعلان کیا اور اس میں علامہ اقبال کو بھی مدعو کیا۔ انھوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ یہ کانفرنس مسلم مفاد کے لیے نقصان دہ ہے۔ پھر ایک بیان میں علامہ نے وضاحت کی کہ ہندوؤں کی طرف سے قطعی تجاویز کی عدم موجودگی میں مجوزہ کانفرنس اسلام اور ہندستان کے مفاد کے لیے مضر اور بالکل تضیعِ اوقات کا باعث ہے۔

تیسری گول میز کانفرنس وسط نومبر میں منعقد ہونے والی تھی۔ حکومتِ برطانیہ خطبۂ الہ آباد، دوسری گول میز کانفرنس میں اقبال کے سخت رویّے، پھر آل انڈیا مسلم کانفرنس لاہور میں ان کی تقریر سے خوش نہیں تھی۔ بایں ہمہ وائسرائے ہند نے تیسری گول میز کانفرنس کے مدعوّین کی فہرست میں ان کا نام شامل کر دیا، مگر وزیر ہند نے اسے منظور نہیں کیا۔ اس پر وائسرائے نے وزیر ہند کو لکھا کہ اقبال ہندستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کا روحانی، معنوی اور سیاسی پیشوا ہے، اس لیے وہ کارروائی میں حصہ لیں یا نہ لیں، مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لیے کانفرنس میں ان کی شمولیت ضروری ہے۔ وزیر ہند نے بادلِ نخواستہ اقبال کو بھی دعوت نامہ روانہ کر دیا۔[۲۳]

۵

علامہ اقبال ۱۷ر اکتوبر کو لاہور سے یورپ کے سفر پر روانہ ہوئے۔ سید امجد علی بھی علامہ اقبال کے ہم سفر تھے۔ روانگی سے پہلے روزنامہ ہمدم لکھنؤ کے نام ایک مفصل مکتوب میں واضح کیا کہ جداگانہ انتخاب مسلمانوں کے تمام مطالبات کی اساس ہے۔ بمبئی سے کونٹے روسو نامی بحری

جہاز سے وینس پہنچے اور وہاں سے بذریعہ ریل پیرس۔ علامہ کے دوست سردار امراؤ سنگھ مجیٹھیا شیرِ گل نے ریلوے اسٹیشن پر ان کا خیر مقدم کیا اور ہوٹل میں ٹھہرا دیا۔ پہلے ہی روز علامہ کی فرمائش پر امراؤ سنگھ انھیں نپولین کے مقبرے پر لے گئے۔ خیال رہے کہ علامہ اقبال نپولین کے مداح تھے۔ بالِ جبریل (ص ۱۴۹) کی نظم ''نپولین کے مزار پر'' میں نپولین کو جوشِ کردار کی علامت بنا کر خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے:

راز ہے راز ہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز
جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز
جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع
کوہِ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز
جوشِ کردار سے تیمور کا سیلِ ہمہ گیر
سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز
صفِ جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر
جوشِ کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز!

پیرس میں اقبال دو تین روز ٹھہرے۔ اس دوران فرانسیسی عالم میسی نیوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ یورپ کی بیداری اور ترقی میں مسلمانوں کے تہذیبی احسانات کا قائل تھا۔[۲۴] دو یا تین روز بعد اقبال اور سید امجد علی ریل سے لندن پہنچے تو نو مسلم انگریز خالد شیلڈرک نے ان کا خیر مقدم کیا۔ اقبال کو برطانوی سیاست دان جان برائٹ کی تقریروں کا مجموعہ پیش کرتے ہوئے ان سے درخواست کی کہ گول میز کانفرنس کی کارروائیوں میں شریک ہونے سے پہلے ہی اس کا مطالعہ کر لیں۔ اس طرح آپ اپنا مؤقف بہتر طریقے سے پیش کر سکیں گے۔ اس بار ان کا قیام سینٹ جیمز پارک میں واقع کوئین اینز مینشنز میں تھا۔[۲۵] کتاب اتنی دل چسپ تھی کہ علامہ نے نصف شب کے قریب اس کا مطالعہ مکمل کر کے ہی دم لیا۔

لندن کے دو ماہی قیام میں اقبال نے متعدد تقریبات اور استقبالیوں میں شرکت کی، مثلاً مس فارقوہرسن کی قائم کردہ نیشنل لیگ کا استقبالیہ، پھر ۱۵ دسمبر کا اجلاس۔ ان دونوں جلسوں میں اقبال نے برطانوی حکومت کے تعاون سے ایک ایسے آئین کی تیاری پر زور دیا، جس کی ناکامی کا امکان نہ ہو۔ اقبال نے مزید کہا کہ مسلمانوں کا اہم ترین مسئلہ اپنی تہذیب و ثقافت کا تحفظ اور اپنی

روایات کے مطابق شاہراہِ ترقی پر گامزن ہونا ہے۔[۲۶] بحیثیت مجموعی اقبال نے ہر جگہ وہی مطالبات دُہرائے، جو وہ گذشتہ دو تین سالوں سے عوام و خواص اور اہلِ صحافت کے سامنے پیش کرتے چلے آ رہے تھے، یعنی جداگانہ انتخابات، صوبائی خود مختاری، سندھ کی بمبئی سے علیحدگی، سرحد کا مساوی درجہ، بلوچستان میں اصلاحات اور اسمبلیوں میں ۳۳ فیصد نمائندگی۔ اسی دوران میں اقبال نے ارسطاطالین سوسائٹی میں اپنا علمی خطبہ پیش کیا، مگر اس جلسے کی تفصیلات دستیاب نہیں۔

قیامِ لندن کے دنوں میں کبھی کبھار بازار بھی جانا ہوتا تھا۔ اسی سفر میں انھوں نے والدۂ جاوید کے لیے چند زیورات خریدے تھے۔ عین ممکن ہے، لندن ہی سے لیے ہوں۔ ایک دفعہ وہ سید امجد علی کے ہمراہ لندن کی مشہور دُکان Self Ridges پر ضرورت کی کچھ چیزیں خریدنے کے لیے گئے۔ سیلز گرل سے جرابیں دکھانے کو کہا۔ وہ لڑکی تیزی کے ساتھ سامان لینے کے لیے چلی گئی، جب واپس آئی تو علامہ پر استغراق کی کیفیت طاری ہو چکی تھی، جیسے دُکان میں آنے کا مقصد تک بھول گئے ہوں۔ لڑکی جرابیں لے کر پلٹی تو ڈاکٹر صاحب نے اس سے پوچھا: تم یہاں کس لیے کھڑی ہو؟ لڑکی یہ سن کر آب دیدہ ہو گئی۔ علامہ کو ہمدرد اور غم خوار پا کر اس نے بتایا کہ اس کے والدین غریب ہیں، ان کی مدد کے لیے اسے نوکری کرنی پڑتی ہے۔ سید امجد علی نے پوچھا: آپ نے اس لڑکی سے یہ سوال کیوں کیا؟ علامہ نے جواب دیا: اس خاتون کو کسی گھر کی روشنی بننا تھا، اولاد کی صحیح تربیت کا فرض انجام دینا تھا، اس کی تخلیق کا مقصد بازار کی رونق بن کر جرابیں فروخت کرنا تو نہیں تھا۔[۲۷]

اسی نوعیت کے یا قدرے مختلف مزید مشاہدات بھی پیش آئے ہوں گے۔

علامہ اقبال گول میز کانفرنس کے باقاعدہ اختتام سے پہلے ہی ۳۰ر دسمبر کو لندن سے روانہ ہو گئے۔ ممکن ہے، بالِ جبریل (ص ۵۱) کی غزل ۱۲۸ اسی موقع پر لکھی گئی ہو۔ خصوصاً اس کا یہ شعر:

فرنگ میں کوئی دِن اور بھی ٹھہر جاؤں\
مِرے جنوں کو سنبھالے اگر یہ ویرانہ

پیرس پہنچتے ہی معروف فلسفی پروفیسر برگساں کے ہاں ملاقات کے لیے گئے۔ برگساں ان دنوں خاصے علیل اور نحیف و نزار تھے اور لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر چکے تھے۔ اقبال کہتے ہیں: انھوں نے ازراہِ عنایت مجھے اس قدغن سے مستثنیٰ رکھا۔[۲۸] جدید فلسفے اور تمدن پر دونوں کے درمیان تقریباً دو گھنٹے تک پُر مغز گفتگو جاری رہی۔ کچھ وقت انھوں نے آئر لینڈ کے فلسفی برکلے پر بھی

تبادلۂ خیال کیا۔[۲۹] اقبال نے اسی ملاقات میں برگساں کو نبی کریمؐ سے منسوب یہ حدیث قدسی سنائی کہ زمانے کو بُرا مت کہو، مَیں خود زمانہ ہوں۔ برگساں بہت حیران ہوا۔ اس ملاقات میں سردار امراؤ سنگھ بھی موجود تھے۔

۶

علامہ اقبال کئی برس سے ہسپانیہ دیکھنے کے آرزومند تھے۔[۳۰] یقیناً، یہی وقت تھا ان کے دیرینہ خواب کی تکمیل کا۔ خیال رہے کہ اس دَورے میں وہ جرمنی بھی جانا چاہتے تھے۔ انھوں نے گزشتہ سال ویگے ناسٹ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ آئندہ سال ہائیڈل برگ آکر اس سے ملیں گے۔ اب قیامِ لندن کے دوران میں ۱۲؍دسمبر ۱۹۳۲ء کے خط میں موعودہ ملاقات کا عزم تازہ کیا تھا۔ ۲۹؍ دسمبر کے خط میں لکھا: ''مَیں ۱۸؍ جنوری کو رات ۱۰ بج کر ۲۳ منٹ پر ہائیڈل برگ پہنچوں گا''،[۳۱] مگر ہسپانیہ کا دَورہ طویل ہو گیا، چنانچہ انھوں نے ویگے ناسٹ کو میڈرڈ سے ۲۱؍ جنوری کو مطلع کیا کہ اب میرے لیے ہائیڈل برگ آنا ممکن نہیں رہا۔ ہائیڈل برگ اور ویگے ناسٹ سے ملاقات پر ہسپانیہ دیکھنے کا اشتیاق غالب آگیا تھا۔

جنوری کے پہلے ہفتے میں (غالباً ۵ یا ۶ کو) وہ میڈرڈ کے لیے روانہ ہو گئے۔ ان کا یہ دَورہ تقریباً تین ہفتوں پر محیط تھا۔ اس عرصے میں انھوں نے ہسپانوی عالم پروفیسر میگول سن پلے چوائس (Miguel Asin Polacios) کی زیرِصدارت The Intellectual World of Islam and Spain کے موضوع پر میڈرڈ یونی ورسٹی میں ایک لیکچر دیا۔[۳۲] ہسپانیہ میں قیام کے دوران میں عربی کے متعدد پروفیسروں سے ملاقات ہوئی، جو بقول اقبال: ''اسلامی تہذیب و ثقافت کے بارے میں بہت پُرجوش نظر آتے تھے۔''[۳۳]

تین ہفتے کے اس دَورے میں انھیں اسپین کے پانچ شہر (میڈرڈ، قرطبہ، غرناطہ، اشبیلہ اور طلیطلہ) دیکھے۔ انھوں نے قرطبہ میں مسلم دَورِحکومت کے تعمیری شاہکار مسجدِ قرطبہ کو خاص دلچسپی سے دیکھا اور بعض روایات کے مطابق مسجد میں اذان دی اور دو نفل بھی ادا کیے۔ وہ اس نادر الوجود مسجد کو دیکھ کر اس کے تقدس اور حسن و جمال سے غیرمعمولی طور پر متاثر ہوئے۔ شیخ محمد اکرام کو ایک خط میں لکھا: ''مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی ایسی رفعت تک پہنچا دیا، جو مجھے پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔''[۳۴] اسی لیے اپنے بیٹے جاوید اقبال کو لکھا: ''مَیں خدا کا شکر گزار ہوں کہ اس مسجد کو دیکھنے کے لیے زندہ رہا۔ یہ مسجد تمام دنیا کی مساجد سے بہتر ہے۔ خدا کرے کہ تم جوان ہو کر

اس عمارت کے انوار سے اپنی آنکھیں روشن کرو۔[۳۵] اسی طرح علامہ نے غلام رسول مہر کو لکھا: ''مرنے سے پہلے قرطبہ ضرور دیکھو''۔[۳۶] بالِ جبریل کی نظم ''مسجد قرطبہ'' زیارتِ مسجد کی یادگار اور اقبال کے ارفع جذبات کی آئینہ دار ہے۔ بالِ جبریل کی ایک اَور نظم ''دعا'' کی تخلیق کا محرک بھی یہی مسجد تھی۔ ''مسجد قرطبہ'' میں اقبال نے اپنے بلند پایہ فکر کے نمایاں پہلوؤں کا ذکر ایسی مہارت اور فن کاری سے سمو دیا ہے کہ موضوع بدلتا ہے، مگر اس کا ربط کسی نہ کسی حوالے سے نظم سے قائم رہتا ہے اور بذاتِ خود نظم کا تسلسل بھی نہیں ٹوٹتا۔ دیکھیے، تصورِ عشق، تصورِ فن اور مردِ کامل کے بارے میں چند اشعار دیکھیے:

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام
مردِ خدا کا عمل، عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اُس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رَو
عشق خود اِک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام

....

اے حرمِ قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام، جس میں نہیں رفت و بود
رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف وصوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
معجزۂ خونِ جگر، سِل کو بناتا ہے دل
خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود
تیرا جلال و جمال مردِ خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل و جمیل، تو بھی جلیل و جمیل
تیری بنا پائدار، تیرے ستوں بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجومِ نخیل!
تیرے در و بام پر وادیِ ایمن کا نور
تیرا منارِ بلند جلوہ گہِ جبرئیل

تجھ سے ہوا آشکار ، بندۂ مومن کا راز
اس کے دِنوں کی تپش ، اس کی شبوں کا گداز
اس کا مقامِ بلند ، اس کا خیالِ عظیم
اس کا سرور ، اس کا شوق ، اس کا نیاز
ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں ، کارکشا ، کارساز

....

بعد میں ایک موقع پر کسی نے علامہ سے پوچھا کہ ''مسجد کو دیکھ کر آپ پر کیا اثر ہوا تھا؟'' تو انھوں نے انگریزی میں جواب دیا: It is a commentary on the Qur'an written in stones۔ (یہ قرآن کی ایسی تفسیر ہے، جو پتھروں کے ذریعے لکھی گئی ہے۔)[۳۷] درحقیقت ''نظم کا موضوع جس قدر عظیم اور رفیع الشان ہے، اس کا فنی پیرایہ بھی اسی قدر حسین و جمیل ہے۔ ''مسجد قرطبہ'' کا تقدس، اس کی رفعت و پاکیزگی اور جلال و جمال، اقبال کی اس نظم کی صورت میں مجسم ہو کر ہمارے سامنے آ گیا ہے۔ اسے پڑھ کر قاری کے دل و دماغ پر مسجد قرطبہ کی شوکت و سطوت کا ایک نقش قائم ہوتا ہے اور یہ نظم ایک ایسا معجزۂ فن معلوم ہوتی ہے، جس کی تکمیل اقبال نے اپنے خونِ جگر کے ذریعے کی ہے۔''[۳۸] یوں تو بالِ جبریل کی چھے نظمیں اقبال کے دورۂ ہسپانیہ کی یادگار ہیں اور یہ سب اردو کی بہترین نظموں میں شمار ہونے کے لائق ہیں، مگر ان سب میں ''مسجد قرطبہ'' فکر و فن کا ایسا شاہ کار ہے، جس کی مثال دنیا جہان کی شاعری میں کم ہی ملے گی۔

علامہ اقبال نے قرطبہ شہر کے نواح میں مدینۃ الزہرا کے کھنڈر بھی دیکھے۔ بعد ازاں غرناطہ بھی گئے۔ تاریخی اہمیت کی مختلف عمارتوں نے فنِ تعمیر کے نقطۂ نظر سے بھی اقبال کو متاثر کیا۔ ایک موقع پر کہنے لگے: ''اندلس کی بعض عمارتوں میں اسلامی فنِ تعمیر کی خاص کیفیت جھلکتی ہے۔ وہاں کی تین عمارتوں میں مجھے ایک خاص فرق نظر آیا۔ قصر الزہرا دیووں کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے، مسجد قرطبہ مہذب دیووں کا، مگر الحمرا محض انسانوں کا۔''[۳۹] الحمرا کے بارے میں ایک اَور موقع پر کہا: ''اس کی زیارت کا مجھ پر کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔'' بحیثیت مجموعی دورۂ ہسپانیہ، ان کی زندگی کا ایک یادگار سفر ثابت ہوا۔ مجموعی تاثر ایک حد تک نظم 'ہسپانیہ' میں جھلکتا ہے:

ہسپانیہ! تو خونِ مسلماں کا امیں ہے
مانندِ حرم پاک ہے تو میری نظر میں

پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں
خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں
غرناطہ بھی دیکھا مِری آنکھوں نے و لیکن
تسکینِ مسافر ، نہ سفر میں نہ حضر میں

گذشتہ سفرِ یورپ میں غلام رسول مہر اقبال کے ہمراہ تھے، لیکن اس دَورے میں خصوصاً اسپین کے دَورے میں ان کے ساتھ کوئی رفیقِ سفر نہیں تھا، اس لیے اس دَورے کے حالات نسبتاً کم دستیاب ہیں۔ البتہ اس دَورے میں ایک دلچسپ بات یہ ہوئی کہ میڈرڈ میں ایک دُبلی پتلی انگریز لڑکی کو، جو ان کے مترجم یا پرائیویٹ سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہی تھی، اخبار نویسوں نے غلطی سے اقبال کی بیٹی سمجھا۔[۴۰]

۲۶ رجنوری کو ہسپانیہ سے واپس پیرس پہنچے۔[۴۱] واپس وطن روانہ ہونے تک وہ کئی روز پیرس میں مقیم رہے۔ ممکن ہے، ہسپانیہ سے متعلق نظموں کے بعض حصّے انھی دِنوں میں لکھے گئے ہوں۔ انھی ایام میں علامہ نے پیرس کی مسجد میں واقع مراکشی طرزِ تعمیر کی مسجد بھی دیکھی ہوگی، مگر وہ انھیں پسند نہیں آئی۔ ضرب کلیم (ص ۱۰۲-۱۰۳) کی نظم ''پیرس کی مسجد'' میں اس ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا ہے۔ مسجدِ قرطبہ کے بعد کوئی اَور مسجد اقبال کی نظر میں کیسے جچتی!

کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی کہ ۲۶ رجنوری اور ۸، ۹ رفروری کے درمیانی دِنوں میں وہ پیرس سے کہیں باہر گئے ہوں۔[۴۲] تقریباً دو ہفتے انھوں نے وہیں اپنے دوست سردار امراؤ سنگھ کی معیت ہی میں گزار دیے۔ معروف عجائب گھر Louvre دیکھا، کچھ اَور آثار بھی دیکھے ہوں گے۔ انھوں نے ویگے ناسٹ سے بارہا ہائیڈل برگ آنے کا وعدہ کیا تھا اور اب وہ بآسانی وہاں جا سکتے تھے، مگر نہیں گئے، کیوں؟ اس سلسلے میں ڈاکٹر سعید اختر درانی کا خیال ہے کہ اگر اقبال واقعی شدت [تہِ دل] سے ہائیڈل برگ کا سفر کرنا چاہتے تو کسی نہ کسی طور پر یہ عین ممکن تھا، لیکن ہوسکتا ہے کہ ۲۶ برس کی مدت کے بعد، جب وہ دونوں خاصے عرصے عمر رسیدہ ہو چکے تھے، علامہ مس ویگے ناسٹ سے ملنے سے ہچکچاتے ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب۔''[۴۳] راقم کا قیاس بھی یہی ہے کہ اقبال، نفسیاتی طور پر، ایما کا سامنا کرنے سے گریزاں تھے۔

علامہ ۸ یا ۹ رفروری کو پیرس سے چل کر بذریعہ ریل گاڑی وینس پہنچے ہوں گے اور ۱۰ رفروری کو وہاں سے بحری جہاز کونٹے وردی کے ذریعے وطن روانہ ہو گئے۔ ۲۲ رفروری کو بمبئی بندرگاہ

پہنچے۔ جاوید اقبال لکھتے ہیں: ''کسٹمز سے نکلتے وقت ڈیوٹی ادا کرنے کی خاطر سردار بیگم کے زیورات کا ڈبا سوٹ کیس سے نکال کر اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ کسی ساتھی نے مشورہ دیا کہ کم از کم انگشتریاں تو انگلیوں میں پہن لیجیے، کچھ ادا نہ کرنا پڑے گا، مگر وہ نہ مانے اور تمام زیورات پر، جو بھی ٹیکس لگا، ادا کر کے باہر آئے۔[۴۴]

دراصل علامہ اقبال حتی الوسع قاعدے قانون کی پابندی کے قائل تھے اور کسی حیلے بہانے سے قانون سے بالاتر ہو کر فائدہ اٹھانے کو ناجائز سمجھتے تھے، اسی لیے انھوں نے زیورات پر وہ ٹیکس پورا پورا ادا کیا، جو از رُوے قانون واجب تھا۔ شیخ اعجاز احمد نے اسی طرح کا ایک واقعہ بیان کیا ہے، لکھتے ہیں کہ سیالکوٹ میں جاوید کی ملکیت کا ایک مکان کسی قریبی عزیز کو فروخت کرنے کا مرحلہ درپیش تھا۔ قیمتِ فروخت رعایتی تھی، خریدار رجسٹری میں زیادہ رقم لکھوانا چاہتے تھے، تاکہ آئندہ کوئی پڑوسی قانون شفعہ کے تحت مکان ان سے نہ لے سکے۔ ان کے اصرار کے باوجود علامہ اقبال نے بیع نامہ میں طے شدہ رعایتی [کم] قیمت ہی لکھوائی۔ کچھ عرصے کے بعد وہی ہوا، جس کا خدشہ تھا۔ پڑوسی نے رعایتی قیمت ادا کر کے مکان کی ڈگری حاصل کر لی۔ اقبال کے عزیز عمر بھر ان سے شکوہ کناں رہے۔ کہا کرتے تھے: ''جی، ایناں سچ وی کس کم دا، جدے نال اپنیاں دا نقصان ہووے''[۴۵] ...... یعنی اتنی راست گوئی بھی کس کام کی، جس سے اپنوں کا نقصان ہو۔

۲۵ رفروری کو فرنٹیر میل سے لاہور پہنچے تو ایک بہت بڑے ہجوم نے ان کا استقبال کیا۔ اس ہجوم میں اکابرینِ شہر کی اچھی خاصی تعداد بھی موجود تھی۔

جمعیت الاسلام کی طرف سے خواجہ فیروز الدین بیرسٹر نے سپاس نامہ پیش کیا اور مسلمانانِ ہند کے حقوق کی ترجمانی کے سلسلے میں ان کی خدمات کو سراہا۔ علامہ نے سپاس نامے کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ اب تک میری زندگی کا مطمح نظر یہی رہا ہے کہ مسلمان اپنی موجودہ پستی کی حالت سے نکل کر بلندی پر پہنچ جائیں اور ان میں جو کمزوریاں اور اختلافات رونما ہو گئے ہیں، وہ دُور ہو جائیں۔ جہاں تک مجھ سے ہو سکا، مَیں نے گول میز کانفرنس میں اسلامی حقوق کے تحفظ کی پوری پوری کوشش کی ہے اور کوئی ایسا لفظ نہیں کہا، جس سے مسلمانوں کے حقوق کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو...... اپنی تقریر کو ختم کرتے ہوئے ...... یہی درخواست کروں گا کہ آپ اپنے اختلافات کو، خواہ سیاسی ہوں یا مذہبی، بالکل مٹا دیں اور ایک ہو جائیں۔[۴۶]

حوالے اور حواشی

۱۔ انوارِ اقبال، ص۲۴۶
۲۔ *Letters & Writing of Iqbal*، ص۹
۳۔ زندہ رُود، ص۵۳۱
۴۔ ذکرِ اقبال، ص۱۶۶
۵۔ ذکرِ اقبال، ص۱۶۴
۶۔ *Letters of Iqbal*، ص۱۱۹
۷۔ ملفوظات، ص۹۶
۸۔ جاوید نامہ، ص۱۱
۹۔ اقبال نامہ، ص۲۰۰-۲۰۱
۱۰۔ مکتوباتِ اقبال، ص۱۳۲-۱۳۳
۱۱۔ سرودِ سحر آفریں، ص۱۳۰
۱۲۔ زندہ رُود، ص۵۳۴
۱۳۔ انوارِ اقبال، ص۹۸-۹۹
۱۴۔ روز نامہ انقلاب، لاہور، ۹ مارچ ۱۹۳۲ء، بحوالہ مخفی گوشے، ص۱۴۰، ۱۴۱۔ خواجہ عبدالوحید نے یومِ اقبال کی تاریخ ۶ ر ستمبر لکھی ہے۔ (اقبالیاتِ خواجہ، ص۳۶) جو درست معلوم نہیں ہوتی۔
۱۵۔ متن دیکھیے: *Speeches*، ص۲۶-۳۶
۱۶۔ *Speeches*، ص۳۱
۱۷۔ زندہ رُود، ص۵۳۹
۱۸۔ بحوالہ زندہ رُود، ص۵۴۰
۱۹۔ علامہ اقبال کی سیاسی زندگی، ص۱۰۶-۱۰۷
۲۰۔ سر گذشتِ اقبال، ص۴۰۴
۲۱۔ علامہ اقبال کی سیاسی زندگی، ص۱۰۹
۲۲۔ انقلاب، ۲۰ ر جولائی ۱۹۳۲ء، بحوالہ ذکرِ اقبال، ص۱۷۷
۲۳۔ روایت: عاشق حسین بٹالوی، اقبال اور تحریکِ پاکستان، ص۱-۳
۲۴۔ میکی نیوں سے اقبال کے تعلقات پر دیکھیے: محمد صدیق کا مضمون: ''اقبال اور میکی نیوں''، مشمولہ علامہ اقبال اور ان کے بعض احباب، ص۹۶-۱۹۵
۲۵۔ اقبال یورپ میں، ص۲۱۵
۲۶۔ ارمغانِ اقبال، ص۲۰۸
۲۷۔ روز گارِ فقیر [اوّل]، ص۱۳۷-۱۳۸

۲۸۔ *Letters & Writings of Iqbal*، ص۱۸۲

۲۹۔ خطوطِ اقبال، ص۲۲۴-۲۲۵

۳۰۔ اقبال نامہ، ص۲۹۴

۳۱۔ اقبال یورپ میں، ص۲۱۶

۳۲۔ خطوطِ اقبال، ص۲۱۱

۳۳۔ ایضاً، ص۲۲۶

۳۴۔ اقبال نامہ، ص۵۸۴

۳۵۔ خطوطِ اقبال، ص۲۲۳۔ جاوید اقبال کو اگست ۱۹۷۵ء میں پہلی بار مسجد قرطبہ دیکھنے اور وہاں نماز ادا کرنے کا موقع ملا۔ (زندہ رُود، ص۵۵۴)

۳۶۔ خطوطِ اقبال، ص۱۹۲

۳۷۔ مقالاتِ یوسف سلیم چشتی، ص۳۶

۳۸۔ اقبال کی طویل نظمیں، ص۱۸۷

۳۹۔ ملفوظات، ص۱۲۵

۴۰۔ زندہ رُود، ص۵۵۲

۴۱۔ ایضاً، ص۵۵۲، اور ۵۵۷

۴۲۔ سعید اختر درانی نے لکھا ہے کہ اقبال میڈرڈ سے ۲۶ رجنوری کو واپس لندن پہنچے اور پھر لندن ہی سے وینس کے سفر کے لیے روانہ ہوئے۔ (اقبال یورپ میں، طبع ۱۹۹۹ء۔ ص۲۲۹-۲۳۰) مگر ہسپانیہ سے واپسی پر وہ لندن نہیں پیرس پہنچے تھے۔ غلام رسول مہر کے نام کیم فروری ۱۹۳۳ء کے خط (مرقومہ از لولیتا ہوٹل، پیرس) میں لکھتے ہیں: ''۲۶ رجنوری کو ہسپانیہ کے سفر سے واپس آیا'' (انوار اقبال، ص۱۰۲)۔ پھر جیسا کہ ہم نے اُوپر لکھا ہے: ۲ تا ۸ یا ۹ فروری کے درمیانی عرصے میں بھی ان کے لندن جانے کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ وہ پیرس ہی میں مقیم رہے اور وہیں سے، غالباً ریل کے ذریعے، وینس کے لیے روانہ ہوئے۔

۴۳۔ اقبال یورپ میں، ص۳۳۰

۴۴۔ زندہ رُود، ص۵۵۷

۴۵۔ مظلوم اقبال، ص۷۵-۷۶

۴۶۔ ارمغانِ اقبال، ص۲۳۶

❖......❖......❖

(۱۹)

کہ ایں زمیں ز طلسمِ فرنگ آزاد است

تقریباً ساڑھے چار ماہ کے سفر کے بعد، مطلوب تو یہ تھا کہ مسافر چند دِن ستا لیتا، کچھ آرام کرتا۔ عمر کا فطری تقاضا بھی یہی تھا کہ اسے چند روز ذہنی سکون و اطمینان سے رہنے کا موقع میسر آتا، مگر مسلمانوں کی صفوں میں علامہ اقبال جیسے مخلص اور سمجھ دار لیڈروں کی شدید کمی تھی، اس لیے جب کبھی کوئی سیاسی وسماجی یا ملکی اور مقامی مسئلہ یا مشکل یا ضرورت درپیش ہوتی تو اقبال ہر قفل کی کلید سمجھے جاتے اور انھی کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔ یورپ سے واپس لاہور پہنچتے ہی انھیں روزمرہ مصروفیات نے گھیر لیا۔

۱

یکم مارچ ۱۹۳۳ء کو اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے ٹاؤن ہال باغ لاہور میں اقبال کے اعزاز میں ایک استقبالیے کا اہتمام کیا۔ دو تین روز بعد رؤف پاشا کے لیکچروں کی صدارت کے لیے انھیں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی بلایا گیا۔ ۶ر مارچ کو واپس آئے، مگر مارچ ہی میں انھیں مزید دوبارہ دہلی کا سفر کرنا پڑا۔

اپریل کے پہلے ہفتے میں تعلیم کے مسئلے پر وائس رائے کی کانفرنس میں شرکت کے لیے پھر دہلی گئے۔[۱] اور غالباً جامعہ ملیہ میں From London to Granada کے موضوع پر لیکچر بھی دیا۔[۲]

آئندہ چند مہینوں میں اقبال معمول کی مصروفیات میں الجھے رہے۔ وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی مسئلے پر بیان یا کوئی اپیل شائع کرتے یا کسی جلسے کی صدارت یا تقریر کے لیے جانا پڑتا۔ بعض اوقات کسی مسئلے کی سنگینی کے پیشِ نظر حکامِ بالا یا وائس رائے کو تار دے کر متوجہ کرتے۔ ۳۰ر جون کو انھوں نے بطور قائم مقام صدر آل انڈیا کشمیر کمیٹی، ملک برکت علی کے اشتراک سے ایک مفصل اپیل شائع کرائی، جس میں کہا گیا تھا کہ مسئلہ کشمیر تمام مسلمانانِ ہند کی سیاسی حیات و موت کا مسئلہ ہے۔ اس لیے اہلِ کشمیر سے ناروا سلوک درحقیقت مسلمانانِ ہند سے ناروا سلوک کے مترادف ہے۔

کشمیری، ملتِ اسلامیہ ہند کا جزوِ لاینفک ہیں۔ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے پاس جو روپیا تھا، وہ خرچ ہو چکا ہے، اب کمیٹی ملتِ اسلامیہ سے مخلصانہ اور پُر زور اپیل کرتی ہے کہ وہ رقوم کی فراہمی کے لیے کمیٹی سے تعاون کریں۔[۳]

خیال رہے کہ پنجاب کے مسلمانوں نے کشمیریوں کی اعانت اور جدو جہد آزادی میں ان کی مدد کرنے کے لیے ۱۹۳۱ء میں ایک کشمیر کمیٹی بنائی تھی، جس کے صدر مرزا بشیر الدین محمود تھے۔ وہ جملہ معاملات میں من مانی کیا کرتے تھے۔ جب کمیٹی کے قواعد وضوابط مرتب کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو مرزا بشیر الدین نے صدارت سے استعفا دے دیا۔ ان کی جگہ علامہ اقبال کو قائم مقام صدر چنا گیا۔ مذکورہ بالا بیان صدر اور سیکرٹری کی طرف سے جاری کیا گیا تھا۔ اقبال نے کمیٹی کا دستور مرتب کرایا تو قادیانی ممبروں نے اس کی مخالفت کی۔ اقبال نے ۲۰ رجون کو کشمیر کمیٹی سے استعفا دیتے ہوئے اپنے بیان میں افسوس ظاہر کیا کہ بعض ارکان اپنے فرقے کے امیر کے وفادار ہیں اور وہ کسی ضابطے اور دستور کو تسلیم کرنے سے انکاری ہیں۔ مسلمانوں کے ایک نمائندہ اجلاس میں ایک نئی آل انڈیا کشمیر کمیٹی قائم کی گئی، جس کے صدر اقبال اور سیکرٹری برکت علی مقرر ہوئے۔[۴] قادیانیت اور کشمیر کمیٹی کا ذکر آگے چل کر، باب ۲۰ میں بھی ہوگا۔

۱۱ راگست کو علامہ نے وائس رائے ہند کے نام ایک تار کے ذریعے مطالبہ کیا کہ سرحدی علاقوں پر بمباری بند کی جائے اور متنازعہ معاملات پر باہمی گفت وشنید کی جائے۔[۵] ستمبر میں پین اسلام ازم کے موضوع پر اقبال نے سر فضل حسین کے ایک بیان کے حوالے سے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ پین اسلام ازم سے اسلام کی عالم گیر سلطنت بہت مختلف ہے۔ اسلام ایک عالم گیر سلطنت کا یقیناً منتظر ہے، جو نسلی امتیازات سے بالاتر ہوگی اور جس میں شخصی اور مطلق العنان بادشاہتوں اور سرمایہ داریوں کی گنجائش نہ ہوگی۔ دنیا کا تجربہ خود ایسی سلطنت پیدا کر دے گا۔ غیر مسلموں کی نگاہ میں شاید یہ محض خواب ہو، لیکن مسلمانوں کا یہ ایمان ہے۔[۶]

مطالعہ اور علمی تحقیق بھی، اقبال کی مصروفیات کا اہم حصہ تھا۔ اس زمانے کے بعض خطوط، مثلاً بنام سید سلیمان ندوی (۸، ۲۲ راگست اور ۴ ستمبر) اور بنام پیر مہر علی شاہ گولڑوی (۸ ستمبر) سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بعض فکری وعلمی مسائل پر تحقیق کر رہے تھے۔ اسی زمانے میں اوکسفرڈ یونی ورسٹی کے لیکچروں کی تیاری بھی جاری تھی۔ اگرچہ مسلسل دوبار یورپ کے طویل سفروں کی وجہ سے وکالت کی پریکٹس بہت بے قاعدہ ہو چکی تھی، تاہم ابھی یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا اور اس کے لیے بھی

انھیں کچھ نہ کچھ وقت نکالنا پڑتا تھا۔ ۳۱-۱۹۳۰ء میں اقبال کی آمدنی ۱۶۸۹۴؍روپے تھی، مگر ۳۲-۱۹۳۱ء میں یہ صرف ۳۷۵۶؍روپے رہ گئی۔ ۳۳-۱۹۳۲ء میں ۴۶۵۷ روپے اور ۳۴-۱۹۳۳ء میں ۴۱۰۶؍روپے کی آمدن ہوئی۔ بیرونِ ملک دَوروں سے انھیں مالی طور پر شدید نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ اس کے باوجود وہ آئندہ برس رہوڈز لیکچروں کے لیے اوکسفرڈ جانے کو تیار تھے، مگر اس سے پہلے انھیں شاہِ افغانستان کی طرف سے دَورۂ افغانستان کے لیے دعوت نامہ موصول ہوا۔

۲

ممالکِ اسلامیہ کی سیاحت ہمیشہ علامہ اقبال کا ایک خواب رہا۔ ۱۹۲۵ء سے وہ مسلم دنیا کی سیر و سیاحت کا پروگرام بنا رہے تھے۔ اقبال کے اس مجوزہ سفر کی منازل میں کابل، غزنی، سمرقند، بخارا، مرو، شیراز، اصفہان، بغداد، کربلا، انگورہ، قسطنطنیہ، قاہرہ، فلسطین، مدینہ اور مکہ شامل تھے۔[۷]

افغانستان سے اقبال کی دل چسپی کا آغاز خلافت اور ہجرت کی تحریکوں کے زمانے سے ہوتا ہے۔ ۱۹۲۲ء میں انھوں نے کابل اور قسطنطنیہ کو بذریعہ ریل ملا دینے کی تجویز پیش کی اور کہا کہ یہ ریل وسطی ایشیا کی ان تمام اسلامی ریاستوں میں سے ہو کر گزرنی چاہیے، جو روس کے تسلط سے آزاد ہوں۔ اقبال اپنی تجویز کو اس قدر اہم سمجھتے تھے کہ انھوں نے اس منصوبے کے لیے تمام اسلامی دنیا سے چندہ جمع کرنے کی تجویز بھی پیش کی۔[۸]

پیامِ مشرق (۱۹۲۳ء) کا انتساب شاہِ افغانستان امیر امان اللہ خاں کے نام ہے۔ افغانستان کو برطانوی اقتدار سے آزاد کرانے اور ملک میں بعض اصلاحات کے نفاذ کی وجہ سے علامہ، شاہ امان اللہ کے مداح تھے۔ امان اللہ کی جلاوطنی کے بعد چند برس بچہ سقہ تختِ کابل پر قابض رہا، لیکن اسے بے دخل کر کے جنرل نادر خاں سریر آرائے سلطنت ہوئے تو انھوں نے ستمبر ۱۹۳۳ء میں اقبال کو کابل آنے کی دعوت دی:

نادرِ افغاں شہِ درویش خو ــــ رحمتِ حق بر روانِ پاکِ او
کارِ ملّت محکم از تدبیرِ او ــــ حافظِ دینِ مبیں شمشیرِ او
از حضورِ او مرا فرماں رسید ــــ آنکہ جانِ تازہ در خاکم دمید

(شاہِ افغانستان، نادر خاں پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوں، وہ ایک درویش صفت انسان تھا۔ اس کی تدبیر سے امورِ ملت مستحکم ہوئے اور اس نے اپنی قوتِ اقتدار سے دین کی حفاظت کی۔ مجھے اس کی جانب سے (دَورۂ افغانستان کا) حکم نامہ ملا، اس نے میرے جسم و جان میں ایک

نئی روح پھونک دی۔)

سفرِ افغانستان کے تصور سے، نفسیاتی طور پر بھی وہ ایک تازگی محسوس کر رہے ہوں گے۔ وہ ہندستان کی بے ڈھب سیاست سے بیزار اور مسلمان سیاست دانوں سے بددِل ہو چکے تھے اور اس وجہ سے عملی سیاست کی سرگرمیوں سے رفتہ رفتہ دست کش ہوتے جا رہے تھے۔ عین اسی زمانے میں، جب انھیں سفر افغانستان کا دعوت نامہ موصول ہوا، انھوں نے راغب احسن کو ۱۳/اگست ۱۹۳۳ء کے خط میں لکھا: ''گذشتہ پانچ چار سال کے تجربے نے مجھ کو اپنے تمام لیڈروں سے مایوس کر دیا ہے۔''[9] تقریباً دو ہفتے بعد پھر انھیں لکھتے ہیں: ''مسلمانوں کے انتشار اور ان کے معززین کی خود غرضیوں کا مظاہرہ بہت دِل شکن ہے اور مَیں نے تو اب قصد مصمم کر لیا ہے کہ اپنے گذشتہ دستور العمل پر پھر سے قائم ہو جاؤں اور اپنے مخصوص طریق پر خدمت مسلمانوں کی کرتا رہوں، جس کو چھوڑ کر مَیں نے عملی سیاست کا کام اختیار کیا تھا۔''[10]

اس صورتِ حال میں جب انھیں دعوت نامہ ملا تو یقیناً یہ ان کے لیے ایک پُر مسرت دن تھا۔ ان کے دیرینہ خواب کی تعبیر کی ایک صورت پیدا ہو رہی تھی۔ دعوت نامہ پا کر وہ اس لیے بھی آسودگی محسوس کر رہے ہوں گے کہ افغانستان ایک آزاد ملک تھا، جہاں استعماری طاقتوں کا عمل دخل نہ تھا۔ کئی برس پہلے ۱۹۲۵ء میں انھوں نے کابل میں بین المِلّی یونی ورسٹی کے قیام کا خواب دیکھا تھا[11] اور اب شاہِ افغانستان انھیں افغانستان میں تعلیمی اصلاحات اور کابل میں ایک یونی ورسٹی کے قیام میں مشاورت کے لیے بلا رہے تھے۔ کیسا حسنِ اتفاق تھا——!

علامہ اقبال افغانستان اور ملتِ افغانیہ کے مداح تھے اور عالمِ اسلام کے مستقبل کے حوالے سے انھیں افغانستان کی مرکزیت اور اس کے محلِ وقوع کی اہمیّت کا بخوبی اندازہ تھا—— اس کا اظہار وہ جاوید نامہ (ص ۱۷۷-۱۷۸) کے زمانۂ تالیف میں کر چکے تھے:

آسیا یک پیکرِ آب و گِل است ——— ملتِ افغاں در آں پیکر دل است
از فسادِ او ، فسادِ آسیا ——— از کشادِ او کشادِ آسیا
تا دل آزاد است ، آزاد است تن ——— ورنہ کاہے در رہِ باد است تن

(ایشیا آب و گِل کا ایک پیکر ہے اور اس پیکر کے اندر ملتِ افغان دل کے مانند ہے۔ اس کے فساد سے سارے ایشیا میں فساد رونما ہو سکتا ہے اور اس سے پورا ایشیا سکون اور امن سے ہم کنار ہوگا۔ اگر دل آزاد ہے تو بدن بھی آزاد ہے، دل آزاد نہ ہو تو بدن ایک تنکے کے برابر ہے، جسے ہوا

جب چاہے، جہاں چاہے، اڑا لے جائے۔)

علامہ اقبال کے ساتھ (ممکن ہے، انھی کی تجویز پر) سر راس مسعود اور سید سلیمان ندوی کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ اقبال اور سر راس مسعود ۲۰/ اکتوبر ۱۹۳۳ء کی صبح لاہور سے روانہ ہو کر شام کو پشاور پہنچے اور شب بسری کے لیے ڈین ہوٹل میں مقیم ہوئے۔ ۲۳/ اکتوبر کو وہ کابل پہنچ گئے، جہاں انھیں ''دارالامان'' نامی شاہی مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا۔ اس قافلے میں علامہ کے سیکرٹری کے طور پر غلام رسول خان بیرسٹر اور سر راس مسعود کے سیکرٹری کے طور پر پروفیسر ہادی حسن بھی شامل تھے۔ اقبال علی بخش کو بطور خدمت گار ساتھ لے گئے تھے۔ سید سلیمان ندوی پاسپورٹ کے اجرا میں تاخیر کے سبب اس قافلے کے ساتھ نہ جا سکے، چند روز بعد کابل پہنچے۔

۳

کابل میں قیام کے ابتدائی تین دنوں (۲۴ تا ۲۶/ اکتوبر) میں علامہ اور راس مسعود تعلیمی امور پر حکومتِ افغانستان کے بعض حکام اور سرکردہ افراد کے ساتھ مشاورت میں شریک ہوئے۔ نادر شاہ سے دونوں اصحاب کی ملاقات شاہی محل ''قصرِ دل کشا'' میں ہوئی۔ علامہ اس سے پہلے نادر خاں سے دو بار مل چکے تھے۔ پہلی بار وہ ۱۹۲۴ء میں لاہور کے نیڈو ہوٹل میں ملے۔ نادر خان پیرس جاتے ہوئے ایک روز کے لیے لاہور میں ٹھہرے تھے۔ اُن دِنوں وہ پیرس میں افغانستان کے سفیر کے منصب پر فائز تھے۔ ایک لحاظ سے وہ پنجابی تھے، کیونکہ ان کی والدہ لاہور میں پیدا ہوئی تھیں اور اسی لیے نادر شاہ اردو بخوبی سمجھتے اور بولتے تھے۔[۱۲] وہ ڈیرہ دون میں زیرِ تعلیم رہے تھے۔ اس ملاقات میں نادر خاں نے کلامِ اقبال کا ذکر کرتے ہوئے دل چسپ بات کہی: ''آپ نے جو کچھ لکھا ہے، دنیا کی کوئی توپ اور بندوق اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ایک ایک لفظ ایک ایک بیٹری کا حکم رکھتا ہے۔''[۱۳]

دوسری ملاقات لاہور ریلوے اسٹیشن پر فروری ۱۹۲۹ء میں ہوئی، جب نادر شاہ بچہ سقہ کے خلاف جدوجہد کے لیے واپس افغانستان جا رہے تھے۔ ۱۷/ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو بچہ سقہ کو شکست دے کر وہ سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ اس دوران میں (فروری اور اکتوبر کے درمیان) نادر شاہ کی اپیل پر، اور اقبال از خود بھی، چندہ جمع کر کے نادر خاں کی مالی اعانت کرتے رہے۔ بعض روایات کے مطابق لاہور ریلوے اسٹیشن پر ملاقات کے موقع پر بھی اقبال نے نادر خاں کو رقم کی ایک تھیلی پیش کی تھی۔[۱۴]

آج ''قصرِ دل کشا'' میں ان کی تیسری ملاقات تھی۔مثنوی مسافر (ص ۶۲) میں اقبال نے اپنے تاثر کو یوں بیان کیا ہے:

خلقِ او اقلیمِ دلہا را کشود　　رسم و آئینِ ملوک آنجا نہ بود
پادشاہے خوش کلام و سادہ پوش　　سخت کوش و نرم خوے و گرم جوش
صدق و اخلاص از نگاہش آشکار　　دین و دولت از وجودش استوار
گفت ازاں آتش کہ داری در بدن　　من ترا دانم عزیزِ خویشتن

(بادشاہ کا اخلاق دلوں کے دروازے کھولنے والا تھا۔اس کے ہاں دنیاوی بادشاہوں کے روایتی آداب و رسوم عنقا تھے۔بادشاہ خوش کلام اور سادہ لباس تھا۔طبعاً وہ سخت کوش، نرم خو اور گرم جوش تھا۔اس کی نگاہ سے صدق و اخلاص ظاہر ہوتا تھا اور اس کا وجود، اس کے دین و دنیا کے لیے مضبوطی کا باعث تھا۔اس نے مجھ سے کہا: تو اپنے بدن میں جو آگ رکھتا ہے، اس کی وجہ سے مَیں تجھے اپنا عزیز سمجھتا ہوں۔)

اس موقع پر اقبال نے نادر شاہ کو قرآن کریم کا ایک نسخہ بطور تحفہ پیش کیا۔اثناے ملاقات و گفتگو نمازِ عصر کا وقت آ گیا۔اقبال کے اس اصرار پر کہ ''مَیں نے اپنی عمر کسی شاہِ عادل کی اقتدا میں نماز پڑھنے کی تمنا میں گزاری ہے، آج مَیں تیری اقتدا میں نماز پڑھوں گا۔''[۱۵] نادر خاں نے امامت کرائی۔اقبال نے مثنوی مسافر (ص ۶۳) میں اس کا ذکر اس طرح کیا ہے:

وقتِ عصر آید صداے الصلوٰت　　آں کہ مومن را کند پاک از حیات
انتہاے عاشقاں سوز و گداز　　کردم اندر اقتداے او نماز

اسی شام علامہ اقبال کابل کے نواح میں واقع ظہیر الدین بابر کا مقبرہ دیکھنے گئے۔اس موقع پر ان کے احساسات کیا تھے؟ مثنوی مسافر کے چند اشعار (ص ۶۴) سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔اقبال نے بابر کو خطاب کر کے کہا:

خوشا نصیب کہ خاکِ تو آرمید ایں جا
کہ ایں زمیں ز طلسمِ فرنگ آزاداست

(تو کیسا خوش نصیب ہے کہ تیرا جسد خاکی اس سرزمین میں آرام کر رہا ہے، جو فرنگیوں کے طلسم سے آزاد ہے۔)

جیسا اوپر ذکر ہوا، اقبال کو شعوری طور پر احساس تھا کہ اس وقت وہ آزاد ملک میں ہیں اور

اس حوالے سے ان کے لیے شہر کابل، دہلی کے مقابلے میں کہیں زیادہ قابلِ تحسین و ترجیح ہے۔

۲۶ر اکتوبر کی رات سید سلیمان ندوی بھی کابل پہنچ گئے اور اسی شب صدرِ اعظم سردار ہاشم خان کی دعوتِ طعام میں اقبال اور سر راس مسعود کے ساتھ شریک ہوئے۔ ۲۷ر اکتوبر کو علامہ نے اپنے رفقا کے ساتھ پلِ خشتی کی جامع مسجد میں نمازِ جمعہ ادا کی۔ یہاں مہمانوں کو بھی از راہِ احترام مقصورہ کے اسی حفاظتی حصے میں جگہ دی گئی، جو بادشاہ کی نماز کے لیے مختص تھا۔

نماز کے بعد نادر شاہ نے مہمانوں کو کھانے کی دعوت دی، مگر پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت مہمانوں نے معذرت چاہی۔ سہ پہر کو علامہ اور سید سلیمان ندوی مُلّا شور بازار سے ملاقات کے لیے ان کے گھر پر گئے۔ وہ مجددی سلسلے کے روحانی پیشوا تھے۔ ماضی میں وہ جہاد میں شریک رہے تھے۔ کچھ عرصے کے لیے نادر شاہ کی کابینہ میں وزیرِ عدالت بھی رہے۔ اس کے بعد علامہ اور راس مسعود افغانستان میں مقیم تقریباً ڈیڑھ سو ہندستانیوں کی دعوتِ چائے میں شریک ہوئے۔

دوسرے روز سید سلیمان نے قصرِ دل کشا میں امیر نادر خاں سے ملاقات کی۔ شام چار بجے وزیرِ جنگ شاہ محمود خان کی دعوتِ چائے اور ساڑھے سات بجے شب کابل کی انجمن ادبی کے عشائیے میں شریک ہوئے۔ خطبہ استقبالیہ میں اقبال کی علمی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ معروف شاعر عبداللہ خان نے اپنی نظم ''خیر مقدم'' پڑھی۔ پھر ہادی حسن، راس مسعود، سید سلیمان ندوی اور علامہ اقبال نے تقاریر کیں۔ علامہ کی تقریر خاصی پُر تاثیر تھی۔ آپ نے کہا کہ ادبیات اور شاعری زندگی کے معاون اور خدمت گار ہیں نہ کہ محض آلۂ تفریح۔ شاعر قوم کی زندگی کی بنیاد کو آباد بھی کرسکتا ہے اور برباد بھی۔ پس میری خواہش ہے کہ افغانستان کے شعرا اور انشاپرداز اپنے ہم عصروں میں ایسی رُوح پھونکیں، جس سے وہ اپنے آپ کو پہچان سکیں۔ آخر میں اقبال نے کہا: ''افغانستان کو ایسے مرد کی ضرورت ہے، جو اس ملک کو قبائلی زندگی سے نکال کر وحدتِ ملّی کی زندگی سے آشکار کر سکے۔''[۱۶]

۲۹ر اکتوبر کی سہ پہر علامہ اقبال، وزیرِ خارجہ سردار فیض احمد خاں کے ساتھ نادر شاہ سے ملاقات کے لیے قصرِ دل کشا گئے۔ سید سلیمان، راس مسعود اور دیگر رفقائے سفر پغمان کی سیر کے لیے چلے گئے۔ ممکن ہے، ایسا پروگرام عمداً بنایا گیا ہو، تاکہ علامہ اقبال، امیر نادر خان سے تنہائی میں ملاقات کرسکیں۔ اس ملاقات میں شاہ نے اپنے عزائم بتائے ہوں گے، افغانستان کی ترقی اور اصلاح کے لیے اقبال سے مشورہ کیا ہوگا اور خود اقبال نے بھی کچھ تجاویز پیش کی ہوں گی۔

کابل کی آخری شب، وہاں مقیم بہت سے ہندستانی احباب الوداعی ملاقات کے لیے دارالامان آئے۔ کابل کے چار روزہ قیام میں اساتذہ، علما، تاجروں، ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کے وفود علامہ سے ملاقات کے لیے آتے رہے۔ بعض وفود ۳۵، ۴۰ اراکان پر مشتمل ہوتے تھے۔[۱۷] حاجی صاحب ترنگ زئی سے بھی ملاقات ہوئی۔[۱۸]

۳۰ اکتوبر کی صبح، مسافرانِ افغانستان کابل سے روانہ ہو رہے تھے ـــــ شہر کابل کے چار روزہ قیام میں اقبال نے اس تاریخی شہر سے، جو ایک آزاد ملک کا دارالحکومت تھا، خاصا خوش گوار تاثر لے کر جا رہے تھے۔ اقبال کے سفرنامے (مثنوی مسافر، ص ۶۱) میں اس کا تذکرہ بایں الفاظ ملتا ہے:

شہرِ کابل ، خطۂ جنت نظیر ـــ آبِ حیواں از رگِ تاکش بگیر
چشمِ صائب از سوادش سرمہ چیں ـــ روشن و پائندہ باد آں سر زمیں
آں دیارِ خوش سواد آں پاک بوم ـــ بادِ او خوش تر ز بادِ شام و روم
آبِ او براق و خاکش تابناک ـــ زندہ از موجِ نسیمش مردہ خاک
ساکنانش سیر چشم و خوش گہر ـــ مثلِ تیغ از جوہر خود بے خبر

(کابل کا شہر جنت نظیر ہے۔ اس کے انگوروں کے رس سے آبِ حیات حاصل کیجیے۔ صائب کی آنکھ نے اس شہر کے حسن سے روشنی حاصل کی۔ اللہ تعالیٰ اس سرزمین کو روشن و پائندہ رکھیں۔ شہر خوش منظر ہے۔ اس کی سرزمین پاکیزہ اور آب و ہوا روم و شام سے بہتر و خوش تر ہے۔ اس کا پانی شفاف اور خاک چمک دار ہے۔ اس کی موجِ نسیم سے مردہ زمین بھی زندہ ہو جاتی ہے۔ یہاں کے باشندے سیر چشم اور شریف النفس ہیں، لیکن تلوار کی طرح، اپنے (اندر پوشیدہ) جوہر سے بے خبر ہیں۔)

۴

شہر غزنین کی طرف رواں دواں یہ قافلہ دو عمدہ موٹروں اور دو لاریوں پر مشتمل تھا۔ ایک لاری سامانِ خورونوش، مطبخ کے لوازمات اور عملے کے لیے وقف تھی اور دوسری لاری پر مہمانوں کا سامان و اسباب لدا تھا ـــــ سات مہمانوں کے سامان و اسباب میں وہ تحائف (از قسم قالین وغیرہ) بھی شامل تھے، جو انھیں کابل کے میزبانوں نے ہدیہ کیے تھے۔

انھی قالینوں کے حوالے سے غلام بھیک نیرنگ نے لکھا ہے کہ ۱۹۳۴ء میں علامہ اقبال

میکلوڈ روڈ والے مکان میں مقیم تھے۔ افغانستان سے واپس لاہور پہنچے تو چند روز بعد اقبال سے ملنے گیا؛ کیا دیکھتا ہوں کہ ملاقات کے کمرے میں ایک طرف کئی قالین لپٹے ہوئے رکھے ہیں۔ دریافت کرنے پر علامہ نے کہا: "مَیں افغانستان گیا تھا، نادر شاہ نے یہ قالین بطور تحفہ دیے تھے۔ ان کو بچھانے کی کوئی جگہ نہیں.......... [اس لیے یہاں لپٹے] رکھے ہیں۔" نیرنگ لکھتے ہیں:

"مَیں نے اپنے دل میں کہا کہ قلندر کو جو کوئی تحفہ دے، خواہ دینے والا بادشاہ ہی ہو، اس تحفے کا یہی حشر ہوتا ہے، لیکن ان قالینوں کی دعا قبول ہوئی، جب جاوید منزل تعمیر ہوگئی تو یہ اس میں بچھائے گئے۔"[۱۹] یقیناً یہی قالین مسافرانِ افغانستان کے سامان کے لیے مخصوص اسی لاری میں رکھے ہوں گے، جس پر ان کا سامان واسباب لدا ہوا تھا اور یہ لاری مسافروں کی موٹر کے ساتھ چل رہی تھی۔

مہمانوں نے غزنین پہنچ کر وہاں کے سرکاری مہمان خانے میں کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کیا اور سہ پہر کو نواح میں واقع قدیم آثارِ باقیہ کی زیارت کے لیے نکلے:

آہ غزنی آں حریمِ علم و فن
مرغزارِ شیرِ مردانِ کہن[۲۰]

سید سلیمان لکھتے ہیں کہ اقبال کو سنائی کا مزار دیکھنے کا سب سے زیادہ اشتیاق تھا، اس لیے مہمان خانے سے نکل کر ہم پا پیادہ ہی حکیم غزنوی کے مزار کی طرف چل پڑے:

خفتہ در خاکش حکیم غزنوی
از نوائے او دلِ مرداں قوی[۲۱]

علامہ خاصی دیر تک قبر کے سرھانے کھڑے رہے اور بقول سید سلیمان: "بے اختیار ہو کر دیر تک زور زور سے روتے رہے۔" اقبال دل ہی دل میں حکیم سنائی سے سوال و جواب بھی کرتے رہے:

گفتم اے بینندۂ اسرارِ جاں ‌ ‌ ‌ بر تو روشن ایں جہان و آں جہاں
عصرِ ما وارفتۂ آب و گِل است ‌ ‌ ‌ اہلِ حق را مشکل اندر مشکل است
مومن از افرنگیاں دید آنچہ دید ‌ ‌ ‌ فتنہ ہا اندر حرم آمد پدید[۲۲]

(مَیں نے اس سے کہا: تو اسرارِ جاں سے واقف ہے اور تجھ پر دونوں جہاں عیاں ہیں۔ ہمارا زمانہ دنیائے دنی کا عاشق ہے، اس لیے اہل حق مشکل در مشکل میں گرفتار ہیں۔ مسلمان نے اب تک فرنگیوں کے ہاتھوں جو نقصان اٹھایا، سو اٹھایا، (مگر اب یہ نوبت آگئی ہے کہ) حرم کے اندر یعنی خود مسلمانوں کی صفوں میں طرح طرح کے فتنے پیدا ہو گئے ہیں۔)

بالِ جبریل (ص۲۲-۲۴) میں تین اجزا پر مشتمل ایک قطعہ شامل ہے، (جسے غزلیاتِ بالِ جبریل کے دوسرے حصے کی پہلی غزل قرار دیا جاتا ہے، حالاں کہ یہ امر مختلف فیہ ہے۔ بہت سے نقاد انھیں ''غزلیات'' قرار دینے میں متأمل ہیں۔ خود اقبال نے کہیں بھی ان قطعات کو ''غزل'' نہیں کہا۔) اس کی ابتدا میں درج وضاحتی سطور سے پتا چلتا ہے کہ یہ قطعہ مزارِ سنائی کی اسی زیارت کے حوالے سے قلم بند کیا گیا۔ اس کا اختتام اس شعر پر ہوتا ہے:

سنائی کے ادب سے مَیں نے غوّاصی نہ کی ، ورنہ
ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لولوے لالہ

غزنی میں اقبال کی دلچسپی کی دوسری جگہ سلطان محمود غزنوی کا مقبرہ تھا۔ یہاں بھی علامہ نے فاتحہ خوانی کی۔[۲۳] سلطان محمود کے مزار سے واپسی پر اقبال کو حضرت علی ہجویری کے والد ماجد کے مزار کی تلاش ہوئی۔ ایک ہمراہی مُلّا قربان کی نشان دہی پر وہاں بھی فاتحہ پڑھی۔

۳۱ را کتوبر کو قافلہ غزنین سے روانہ ہو کر مقر کے راستے قلاتِ غلزئی پہنچا اور شب بسری کے لیے یہیں قیام کیا۔ اگلے روز صبح آٹھ بجے یہ لوگ قندھار کی طرف روانہ ہوئے اور ۱۲ بجے قندھار پہنچ کر شاہی قیام گاہ میں پڑاؤ ڈالا۔ قندھار کے گورنر اور دوسرے عملے سے ملاقاتیں ہوئی۔ انجمن ادبی کے ناظم اور پشتو رسالے طلوعِ افغان کے مدیر عبدالحیٔ خان بھی آ کر مہمانوں سے ملے۔ شام چار بجے قندھار کی سیر کو نکلے۔ سب سے پہلے خرقہ شریف پہنچے۔ یہاں نبی کریمؐ کا ملبوسِ اقدس موجود ہے۔ کچھ اور تبرکات بھی ہیں، بقولِ سلیمان ندوی: ''ان کی تاریخی حیثیت واضح نہیں، نہ اس نسبت کی صحت پر دلیلیں ظاہر ہیں۔''[۲۴] اس کے بعد یہ لوگ احمد شاہ ابدالی کا مقبرہ دیکھنے گئے، جو اینٹ اور چونے کا بنا ہے اور اس کے اوپر بہت بڑا ہشت پہلو گنبد ہے۔ علامہ اقبال نے ابدالی کو ''موسسِ ملّتِ افغانیہ'' قرار دیا ہے۔ جاوید نامہ (ص۱۷۶-۱۸۰) میں اقبال ابدالی سے ہم کلام رہے ہیں۔ اس طویل مکالمے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کی نظر میں ابدالی صرف مردِ میدان ہی نہ تھا، ایک حکیم اور صاحبِ بصیرت دانش ور بھی تھا، جو تہذیبِ مغرب کی اصلیت کا بخوبی ادراک رکھتا تھا۔

مقبرے سے نکل کر مہمان قندھار کا سب سے دل کش منظر ارغنداب دیکھنے کے لیے ایک بلند و بالا پہاڑی پر پہنچے۔ یہ قندھار کا سب سے بلند مقام تھا۔ نیچے میدان میں دریائے ارغنداب بہہ رہا تھا، کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی ندیاں یا قدرتی نہریں مصروفِ خرام تھیں، اطراف میں پھلوں کے

باغات کا سلسلہ میلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ سید سلیمان لکھتے ہیں: ''ایسا دلچسپ فطری منظر میری آنکھوں نے اب تک نہیں دیکھا۔ جدھر نظر اٹھتی، جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَار کا سماں دیکھتی تھی۔''

اقبال کے رفقا تو ان فطری مناظر سے لطف اٹھا رہے تھے، مگر اقبال اپنی سوچوں میں گم ہوں گے۔ وہ سوچ رہے ہوں گے:

بہادر اور شجاع ''ملتِ افغانیہ'' طلسمِ فرنگ سے آزاد ہے۔

آزاد اور سخت کوش افغانیوں کا اسلوبِ حیات، غلام ہندیوں سے کس قدر مختلف ہے۔

مگر ملتِ افغانیہ کا مستقبل کیا ہے؟ ایک طرف برطانوی استعمار اور دوسری طرف نیا ابھرتا ہوا روسی سامراج۔

ممکن ہے، اقبال بیسویں صدی کے آخر تک اس خطے کی صورت گری کا خیالی نقشہ بنا رہے ہوں:

از فسادِ او فسادِ آسیا ــــــ از کشادِ او کشادِ آسیا[۲۵]

سیاحتِ افغانستان کے ایام میں علامہ اقبال نے بابر، محمود غزنوی، حکیم سنائی اور احمد شاہ ابدالی کے مقابر کی زیارت کی تھی ــــــ یہ سب اقبال کی ممدوح شخصیات تھیں۔ وہ زیارتِ مقابر کے نتیجے میں کیف و لذت سے ابھی تک سرشار ہوں گے۔

سید راس مسعود کو بعض ناگزیر وجوہ سے علی گڑھ پہنچنا تھا، اس لیے وہ اور ہادی حسین بعجلت تیار ہو کر ۱۲ر بجے شب واپس روانہ ہوئے اور علی الصبح حدودِ افغانستان سے گزر کر ہندستان میں داخل ہو گئے۔

۵

قندھار میں شب بسری کے بعد ہندی مسافروں کا یہ قافلہ ۲ر نومبر کو ۹ بجے چمن کی طرف روانہ ہوا۔ علامہ اقبال کو ایک بار پھر اپنے دَورے کا تجزیہ کرنے کا موقع مل گیا ــــ شاید ان کے ذہن میں انھی خیالات کی پختہ و پُز ہو رہی تھی، جن کا اظہار بعد ازاں سفرنامۂ افغانستان (مثنوی مسافر) کے آخری حصے (خطاب بہ پادشاہِ اسلام اعلیٰ حضرت ظاہر شاہ) میں ہوا۔ مسافر، ایک اعتبار سے دورۂ افغانستان کا ماحصل ہے۔ اس کے آخری حصے میں وہ نادر شاہ مرحوم کے جانشین ظاہر شاہ کو ''حرفِ شوق'' کا تحفہ پیش کرتے ہیں۔ (ع: حرفِ شوق آوردہ ازمن پذیر) ــــــ یہ ''حرفِ شوق'' کیا ہے؟ ــــــ ظاہر شاہ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

چوں پدر اہلِ ہنر را دوست دار — بندۂ صاحب نظر را دوست دار
ہم چوں آں خلد آشیاں بیدار زی — سخت کوش و پُر دم و کرار زی
می شناسی معنیِ کرار چیست؟ — ایں مقامے از مقاماتِ علی است
امتاں را در جہانِ بے ثبات — نیست ممکن جز بہ کراری حیات
سرگذشتِ آلِ عثماں را نگر — از فریب غربیاں خونیں جگر
تا ز کراری نصیبے داشتند — در جہاں دیگر علم افراشتند
مسلم ہندی چرا میداں گذاشت؟ — ہمت او بوے کراری نداشت[۲۶]

(اپنے والد کی طرح اہل دانش و بینش سے دوستی استوار کرو۔ اسی خلد آشیاں کی سی بیدار مغزی، سخت کوشی اور بہادری و جرات مندانہ زندگی بسر کرو۔ جانتے ہو، کرار کے معنی کیا ہیں؟ یہ حضرت علیؓ کے مراتب میں سے ایک ہے۔ اس جہانِ بے ثبات میں کراری، یعنی جہاد کے بغیر زندہ رہنا ممکن نہیں۔ عثمانیوں (ترکوں) کی تاریخ دیکھ لو، جب تک انھوں نے جہاد سے سروکار رکھا، دنیا میں ان کے اقتدار کا جھنڈا لہراتا رہا ___ تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ ہندی مسلمان کیوں میدان چھوڑ گیا؟ اس لیے کہ اس کے اندر جہاد کا حوصلہ باقی نہیں رہا۔)

مہمانوں کے لیے کھانے کا سامان، باورچی اور خدّام کابل سے قافلے کے ہمراہ چلے آ رہے تھے۔ جہاں جہاں قیام ہوتا، باورچی کھانا پکاتے اور خادم کھانا میز پر لگا دیتے۔ یہاں بھی یہی اہتمام کیا گیا۔ نمازِ ظہر اور کھانے کے بعد پھر قافلہ روانہ ہو گیا۔ اس سفر میں سرور خان گویا جلوت و خلوت میں مہمانوں کے ہم رکاب تھے۔ وہ حکومتِ افغانستان کی طرف سے مہمانوں کی دیکھ بھال اور مشایعت کے لیے مامور تھے، چنانچہ انھوں نے بطور پروٹوکول افسر افغانستان کی سرحد پر مہمانوں کو رُخصت کیا۔

چار بجے شام چمن سے روانہ ہوئے۔ یہ راستہ خطرناک تھا، لیکن "ڈاکٹر اقبال صاحب نے روحانیت کے ذاتی مشاہدات و تجارب اور ایک سچے پیر کی تلاش پر گفتگو شروع کر دی۔ اسی طرح باتیں کرتے ہوئے بوقتِ عشا کوئٹہ کے ڈاک بنگلے میں پہنچ کر مقیم ہوئے۔

۳ر نومبر کو کوئٹہ سے ۱۱ بجے دِن ریل سے روانہ ہوئے۔ ۴ر نومبر دوپہر ۱۲ بجے سید سلیمان ندوی تو ملتان اتر گئے اور علامہ اقبال بیرسٹر غلام رسول اور علی بخش کے ہمراہ ۴ر نومبر کی شب لاہور پہنچ گئے۔

سفر کی تکان کی وجہ سے اگلے روز بخار میں مبتلا ہو کر بیمار پڑ گئے۔ اسی ناسازیِ طبع کے دوران

انھیں نادر شاہ کی شہادت کی خبر ملی۔ نادر شاہ کا قتل اقبال کے لیے ایک حادثۂ فاجعہ تھا، انھیں دلی صدمہ ہوا۔ شاہ مرحوم کے جانشین محمد ظاہر شاہ اور وزیر اعظم کے نام تعزیتی پیغام ارسال کیے، جس میں لکھا: "میں ان کی شفقت اور محبت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔"[۲۷] اور یہ کہ "وہ عوام میں حد درجہ مقبول تھے۔ افغانستان میں احمد شاہ ابدالی کے بعد ایسا بادشاہ نہیں گزرا ہے۔" ۲۴ر نومبر کو ایک خط میں لکھتے ہیں: "آج جو اصلاح کابل سے آیا ہے، اس میں سردار محمد ہاشم کی ایک تقریر ہے، جو نہایت دردناک ہے۔ مجھے اس تقریر نے بہت رُلایا۔"[۲۸] ۴ر دسمبر ۱۹۳۳ء کو پنجاب یونی ورسٹی نے انھیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔[۲۹]

نومبر ۱۹۳۳ء میں اوکسفرڈ یونی ورسٹی نے اقبال کو رہوڈز لیکچرز کی دعوت دی تھی،[۳۰] اس سلسلے میں تین خطبات تیار کرنے تھے، چنانچہ علامہ مطالعہ و تحقیق میں مصروف ہو گئے، لیکن چاہتے تھے کہ لیکچروں کی تاریخ بڑھا دی جائے۔ ان کا اندازہ تھا کہ وہ مارچ ۱۹۳۴ء تک لیکچر تیار کر لیں گے۔ تقریباً دو ماہ اسی (لیکچروں کی تیاری) میں گزر گئے۔ ابھی مکمل بھی نہ ہو پائے تھے کہ ۱۰ر جنوری کو اقبال کی طویل علالت کا آغاز ہوا۔

حوالے اور حواشی

۱۔ مکتوبات بنام نیازی، ص ۱۰۹
۲۔ ایضاً
۳۔ گفتارِ اقبال، ص ۱۷۳-۱۷۷
۴۔ زندہ رُود، ص ۵۷۰
۵۔ گفتارِ اقبال، ص ۱۷۷
۶۔ ایضاً، ص ۱۷۸
۷۔ اقبالیات [مہر]، ص ۲۵۳-۲۵۴۔ اس زمانے میں غلام رسول مہر قریباً ہر روز اقبال کی مجلس میں حاضر ہوتے اور واپس آ کر اس روز کی گفتگو کا خلاصہ اور اہم نکات اپنے روزنامچے میں تحریر کر لیتے۔ ان کے مطابق سفر و سیاحت، اس کے مصارف، مسائل اور سفر کی منازل (routes) پر مجلس میں بارہا گفتگو ہوتی رہی اور تفصیلی پروگرام مرتب کیا جاتا رہا۔
۸۔ مظلوم اقبال، ص ۳۴۱
۹۔ اقبال: جہانِ دیگر، ص ۴۷
۱۰۔ ایضاً، ص ۵۳

۱۱۔ اقبالیات [مہر]، ص ۲۵۳

۱۲۔ سیر افغانستان، ص ۴۴

۱۳۔ چودھری محمد حسین اور علامہ اقبال: روابط، ص ۸۱

۱۴۔ روز گارِ فقیر [اوّل]، ص ۸۹، زندہ رُود، ص ۵۷۶

۱۵۔ اس روایت کے راوی اقبال کی کہانی، کچھ میری، کچھ اُن کی زبانی (ص ۹۶) کے مصنف ظہیر الدین احمد ہیں، مگر انھوں نے اس روایت کا ماخذ نہیں بتایا۔ قیاس ہے کہ انھیں یہ بات پروفیسر ہادی حسن سے معلوم ہوئی ہوگی۔

۱۶۔ سیر افغانستان، ص ۵۸

۱۷۔ روزنامہ مشرق، پشاور، یکم فروری ۱۹۷۷ء، بحوالہ اقبال اور افغانستان، ص ۷۴

۱۸۔ بحوالہ اقبال اور افغانستان، ص ۷۵

۱۹۔ مجالس اقبال، ص ۲۶

۲۰۔ مثنوی مسافر، ص ۶۶

۲۱۔ ایضاً

۲۲۔ ایضاً، ص ۶۷

۲۳۔ بالِ جبریل، ص ۲۲ کی وضاحتی سطور میں اقبال نے سنائی کے مزارِ مقدس کی زیارت کو نومبر ۱۹۳۳ء کا واقعہ بتایا ہے۔ درحقیقت انھوں نے ۳۰/اکتوبر کو مزار کی زیارت کی تھی۔ دیکھیے: سیر افغانستان، ص ۷۹

۲۴۔ ایضاً

۲۵۔ جاوید نامہ، ص ۱۷۸۔ مگر یہ اندازہ نہ لگا سکے کہ ۱۹۸۹ء میں فساد کا مرحلہ ختم ہوا تو کفن دُزدوں کو یہ بات پسند نہیں آئی اور اب افغانستان فساد کے مرحلۂ دوم سے گزر رہا ہے۔ روحِ اقبال نگراں ہے کہ مرحلۂ کشاد کب شروع ہوتا ہے۔

۲۶۔ مثنوی مسافر، ص ۸۲

۲۷۔ انقلاب، ۱۰/نومبر ۱۹۱۴ء، بحوالہ گفتارِ اقبال، ص ۱۸۱

۲۸۔ اقبال: جہانِ دیگر، ص ۶۱

۲۹۔ زندہ رُود، ص ۵۸۸

۳۰۔ مکتوبات بنام نیازی، ص ۱۱۸-۱۱۹

❖……❖……❖

(۲۰)

نغمۂ من در گلوے من شکست

ا

عبدالمجید سالک لکھتے ہیں: "۱۰/ جنوری [۱۹۳۴ء] کو عید الفطر کا دِن تھا؛ علامہ اقبال؛ چودھری محمد حسین، جاوید میاں اور علی بخش کے ساتھ شاہی مسجد گئے۔ ایک تو اُس دِن یوں بھی شاید سردی تھی، اس پر علامہ محض شلوار کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ نہ کوئی کمبل تھا، نہ گلوبند؛ موٹر کار میں جاتے آتے وقت ٹھنڈی ہوا لگی؛ پھر شاہی مسجد پر اتر کر دروازے سے محرابِ مسجد تک ننگے پاؤں اس فرش پر دو دفعہ چلنا پڑا، جو شدتِ سردی سے برف ہو رہا تھا۔ غرض سردی کے اثر سے بچنے کا کوئی تردّد نہ کیا گیا۔ واپسی پر آپ نے اپنے والد مرحوم کی تقلید میں دہی ڈال کر سویاں کھائیں۔"[۱] اس کے نتیجے میں زکام ہو گیا۔ بہی دانہ پینے پر زکام تو بند ہو گیا، مگر گلا بیٹھ گیا۔[۲]

یہ علامہ کی اس طویل علالت کا آغاز تھا، جس سے وہ کامل طور پر کبھی رُو بصحت نہ ہو سکے۔ وقتی طور پر افاقہ ہوتا رہا، مگر اس افاقے کے ساتھ طرح طرح کے عوارض پیدا ہوتے رہے۔ آواز میں کبھی کبھی خفیف سی تبدیلی یا بہتری آ جاتی، لیکن پھر وہی ترقیِ معکوس۔ مجموعی صحت بھی کبھی کبھی بہتر ہو جاتی، لیکن پھر کوئی نیا عارضہ اٹھ کھڑا ہوتا، مثلاً اختلاجِ قلب، ضعفِ قلب، پھیپھڑوں کے عوارض، ہلکا دَمہ، سوءِ ہضم، قبض، دردِ دنداں، دردِ گردہ وغیرہ۔ آخری زمانے میں آنکھوں میں موتیا بھی اتر آیا تھا۔ ان عوارض نے اقبال کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ انھوں نے عام جلسوں اور مشاورتی اجلاسوں میں جانا اور تقریر کرنا ترک کر دیا۔ وکالت کا سلسلہ بھی کم ہوتے ہوتے معطل ہو گیا۔ اس سے ان کے مالی حالات بھی دِگرگوں ہو گئے اور یوں ۱۹۳۴ء کے شروع ہوتے ہی ان کی معمول کی سرگرمیوں اور بحیثیت مجموعی ان کے اسلوبِ حیات میں خاصی تبدیلی آ گئی۔

صحت کی پریشان کن کیفیت کے باوجود، وہ گھر میں بیٹھے بیٹھے اور بستر میں لیٹے لیٹے ہندی مسلمانوں اور اُمتِ مسلمہ کی فلاح و بہبود، کامیابی اور سربلندی کے لیے سوچ بچار کرتے رہے۔

خطوط لکھتے اور حسبِ ضرورت و موقع بیانات دیتے، اکابرِ شہر کے ساتھ اپیلیں جاری کرتے اور جہاں تک ممکن ہوتا، اجتماعی مسائل پر حلقۂ احباب کی مشاورتوں میں بھی شریک ہوتے۔

۲

تاہم اپنے جملہ مشاغل و مصروفیات اور اُمت کی سربلندی کے لیے مقدور بھر سعی و کاوش کے باوجود، گذشتہ دو تین برسوں سے وہ اپنی سیاسی سرگرمیوں کو بتدریج کم کرنے اور بالآخر اپنے اوقات اور توانائی کے استعمال کو غیر سیاسی امور تک محدود رکھنے کے لیے تیاری کر رہے تھے۔ ۱۴؍ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو راغب احسن کے نام خط میں لکھا: ''سیاسیات سے علیحدگی تیسری گول میز کانفرنس کے بعد ہوگی۔''[۳] آغا خان نے اصرار کیا کہ وہ بدستور مسلم کانفرنس کی صدارت سنبھالے رکھیں تو اقبال نے معذرت کر لی۔[۴] ۲۰؍ جون ۱۹۳۳ء کو انھوں نے وضاحت کی کہ مَیں کسی کونسل یا اسمبلی کی رکنیت کے لیے کھڑا ہونے کا ارادہ نہیں رکھتا، کیونکہ مَیں نے سیاست میں اپنی دلچسپی کی حدود متعین کر لی ہیں۔[۵] انھوں نے باقی زندگی انھی حدود کے اندر ہی گزاری۔

علامہ اقبال اپنی تمام تر رجائیت پسندی، اُمتِ مسلمہ کے روشن مستقبل پر پورے ایقان اور بحیثیت مجموعی زندگی کے بارے میں ایک پُر امید رویّہ رکھنے کے باوجود، اپنی سیاسی زندگی میں کسی قدر مایوسی کا شکار ہو گئے تھے۔ اپنی افتادِ طبع کے لحاظ سے وہ سیاسی آدمی نہ تھے، لیکن نامساعد حالات کے باوجود انھوں نے عملی سیاست میں فقط اس لیے حصّہ لیا کہ:

اوّل: ''اسلام کی خدمت کا فریضہ'' اور ''قوم کے مصائب'' انھیں مجبور کر رہے تھے۔

دوم: ہندی مسلمانوں کی کوئی مخلص لیڈر شپ موجود نہیں تھی۔ اقبال کے الفاظ میں: It is a pity that Islam possess no leader۔[۶] شعری اسلوب میں اس کا اظہار اس طرح ہوا:

ز کارِ بے نظامِ او چہ گویم
تو می دانی کہ ملّت بے امام است[۷]

علامہ کو ابتدائی زمانے ہی سے خوشامدی اور بے ضمیر سیاست دانوں کا تجربہ ہوتا آیا تھا۔ پیامِ مشرق (۱۹۲۳ء، ص ۱۸) میں وہ کہتے ہیں:

مسلمِ ہندی شکم را بندہٖ   خود فروشے، دل ز دِیں برکندہٖ

(ہندی مسلمان صرف پیٹ کا غلام ہے، اس نے اپنے آپ کو بیچ دیا ہے اور دِین سے برگشتہ خاطر ہو چکا ہے۔)

پھر جب ۱۹۲۶ء میں وہ عملی سیاست میں داخل ہوئے تو انھیں جن لوگوں سے سابقہ پڑا، ان میں سے بیشتر ٹوڈی قسم کے خوشامدی تھے۔ ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کی ناگفتہ بہ حالت کا ذکر ہم باب ۱۵ میں کر چکے ہیں۔ یہ اقبال کی ہمت تھی کہ حوصلہ شکن حالات کے باوجود، انھوں نے الٰہ آباد جا کر ہندی مسلمانوں کے لیے ایک نئی راہِ عمل تجویز کی۔ خیال رہے کہ یہ جلسہ کسی وسیع ہال یا باغ میں منعقد کرنے کے بجائے دوازدہ منزل کے تنگ (مگر محفوظ) ہال میں منعقد کیا گیا، کیونکہ مقامی مسلم سیاست گروہ بندی کا شکار تھی اور مخالفین کی طرف سے مظاہرے اور تصادم کا احتمال تھا۔[۸] بعدۂ ایک مسلم لیگی مفتی فخر الاسلام نے علیحدگی میں علامہ اقبال سے عرض کیا: ''آپ ان ٹوڈیوں میں کہاں آ پھنسے؟''[۹] اس سے اس ناسازگار ماحول کا اندازہ ہو سکتا ہے، جس میں علامہ نے خطبۂ الٰہ آباد پیش کیا۔

۱۶ر نومبر ۱۹۳۱ء کو دوسری گول میز کانفرنس کی کارروائی سے لاتعلق ہوتے وقت اقبال نے مسلم وفد کے سربراہ سر آغا خاں کو انتہائی دُکھ درد کے ساتھ (with greatest pain) جو خط لکھا، اس میں مسلم وفد کے ارکان کی ''خفیہ رقابتوں، سازشوں'' اور بعض ارکان کی بے وفائی (disloyalty) کو اپنی مایوسی اور کانفرنس سے علیحدگی کا سبب قرار دیا۔[۱۰] ۳۰ر مئی ۱۹۳۳ء کو راغب احسن کو لکھتے ہیں: ''نئے تعلیم یافتہ گروہ کے نزدیک منافقت سب سے بڑا اصول زندگی کا ہے اور وہ اپنے تمام معاملات میں اسی پر عمل پیرا ہیں۔''[۱۱] ۴ر مارچ ۱۹۳۴ء کو علامہ نے مسلم راہ نماؤں کے بارے میں تھامپسن کو لکھا کہ مسلمانوں کے زیادہ تر راہ نما اوسط درجے کے لوگ ہیں، جن کے رویّوں کا انحصار کسی عقلی بنیاد پر نہیں، بلکہ ذاتی اور نجی مفادات پر ہوتا ہے۔[۱۲]

علامہ اقبال کی مایوسی کے ضمن میں ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں: ''اقبال مسلم سیاسی لیڈروں کے نفاق اور فتنہ تراشیوں یا مسلم عوام کے انتشار سے بڑے برگشتہ خاطر تھے۔ برصغیر میں ملتِ اسلامیہ کی ہم آہنگی، سالمیّت یا اس کی اساسی تنظیم کے نصب العین کی تحصیل کے لیے ان کی کوششیں اب تک کامیابی سے ہم کنار نہ ہو سکی تھیں۔ اس دَور میں برصغیر میں مسلم سیاسی جماعتوں کی تعداد بیس سے اوپر جا چکی تھی اور ہر مسلم سیاسی جماعت کا مسلک دوسری جماعت سے مختلف تھا۔''[۱۳] اس کے بعد جاوید اقبال نے خلافت کمیٹی، جمعیت العلماءِ ہند، مجلس احرار پنجاب، شیعہ پولیٹیکل پارٹی لکھنؤ، کشمیر مسلم کانفرنس، خاکسار پارٹی اور بعض مقامی پارٹیوں، فرقہ وارانہ جماعتوں اور علاقائی گروہوں کی دھڑے بندیوں، باہمی چپقلشوں اور بحیثیت مجموعی مسلم راہ نماؤں کے ''ذہنی

انتشار'' کا ذکر کیا ہے۔[۱۴] جنوری ۱۹۳۴ء میں جب علامہ اقبال گلے کی خرابی کی وجہ سے ایک طرح سے گوشہ نشین ہوئے تو شاید قدرت کی طرف سے اس گوشہ نشینی کا ایک جواز بھی فراہم ہو گیا تھا:

نغمۂ من در گلوے من شکست
شعلۂ از سینہ ام بیروں نجست

۳

آواز بیٹھ جانے سے وہ اپنی خواہش کے مطابق تلاوت بھی نہ کر سکتے تھے اور اس کا انھیں بڑا قلق تھا۔ وہ ایلوپیتھک دواؤں پر یونانی دواؤں کو ترجیح دیتے تھے، چنانچہ سید نذیر نیازی کی معرفت دہلی کے حکیم نابینا صاحب سے رجوع کیا گیا اور جون ۱۹۳۴ء کے دوسرے ہفتے ان سے دوا لینے کے لیے اقبال کو دہلی جانا پڑا۔ گلے کی خرابی کے ساتھ کبھی کبھی نقرس اور دردِ گردہ کی شکایت بھی ہو جاتی تھی۔ ایک تجویز یہ تھی کہ یورپ جا کر علاج کرایا جائے، مگر اس کے لیے بھی وہ حکیم نابینا صاحب سے مشورہ ضروری سمجھتے تھے۔[۱۵]

ڈاکٹر تقی عابدی کے بقول: ''آواز کے بیٹھ جانے کے بعد علامہ کی نفسیات بھی مجروح ہوئی اور عام طور پر علامہ غم زدہ نظر آنے لگے؛''[۱۶] مگر وہ بڑے باہمت شخص تھے۔ ۲۹ر جون کو جاوید اقبال کو ساتھ لے کر شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کے مزار کی زیارت کے لیے سرہند کا سفر کیا۔ اس سفر میں چودھری محمد حسین، منشی طاہر الدین اور علی بخش بھی ان کے ہمراہ تھے۔ اقبال کے دیرینہ دوست غلام بھیک نیرنگ بھی انبالے سے سرہند پہنچے۔ علامہ گنبد کے اندر، مجدد صاحب کی تربت کے نزدیک فرش پر بیٹھ کر تلاوت کرنے لگے۔ قرآن شریف پڑھتے جاتے اور روتے جاتے۔ شاید یہ اظہارِ تشکر کے آنسو تھے۔ انھوں نے جاوید اقبال کی پیدائش پر عہد کیا تھا کہ وہ اسے لے کر سرہند جائیں گے۔[۱۷] علامہ نے سرہند کے سفر سے ایک خوش گوار تاثر قبول کیا۔ نذیر نیازی کو ۲ر جون کے خط میں لکھا کہ سرہند شریف ''نہایت عمدہ اور پُر فضا جگہ ہے۔ اِن شاءاللہ پھر بھی جاؤں گا۔''[۱۸] ۳ر جولائی کے خط میں دوبارہ لکھا: ''سرہند خوب جگہ ہے۔ مزار نے میرے دِل پر بڑا اثر کیا ہے، بڑی پاکیزہ جگہ ہے۔''[۱۹]

یکم جولائی ۱۹۳۴ء کو انجمن حمایت اسلام نے انھیں اپنا صدر منتخب کیا تھا،[۲۰] چنانچہ بطور صدرِ انجمن انھوں نے ۱۴ر جولائی کو شام ساڑھے پانچ بجے انجمن کی جنرل کونسل کے اجلاس کی صدارت کی۔ وہ خود اونچی آواز سے بول نہیں سکتے تھے، اس لیے ان کی لکھی ہوئی تقریر سیکرٹری نے پڑھ کر

سنائی۔ علامہ نے اس تحریری تقریر میں کہا کہ ''اگرچہ اس وقت میری صحت کچھ ایسی اچھی نہیں ہے، تاہم جو خدمت بھی مجھ سے ہو سکتی ہے، مَیں اس کے لیے حاضر ہوں۔'' انھوں نے زمانے کی مقتضیات کے ساتھ انجمن میں بھی مناسب تبدیلیوں کی تجویز پیش کی، تاکہ یہ قومی ادارہ ''صحیح معنوں میں اسلامی تہذیب وتمدن کا مرکز'' بن جائے۔ اس تحریری خطبے میں علامہ نے دینیات کی تعلیم، مسلمان لڑکیوں کی تعلیم اور خواتین یونی ورسٹی کے سلسلے میں بھی چند مفید تجاویز پیش کیں اور آخر میں کہا کہ ہمیں نام ونمود کی خواہش دِل سے نکال کر کام کرنا چاہیے، تاکہ اللہ تعالیٰ ''ہماری رُوح کو اسلام کی محبت سے اس طرح لبریز کر دے کہ ہماری حرکات وسکنات کا مقصدِ اوّلین سوائے رضائے الٰہی کے اَور کچھ نہ ہو۔''[21]

دو ہفتے بعد ۳۰ ؍اگست کو ان کی صدارت میں انجمن کی جنرل کونسل کا ایک اَور اجلاس منعقد ہوا، جس میں بجٹ پر بحث کی گئی۔ ۱۸ ؍نومبر کو فتنۂ ارتداد پر غور کرنے کے لیے انجمن کے ایک مشاورتی اجلاس میں شریک ہوئے، جو ان کی علالت کے پیشِ نظر انھی کے مکان پر منعقد ہوا تھا۔[22] مختلف امور ومسائل کے سلسلے میں وہ انجمن کو مزید کچھ وقت بھی دیتے ہوں گے۔

علالت کے باوجود، ملکی حالات پر علامہ اقبال برابر نظر رکھتے تھے۔ کشمیر میں حکومتی مظالم کے خلاف احتجاج کرنے والوں کو بَید زنی کی وحشیانہ سزائیں دی جا رہی تھیں۔ علامہ نے اس انسانیت سوز سزا کے خلاف جمعیتِ اقوام اور اخبار لندن ٹائمز کو متوجہ کیا اور وائس رائے ہند کے نام ایک تار میں اپیل کی کہ وہ صورتِ حال پر فوری توجہ دیں۔[23] ۲۴ ؍مئی کو علامہ نے فرقہ وار اعلان سے متعلق وائٹ پیپر پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک بیان میں کہا کہ مسلم اور ہندو رہنماؤں کو باہمی سمجھوتے کے لیے مشترکہ جدوجہد کرنی چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی علامہ نے اکتوبر میں لاہور یا پٹنہ میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس کے انعقاد کو نہایت ضروری قرار دیا۔[24] ملازمتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کے متعلق ہوم ڈپارٹمنٹ نے جولائی میں ایک قرارداد شائع کی۔ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے سیکرٹری حاجی رحیم بخش کے اشتراک سے ایک بیان میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ نے کہا کہ یہ ملازمتیں ہمارے مطالبے سے بہت کم ہیں۔ مرکزی مجلس آئین ساز میں مسلمانوں کا حصہ ایک تہائی مقرر کیا گیا ہے، لہٰذا سرکاری ملازمتوں میں بھی مسلمانوں کے لیے یہی شرح مقرر کی جائے۔ اس کے ساتھ ہی ضروری ہے کہ جو اصول طے ہو، اس پر عمل درآمد کیا جائے۔[25]

اس طرح کے بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ کا دِل اُمت کے ساتھ دھڑکتا تھا اور وہ

رہینِ ستم ہائے علالت ہونے کے باوجود، ملک وملت کے خیال و معاملات سے کبھی غافل نہیں رہے۔ علامہ کی سرگرمیاں محدود، اور بیرونِ ملک یا بیرونِ لاہور کے سفر بالکل موقوف ہو گئے تھے۔ اس پورے عرصے میں وہ صرف ایک بار دوا لینے کے لیے دہلی گئے یا دسمبر ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ کا دَورہ کیا، جہاں ۲۳ر دسمبر کو انھیں ایک خصوصی کانووکیشن میں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دی گئی۔[۲۶] حالانکہ پچھلے برس ۱۹۳۳ء میں، صرف مارچ میں انھوں نے تین بار دہلی کا سفر کیا تھا۔ اب وہ لاہور میں بھی کم ہی کہیں ادھر ادھر جاتے تھے۔

۴

نقل وحرکت کم ہونے کے سبب قدرتی طور پر ان کا فکری انہماک بڑھ گیا۔ مطالعے کے لیے اب انھیں زیادہ وقت ملتا تھا۔ لکھنے پڑھنے کی طرف توجہ زیادہ ہوتی گئی۔ اسی زمانے میں جنوبی افریقہ کے مسلمانوں نے دَورے کی دعوت دی۔ ترکی سے بھی ایک دعوت نامہ آنے والا تھا۔ ان دعوتوں کا ذکر کرتے ہوئے نذیر نیازی کے نام ایک خط[۲۷] میں کہتے ہیں: بہر حال میری خواہش ہے کہ اس جہان سے رخصت ہونے سے پہلے:

بر آور ہرچہ اندر سینہ داری
سرودے ، نالۂ ، آہے ، فغانے[۲۸]

غالباً یہ اشارہ ہے بالِ جبریل کی طرف، جس کی تسوید و تبییض اُن دِنوں جاری تھی۔ ستمبر ۱۹۳۴ء میں اسے کتابت کے لیے دے دیا گیا۔ اس کے ساتھ عین اسی زمانے میں افغانستان کا منظوم سفر نامہ مسافر کے نام سے زیرِ تحریر و ترتیب تھا۔ یہ اوائل اگست میں مکمل ہو گیا۔

نومبر ۱۹۳۳ء میں انھیں اوکسفرڈ یونی ورسٹی کی طرف سے رہوڈز لیکچروں (Rhodes Lectures) کی دعوت ملی تھی۔ یہ ایک بڑا علمی اعزاز تھا۔ اس کا موضوع: ''زمان و مکاں: فلسفۂ اسلام کی روشنی میں'' تھا۔[۲۹] علامہ نے دعوت قبول کرنے کے بعد فوراً لیکچروں کی تیاری شروع کر دی۔ وہ خوش گمان تھے کہ ان کی آواز ٹھیک ہو جائے گی اور وہ اگلے برس انگلستان جا سکیں گے۔ ۲۲ر جولائی کو نذیر نیازی کو لکھتے ہیں: ''حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کر دیں کہ اب ان کی عنایت سے میری صحت بہت اچھی ہو گئی ہے۔ صرف آواز کی کسر ہے، اس کے لیے کوئی اکسیر تجویز کیجیے۔ ممکن ہے، مجھے اس ماہ کے اندر اندر انگلستان جانا پڑے۔ اس واسطے مَیں ان کی خاص توجہ کا طالب ہوں۔''[۳۰] ۲۳ر جولائی کو پھر انھیں لکھتے ہیں: ''اگر میری آواز اپنی اصلی حالت پر عود کر آئی

تو مَیں اس بیماری کو خدا کی رحمت تصور کروں گا، کیونکہ اس بیماری نے حکیم صاحب سے وہ ادویہ استعمال کرنے کا موقع پیدا کیا ہے، جنھوں نے میری صحت پر ایسا نمایاں اثر کیا ہے۔ تمام عمر میری صحت اتنی اچھی نہ تھی، جیسی اب ہے۔"[۳۱]

سید سلیمان ندوی اور مسعود عالم ندوی کے نام اسی زمانے کے بعض خطوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید اسی ضمن میں بعض علمی مسائل اور علمی نکات ان کے زیرِ غور تھے۔

آنے والے دِنوں میں اقبال صحت مند ہونے کے بارے میں خاصے پُر امید تھے۔ غور و فکر اور مطالعے کے نتیجے میں انھیں بعض نئے موضوعات سوجھنے لگے تھے۔ ۱۰ر دسمبر ۱۹۳۴ء کو راغب احسن کے نام خط میں لکھتے ہیں: "فقۂ جدید کے اصول پر ایک کتاب لکھنے کا قصد رکھتا ہوں [، اسی طرح] قرآن شریف پر مفصل نوٹ لکھنے کا بھی ارادہ کر رہا ہوں۔"[۳۲]

۵

اقبال کے ان عزائم اور علمی سرگرمیوں کا تذکرہ پڑھتے ہوئے اندازہ نہیں ہوتا کہ اسی زمانے میں ان کی پریشانیوں میں ایک بڑی پریشانی کا اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ والدۂ جاوید کی شدید علالت تھی۔ ان کا جگر اور تلی، دونوں بڑھ گئے تھے۔ ڈاکٹروں کا علاج سود مند ثابت نہیں ہو رہا تھا۔ ان کا علاج بھی حکیم نابینا سے شروع کر دیا گیا۔[۳۳]

بیمار آدمی، بسترِ علالت پر پڑے پڑے طرح طرح کی سوچوں میں گھرا رہتا ہے۔ سردار بیگم بھی وسوسوں کا شکار ہوں گی۔ ۵۸ سالہ شوہر بڑھاپے کی عمر میں تھا، اس کی صحت مخدوش، وکالت ختم، مستقل ذریعۂ آمدنی کچھ نہ تھا، کتابوں کی رائلٹی اونٹ کے منہ میں زیرا، بچے کم سن (جاوید ۹ سال، منیرہ ۴ سال) مکان تک اپنا نہ تھا۔ محرومی کا احساس بسا اوقات انسان کو محزون و رنجیدہ کرتا اور بعض اوقات اُسے تلخ بھی بنا دیتا ہے۔

جاوید اقبال لکھتے ہیں: کبھی کبھی والد اور والدہ کے درمیان تکرار بھی ہو جایا کرتی۔ والدہ اصرار کرتیں کہ والد باقاعدگی سے وکالت کریں، کیونکہ گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوتے، نیز کرائے کی کوٹھی کے بجائے اپنا گھر بنوائیں۔[۳۴]

علامہ نے سوچا کہ اب اس سلسلے میں کچھ عملی اقدام کر ڈالنا چاہیے۔ اپنا مکان، اقبال گھرانے کی ایک حقیقی ضرورت تھی۔ مزید برآں سردار بیگم کی روز افزوں بیماری میں یہ ان کی دل جوئی اور ان کے لیے ذہنی سکون و طمانیت کا ایک سبب بھی بن جاتا۔ اقبال نے اگست یا ستمبر میں

اپنی جمع شدہ پونجی سے میوروڈ پر ایک قطعہ اراضی نیلامی میں خریدا اور شیخ عطا محمد کی نگرانی میں ایک ٹھیکے دار نے نومبر ۱۹۳۴ء میں جاوید منزل کی تعمیر شروع کر دی۔ سردار بیگم نے اپنی بچت اور زیورات وغیرہ تعمیری اخراجات کے لیے اقبال کے حوالے کر دیے۔

اس اثنا میں اقبال کے نہایت عزیز دوست سر راس مسعود نے، جو اُن دِنوں ریاست بھوپال میں وزیر تعلیم تھے، اقبال کو بھوپال میں آ کر بجلی کا علاج کروانے کی دعوت دی۔ اقبال ۲۹ر جنوری ۱۹۳۵ء کو لاہور سے روانہ ہوئے اور وہاں علاج معالجے کے بعد ۱۰ر مارچ کو واپس لاہور پہنچے۔ مزید علاج کے لیے دوسری بار جولائی میں اور تیسری بار مارچ ۱۹۳۵ء میں بھوپال جانا پڑا۔ ان تینوں اسفار کی تفصیل آئندہ باب ۲۱ میں بیان کی جائے گی۔

جاوید منزل کی تعمیر اپریل ۱۹۳۵ء میں مکمل ہو گئی تو اقبال گھرانا ۲۰ر مئی کو وہاں منتقل ہو گیا۔ ان دنوں سردار بیگم شدید بیمار تھیں، وہ اپنے قدموں پر نہ چل سکتی تھیں، اس لیے انھیں گاڑی میں جاوید منزل لایا گیا اور چارپائی پر اندر کمرے میں لے جایا گیا۔

سردار بیگم کی صحت خاصی مخدوش تھی، جگر بڑھ گیا تھا، کھانسی کے دَورے پڑتے تھے اور پاؤں پر ورم آ گیا تھا۔ جاوید منزل میں منتقل ہونے کے تیسرے روز ۲۳ر مئی کو وہ انتقال کر گئیں۔ ع:

راہی سوے فردوس ہوئی مادرِ جاوید [۳۵]

جاوید اقبال کہتے ہیں کہ میری والدہ کی وفات نے اقبال کو پژمردہ کر دیا تھا۔ اب اقبال کی چھوٹی بہنوں میں سے زینب بی یا کریم بی جاوید منزل میں آ کر رہتیں۔ کبھی شیخ عطا محمد اور ان کی اہلیہ بھی آ کر رہتے۔ کچھ عرصے کے لیے اقبال کے بھتیجے امتیاز احمد اور ان کی اہلیہ بھی جاوید منزل میں مقیم رہے۔[۳۶]

گزشتہ چند سالوں میں سیاسی مصروفیات اور بیرونِ ملک سفروں کی وجہ سے اقبال کی پیشہ وارانہ وکالتی مصروفیات میں خاصا تعطل رہا اور اب علالت کی وجہ سے تو وکالت بالکل ہی چھوٹ گئی تھی۔ ان کی آمدنی کے ذرائع پہلے ہی محدود تھے، اب اَور بھی کم ہو گئے۔ اب ذریعۂ آمدنی کتابوں کی رائلٹی تھا، کچھ یافت یونی ورسٹیوں کے پرچے دیکھنے سے ہو جاتی تھی۔

اس عمر اور علالت میں پرچے دیکھنے کی مشقت ——— فلسفی شاعر کے اوقات کا یہ استعمال ——— تاریخ میں اکابر کی ناقدری کی ایسی مثالیں کم ہی ہوں گی۔ اس صورتِ حال میں، خدا بھلا کرے، سر راس مسعود کا، جن کی کوششوں سے نواب بھوپال نے تاحیات علامہ کا پانچ سو روپے

ماہوار کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ یہ مئی ۱۹۳۵ء ہی کا واقعہ ہے۔ ایک ایسے وقت میں، جب علامہ اپنے بقول: "چاروں طرف سے آلام و مصائب میں محصور" تھے۔[۳۷] پنشن کے اجرا پر انھیں خوشی ہوئی اور اطمینان بھی۔ سر راس مسعود نے تو یہ کوشش بھی کی کہ بہاول پور اور حیدر آباد کی ریاستوں اور آغا خان کی طرف سے بھی اسی طرح وظائف مقرر ہو جائیں۔ آغا خان نے تو پانچ سو روپے ماہوار کی اعانت منظور کر لی تھی، مگر اقبال نے ان کی تجویز کو پسند نہیں کیا۔ ۱۱ر دسمبر ۱۹۳۵ء کو راس مسعود کو ایک خط میں لکھا: "آپ کو معلوم ہے کہ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے جو رقم میرے لیے مقرر فرمائی ہے، وہ میرے لیے کافی ہے اور کافی نہ بھی ہو تو مَیں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں۔ بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے۔ ضرورت سے زیادہ کی ہوس کرنا روپے کا لالچ ہے، جو کسی طرح بھی کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں ہے۔"[۳۸]

۶

جیسا کہ سابقہ اوراق میں ذکر آ چکا ہے، گذشتہ ڈیڑھ سال سے اقبال کی بیرونِ خانہ سرگرمیاں تقریباً ختم ہو کر رہ گئی تھیں، اس لیے انھیں مطالعے اور لکھنے پڑھنے کے لیے خاصا وقت مل جاتا تھا۔ بالِ جبریل جنوری ۱۹۳۵ء میں چھپ گئی۔ آئندہ مجموعۂ کلام کے لیے بھی خاصا کلام جمع ہو گیا تھا۔ اس کا نام انھوں نے صورِ اسرافیل تجویز کر رکھا تھا۔ (بعد ازاں اسے ضربِ کلیم سے بدل دیا گیا۔) شعر گوئی کے ساتھ عمومی مطالعہ بھی کرتے رہتے۔ اسی زمانے میں الیاس برنی کی کتاب قادیانی مذہب ان کے ہاتھ لگی۔ اس کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور پھر اصل قادیانی کتابیں منگوا کر پڑھیں تو قادیانیت کی حقیقت ان پر پوری طرح الم نشرح ہو گئی۔ اس سے قبل علامہ اقبال نے کشمیر کمیٹی میں قادیانیوں کو قریب سے دیکھ کر ان کے اصل عزائم کا کچھ اندازہ تو کر لیا تھا۔ اقبال نے محسوس کیا کہ وہ صرف اپنے امیر مرزا بشیر الدین محمود کا حکم مانتے ہیں اور انھیں کشمیریوں سے حقیقی ہمدردی نہیں ہے۔ شیخ محمد عبداللہ کو بھی یہی تجربہ ہوا تھا۔ انھوں نے اپنی آپ بیتی آتشِ چنار میں لکھا ہے: "قادیانی حضرات کے اصل مقاصد بہت جلد ہم پر آشکارا ہونے لگے۔ انھوں نے جب ہماری تحریک کی آڑ میں اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو عام کرنا شروع کر دیا تو میرے ساتھ میرے کچھ اَور ساتھیوں نے اس غلط رجحان پر تشویش محسوس کی اور قادیانی حضرات مجھ سے بھی برگشتہ ہو گئے۔"[۳۹] بعد ازاں جب شیخ صاحب نے لاہور میں ایک مجلسِ مشاورت میں مرزا محمود کی موجودگی میں یہ تجویز پیش کی کہ ہر مکتبِ خیال کے راہ نما یہ طے کر لیں کہ وہ تحریک

کے پلیٹ فارم کو اپنے ذیلی مقاصد کی تبلیغ کی نشرگاہ نہیں بنائیں گے تو مرزا محمود نے برملا کہا کہ ہمارے لیے اپنے مشن سے دستبردار ہونا ممکن نہیں۔[۴۰]

علامہ اقبال بھوپال سے ۱۰ر مارچ کو واپس آئے۔ وسط مئی تک دواڑھائی ماہ کا عرصہ ان کے لیے انتہائی پریشانی کا زمانہ تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنی علمی وفکری سرگرمیاں جاری رکھتے ہوئے قادیانیت کی تردید میں Qadianism & Orthodox Muslims کے عنوان سے ایک مفصل مضمون قلم بند کیا، جو کلکتہ کے اخبار *Statesman* میں ۱۴ر مئی ۱۹۳۵ء کو شائع ہوا۔ اسی مضمون کے تکملے (postscript) میں علامہ اقبال نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ ایک فرقہ (separate community) قرار دے۔ قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کے لیے یہ پہلی مؤثر آواز تھی، جس پر *Statesman* نے اداریہ بھی لکھا۔ پھر یہی مضمون ایسٹرن ٹائمز، ٹریبیون، سٹار آف انڈیا اور دکن ٹائمز میں بھی شائع ہوا۔ علامہ کے اس بیان پر قادیانیوں نے یکے بعد دیگرے کئی اعتراض کیے۔ ان کے ہفت روزوں لائٹ اور سن رائز نے قادیانیت کے بارے میں اقبال کے ہاں بعض تناقضات اور تضادات کا ذکر کیا تو اقبال نے وضاحت کی کہ بلاشبہہ مجھے ربع صدی قبل اس تحریک سے اچھے نتائج کی توقع تھی، لیکن اس وقت معلوم نہیں تھا کہ یہ تحریک آگے چل کر کیا شکل اختیار کرلے گی۔ ذاتی طور پر مجھے قادیانی تحریک سے اس وقت کھٹک پیدا ہوئی، جب بانیِ قادیانیت نے [نعوذ باللہ] آنحضورؐ سے بھی برتر، ایک نئی نبوت کا دعویٰ کیا اور اس [خانہ ساز اور جعلی] نبوت پر ایمان نہ لانے والوں کو ''کافر'' قرار دیا۔

یہ صرف اقبال کا تجربہ نہ تھا، شیخ محمد عبداللہ کو بھی جب قادیان میں بتایا گیا کہ ''جو مرزا غلام احمد کی نبوت پر ایمان نہ لائے، اسے [ہم] خارج از اسلام سمجھتے ہیں۔'' تو ان کا احساس تھا: ''اس صاف گوئی سے میری آنکھوں پر سے پردہ ساہٹ گیا اور ان کی نیت اور حکمتِ عملی کا سارا راز فاش ہوگیا۔''[۴۱]

آگے چل کر علامہ نے لکھا: میرا شک وشبہہ اور کھٹک، اس وقت بغاوت میں تبدیل ہوگئی، جب مَیں نے اپنے کانوں سے ایک قادیانی کی زبان سے رسولِ اکرمؐ کے بارے میں توہین وتحقیر آمیز کلمات سنے۔ علامہ نے مزید کہا: بات یہ ہے کہ درخت اپنی جڑ سے نہیں، پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ پھر ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کو اپنی رائے بدل لینے کا حق حاصل ہے۔ ایمرسن کے بقول صرف پتھر ہی اپنے آپ کو نہیں بدل سکتے۔[۴۲]

اقبال نے اپنے موقف کی وضاحت میں جون ۱۹۳۵ء میں ایک اور بیان جاری کیا۔[۴۳]
ادھر کلکتہ کے اخبار ماڈرن ریویو میں پنڈت نہرو نے قادیانیوں کی حمایت میں تین مضمون لکھے، اسی لیے قریبی زمانے میں جب پنڈت نہرو لاہور آئے تو قادیانیوں نے اسٹیشن پر ان کا شاندار استقبال کیا۔ قادیانی اخبار الفضل کے مطابق استقبال کے لیے پہلے سے باقاعدہ تیاری کی گئی تھی اور قادیان اور سیالکوٹ سے ۵۰۰ کارکن منگوائے گئے تھے۔ الفضل کے مطابق استقبال کا یہ نظارہ حد درجہ جاذبِ توجہ اور رُوح پرور تھا۔

باوجود علالت کے، اقبال نے جنوری ۱۹۳۶ء میں ''اسلام اور احمدیت'' کے عنوان سے ایک اور مضمون لکھا، جو پنڈت نہرو کی تحریروں کا مدلل جواب تھا۔ پھر نہرو کے ایک خط کے جواب میں علامہ نے ۲۱ رجون ۱۹۳۶ء کے ایک خط میں لکھا کہ آپ کو احمدیوں کے سیاسی رویے کا علم نہیں ہے۔ آپ کے مضامین سے مسلمانوں نے یہی سمجھا کہ آپ کی ہمدردیاں احمدیوں کے ساتھ ہیں، کیونکہ آپ کے مضامین کی اشاعت پر احمدیوں نے بڑی خوشیاں منائی ہیں۔ بہر حال مَیں خوش ہوں کہ میرا تاثر غلط تھا۔ مَیں نے اپنا مضمون اسلام اور ہندستان کی بہتری کے لیے لکھا تھا۔ مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ احمدی اسلام اور ہندستان، دونوں کے غدار ہیں۔ علامہ کے اصل الفاظ یہ ہیں: I have no doubt in my mind that the Ahmadis are traitors both to Islam and to India۔[۴۴]

علامہ کے اس خط کے بعد قادیانیوں کے بارے میں نہرو کا ذہن بڑی حد تک صاف ہو گیا، چنانچہ اگلے برس وہ لاہور آئے تو قادیانیوں نے ان کا استقبال نہیں کیا، کیونکہ قادیانی سمجھ گئے تھے کہ اب نہرو پر قادیانیت کی اصل حقیقت بے نقاب ہو چکی ہے۔ اس موقعے پر نہرو علامہ سے ملنے جاوید منزل گئے اور ڈیڑھ دو گھنٹے تک مفصل گفتگو رہی۔

قادیانیت کی بحثوں میں علامہ اقبال نے یہ سوال اٹھایا کہ قادیانیوں نے معاشرتی طور پر خود کو مسلمانوں سے الگ کر لیا ہے اور وہ مسلمانوں کو کافر سمجھتے اور کہتے ہیں تو پھر وہ سیاسی طور پر مسلمانوں میں شامل رہنے پر کیوں مصر ہیں؟ علامہ اقبال کے بیانات اور مضامین کے ردِ عمل میں قادیانی حلقوں نے طرح طرح کے اعتراضات اٹھائے، لیکن مسلم پریس نے اقبال کے موقف کی تائید کی اور قادیانیوں کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دینے کے لیے مزید دلائل مہیا کیے۔

۷

قادیانیت سے اس مناقشے کے باوجود علامہ اقبال ہندستانی سیاست سے غافل نہ تھے۔ ۳۰؍ جولائی ۱۹۳۵ء کو علامہ اقبال، سیٹھ عبداللہ ہارون اور مولانا شفیع داؤدی نے گورنمنٹ آف انڈیا بل کے سلسلے میں ایک بیان جاری کیا اور چند تجاویز پیش کیں، تاکہ مذکورہ بل میں اصلاح کر دی جائے۔ ۸؍ اور ۹؍ جولائی ۱۹۳۵ء کی شب سکھوں نے مسجد شہید گنج کو منہدم کر دیا۔ مختصراً اس کا پس منظر یہ ہے کہ مسجد شہید گنج ۱۶۴۵ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ سکھوں نے اس پر قبضہ کر لیا تو مسلمانوں نے ۱۸۵۳ء میں مقدمہ دائر کیا۔ ۱۸۸۵ء میں عدالت نے مسلمانوں کے خلاف فیصلہ دیا۔ اس کے باوجود مسلمان حصولِ مسجد کے لیے کوشاں رہے، مگر سکھوں نے نہ صرف اسے واگزار کرنے سے انکار کیا، بلکہ بالفعل اسے شہید کر دیا۔[۴۵] لاہور میں ہنگامے شروع ہو گئے۔ ۲۰؍ جولائی کو احتجاج کرنے والے مسلمانوں پر گولی چلی اور مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ پنجاب کے مسلم لیڈروں سر فضل حسین، سر سکندر حیات، ملک فیروز خاں نون اور ملک مظفر حسین وغیرہ نے اس معاملے میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ سکندر حیات آئندہ انتخابات کے بعد وزارتِ اعلیٰ کا خواب دیکھ رہے تھے اور اس کے لیے اکالی دَل (سکھوں) کی حمایت کے خواہاں تھے، ورنہ وہ گورنر سے مِل کر مسجد کو بچا سکتے تھے۔[۴۶] علامہ اقبال کو علاج کے لیے بھوپال جانا پڑا۔ یہ قضیہ بہت دِنوں تک چلا۔ مسجد کی بازیابی کے لیے ہائی کورٹ نے مسلمانوں کا دعویٰ رَد کر دیا۔ اقبال چاہتے تھے کہ آل انڈیا مسلم لیگ اس معاملے میں مسلمانوں کی راہ نمائی کرے، بلکہ ایک روز انھوں نے آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ اگر آل انڈیا مسلم لیگ مسجد کی بازیابی کے لیے ڈائرکٹ ایکشن کا فیصلہ کرے گی تو مَیں سب سے پہلے اپنی جان قربان کر دوں گا۔[۴۷]

مسجد شہید گنج ہی کے سلسلے میں ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کا بیان کردہ ایک واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے، جو علامہ کی دردمندی اور اس لگن اور جوش و خروش کو ظاہر کرتا ہے، جو انھیں ہندستانی مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ان کے مستقبل سے تھی۔ ڈاکٹر بٹالوی لکھتے ہیں: ''جب ۲۶؍ جنوری ۱۹۳۸ء کو ہائی کورٹ کے فل بنچ نے مسجد شہید گنج کی اپیل خارج کر دی تو مسلمانوں میں سخت ہیجان پیدا ہو گیا تھا اور بڑے بڑے احتجاجی جلوس نکلنا شروع ہو گئے تھے۔ اسی شام غلام رسول خاں نے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اب کیا کرنا چاہیے تو ڈاکٹر صاحب رو پڑے اور کہنے لگے: ''مجھ سے کیا پوچھتے ہو، میری چارپائی کو اپنے کندھوں پر اٹھاؤ اور اس طرف لے چلو، جس

طرف مسلمان جا رہے ہیں۔ اگر گولی چلی تو میں بھی ان کے ساتھ مروں گا۔"[۴۸] یہ علامہ کا بڑا ایثار تھا کہ وہ ایک خاموش طبع اور گوشہ گیر قسم کے آدمی ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں کی بھلائی کی خاطر جیل جانے اور گولی کھانے کی بات کرنے لگے تھے۔ دراصل علامہ اس مسئلے پر بہت مضطرب تھے اور ایجی ٹیشن کرتے ہوئے قانون شکنی کے لیے بھی تیار تھے۔[۴۹] مزید یہ کہ انھوں نے ملک برکت علی سے تحفظ مساجد کا ایک بل بھی تیار کروایا۔ اگر یہ بل اسمبلی سے پاس ہو جاتا تو شہید گنج کا مسئلہ حل ہو جاتا، مگر سر سکندر حیات کی مصلحتیں آڑے آئیں اور انھوں نے یہ بل اسمبلی میں پیش ہی نہ ہونے دیا۔[۵۰]

انھیں اندازہ ہو رہا تھا کہ شاید ان کی صحت مکمل طور پر بحال نہ ہو سکے گی، اس لیے انھوں نے ۱۳/ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو ایک وصیت نامہ تحریر کیا، جس میں جاوید کے ماموں خواجہ عبدالغنی، اپنے بھتیجے شیخ اعجاز احمد، منشی طاہر الدین اور چودھری محمد حسین کو اپنے نابالغ بچوں اور جائداد کا ولی مقرر کیا اور وصیت کی کہ وفات کے بعد چند کتابوں کے علاوہ باقی تمام ذاتی کتابیں اسلامیہ کالج [ریلوے روڈ] لاہور کی لائبریری میں رکھ دی جائیں اور پہننے کے تمام کپڑوں کو غربا میں تقسیم کر دیا جائے۔[۵۱] اب یہ کتابیں اسلامیہ کالج، سول لائنز کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ ان کی وضاحتی فہرست چودھری محمد صدیق نے *Descriptive Catalogue of Allama Iqbal's Personal Library* کے نام سے شائع کی ہے۔

۲۵/ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو علامہ پانی پت روانہ ہوئے۔ چودھری محمد حسین، راجا حسن اختر اور جاوید اقبال بھی ان کے ساتھ پانی پت گئے۔ علی بخش بھی ہمراہ تھا۔ یہ سفر مولانا حالی کے صد سالہ جشن ولادت کی تقریبات میں شرکت کے سلسلے میں تھا۔ ۲۶/ اکتوبر کو وہاں نواب بھوپال کی زیر صدارت ایک جلسہ منعقد ہوا۔ علامہ اقبال جلسے میں چند اشعار پیش کرنا چاہتے تھے، مگر گلے کی خرابی کی وجہ سے خود نہ پڑھ سکتے تھے، اس لیے ان کے اشعار، ایک خوش الحان مدرس نے پڑھ کر سنائے۔ ۲۷/ اکتوبر کو سب لوگ واپس لاہور آ گئے۔[۵۲]

علامہ کی صحت اضمحلال کا شکار ہو رہی تھی، اس لیے انھوں نے انجمن حمایت اسلام کی صدارت سے استعفا لکھ بھیجا، مگر انجمن نے اسے منظور نہیں کیا اور درخواست کی کہ علامہ انجمن ہذا کی بدستور سرپرستی جاری رکھیں۔ انجمن آپ کی ہدایات کے مطابق مناسب و ضروری اصلاح کرنے کو تیار ہے۔[۵۳]

حوالے اور حواشی

۱۔ ذکرِ اقبال، ص۱۸۸-۱۸۹
۲۔ اقبال نامہ، ص۳۰۵
۳۔ اقبال: جہانِ دیگر، ص۳۹
۴۔ *Disclaimer*، ص۸۹
۵۔ ایضاً، ص۸۰
۶۔ ایضاً
۷۔ ارمغان حجاز فارسی، ص۳۲
۸۔ روایت احمد الدین مارہروی: اردو ڈائجسٹ، اپریل ۱۹۶۷ء، ص۳۵
۹۔ روایت: مختار زمن، نقوش، اقبال نمبر، اول؛ ۱۹۷۷ء، ص۵۰۱
۱۰۔ *Letters & Writings of Iqbal*، ص۸-۹
۱۱۔ اقبال : جہانِ دیگر، ص۴۳
۱۲۔ *Disclaimer*، ص۸۸
۱۳۔ زندہ رُود، ص۵۹۵
۱۴۔ زندہ رُود، ص۵۹۵-۵۹۶
۱۵۔ مختلف امراض کی نوعیت، ان میں کمی بیشی اور علاج معالجے کی مجموعی کیفیت اور تفصیل سید نذیر نیازی اور ڈاکٹر مظفر الدین قریشی کے نام اقبال کے خطوں میں ملتی ہے۔ اقبال کی بیماریوں کا طبی تجزیہ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنی تصنیف چوں مرگ آید میں بڑی خوبی اور عمدگی سے کیا ہے۔
۱۶۔ چوں مرگ آید، ص۵۶
۱۷۔ زندہ رُود، ص۶۰۱
۱۸۔ مکتوبات بنام نیازی، ص۱۶۲
۱۹۔ ایضاً، ص۱۶۴
۲۰۔ اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص۱۶۵
۲۱۔ ایضاً، ص۱۲۶-۱۲۸
۲۲۔ مخفی گوشے، ص۱۵۴
۲۳۔ انقلاب، ۲۴ر فروری ۱۹۳۴ء، بحوالہ: گفتارِ اقبال، ص۱۸۲-۱۸۳
۲۴۔ انقلاب، ۲۶ر مئی ۱۹۳۴ء، بحوالہ: گفتارِ اقبال، ص۱۸۳-۱۸۴
۲۵۔ انقلاب، ۱۰ر جولائی ۱۹۳۴ء، بحوالہ: گفتارِ اقبال، ص۱۸۵-۱۸۶
۲۶۔ سرسید، اقبال اور علی گڑھ، ص۱۸۔ زندہ رُود، ص۶۰۴
۲۷۔ مکتوبات بنام نیازی، ص۱۵۲۔ پیامِ مشرق، ص۳۳

۲۸۔ پیامِ مشرق، ص ۳۳
۲۹۔ مکتوبات بنام نیازی، ص ۱۱۸-۱۱۹
۳۰۔ ایضاً، ص ۱۷۴
۳۱۔ ایضاً، ص ۱۷۵
۳۲۔ اقبال: جہانِ دیگر، ص ۸۷
۳۳۔ زندہ رُود، ص ۶۰۲
۳۴۔ اپنا گریباں چاک، ص ۲۰
۳۵۔ کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال، ص ۵۲۴
۳۶۔ زندہ رُود، ص ۶۰۸-۶۰۹
۳۷۔ اقبال نامہ، ص ۲۷۳-۲۷۴
۳۸۔ اقبال نامے، ص ۱۹۵
۳۹۔ آتش چنار، ص ۱۴۴
۴۰۔ ایضاً، ص ۱۴۵
۴۱۔ ایضاً، ص ۴۷
۴۲۔ *Speeches*، ص ۲۰۵-۲۰۶
۴۳۔ ایضاً، ص ۲۰۸-۲۱۴
۴۴۔ ایضاً، ص ۲۴۱
۴۵۔ میاں عبدالعزیز مالواڈہ، ص ۱۰۷-۱۰۹
۴۶۔ تحریک پاکستان، ص ۲۶۷-۲۶۹
۴۷۔ ذکرِ اقبال، ص ۲۰۸
۴۸۔ اقبال کے آخری دو سال، ص ۵۵۳
۴۹۔ سرگذشتِ اقبال، ص ۵۰۸
۵۰۔ ایضاً، ص ۵۱۰
۵۱۔ زندہ رُود، ص ۶۱۴-۶۱۵۔ علامہ اقبال کی پہلی بیوی کریم بی بی (۱۸۷۴ء-۱۹۴۷ء) دونوں بچوں: آفتاب اقبال (۱۸۹۸ء-۱۹۷۹ء) اور معراج بیگم (۱۸۹۶ء-۱۹۱۵ء) کے ساتھ زیادہ تر اپنے میکے میں مقیم رہیں۔ بچوں کی پرورش اور تربیت بھی وہیں ہوئی۔ آفتاب اقبال نے ایم اے فلسفہ کیا، ۱۹۳۱ء میں لندن سے بار ایٹ لا کی ڈگری لی۔ کلکتہ یونی ورسٹی اور اسلامیہ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کے استاد رہے۔ اقبال کی وفات کے بعد پہلے لاہور ہائی کورٹ میں اور بعد ازاں کراچی میں قانونی پریکٹس کرتے رہے۔ جب آفتاب اقبال والد کی اجازت یا مشورے کے بغیر اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت گئے تو وہاں مالی مشکلات درپیش ہوئیں۔ انھوں نے بعض لوگوں سے اپنے والد کے نام پر قرض لیے، مثلاً: اکبر حیدری سے ۱۹۰ پونڈ لیے، بعد ازاں ۱۹۳۶ء میں پھر انھی سے کچھ اور رقم مانگی۔ سر اکبر حیدری نے ایک خط کے

ذریعے بڑے محتاط انداز میں علامہ کو آفتاب کی مالی اعانت کی طرف متوجہ کیا تو علامہ نے سر اکبر حیدری کو اصل صورتِ حال سے آگاہ کیا، جو خاصی تکلیف دہ تھی۔ علامہ نے لکھا کہ میں اپنی استطاعت سے بڑھ کر اس کی مدد کرتا رہا ہوں، لیکن اس نے میرے ساتھ اور خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے، وہ ناقابلِ بیان ہے۔ اس نے ہمیں بے ہودہ قسم کے خطوط لکھے ہیں اور اب وہ ہمیں بلیک میل کر رہا ہے۔ اقبال؛ پہلی بیوی (یعنی والدۂ آفتاب) کو آخر عمر تک ایک مقررہ رقم بھیجتے رہے۔ آفتاب اقبال کے ننھیال والے خاصے خوش حال لوگ تھے۔ انگلستان میں اعلیٰ تعلیم کے اخراجات زیادہ تر انھوں نے ہی برداشت کیے ہوں گے، لیکن علامہ کے خطوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی آفتاب اقبال کی مالی اعانت کیا کرتے تھے، تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ علامہ نے اپنی وراثت میں آفتاب اور ان کی والدہ کو حصّہ دار نہیں بنایا، جو بعض لوگوں کے نزدیک از رُوے شرع ایک قابلِ گرفت بات ہے۔ (آفتاب اقبال اور ان کی والدہ کے حالات کے سلسلے میں تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: *علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی از حامد جلالی [انجمن پریس، کراچی ۱۹۶۷ء]، *علامہ اقبال اور ان کے فرزندِ اکبر آفتاب اقبال از بیگم رشیدہ آفتاب اقبال [فیروز سنز، کراچی ۱۹۹۹ء]، *اقبال اور گجرات از ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ، نیز دیکھیے: *اقبالیاتی جائزے، ص ۵۶-۵۷)

۵۲۔ زندہ رود، ص ۶۱۵-۶۱۶

۵۳۔ اقبال اور انجمن حمایتِ اسلام، ص ۱۳۰

❖......❖......❖

(۲۱)

لیکن مجھے اعماقِ سیاست سے ہے پرہیز

۱

علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء کے بعد قانون ساز اسمبلی پنجاب میں مزید تین سال کے لیے مسلمانوں کی نمائندگی کرنے سے معذرت کر لی تھی، تاہم ۱۹۳۳ء کے اوائل تک، جب وہ تیسری گول میز کانفرنس سے واپس آئے، کسی نہ کسی حد تک عملی سیاست میں حصّہ لیتے رہے، لیکن ۱۹۳۴ء سے ان کی سیاسی سرگرمیاں بالفعل ختم ہوگئیں، اس کی دو وجوہ تھیں:

اوّل: ان کی علالت۔

دوم: مسلم سیاست کی داخلی بدنظمی، انتشار اور مفاد پرستانہ رویّے؛ جن سے وہ سخت پریشان اور مایوس ہو گئے تھے۔

۷ ارستمبر ۱۹۳۳ء کو سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں: ''مسلمانوں کے انتشار سے بے حد دردمند ہوں اور گذشتہ پانچ چار سال کے تجربے نے مجھے سخت افسردہ کر دیا ہے..... مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ نہایت پست فطرت ہے۔''[۱] اس کے باوجود اپنی ملت کی فلاح و بہبود اور ان کی ترقی اور سربلندی کے لیے جدوجہد علامہ اقبال کے مقاصدِ زندگی میں سرِفہرست نظر آتی ہے، چنانچہ وہ اپنی فطری دردمندی اور جذبۂ خدمت کے تحت، اسی مقصد میں کامیابی کی تدابیر پر مسلسل غور و فکر کرتے رہے۔ اس زمانے کی منظومات، خطوط اور تقاریر و بیانات میں ان کے دلی جذبات کا رُخ بہت واضح ہے۔ اُمتِ مسلمہ کی حالتِ زار کا نقشہ کس خوبی اور ایجاز و اختصار کے ساتھ ''ساقی نامہ''[۲] کے ایک شعر میں کھینچا ہے:

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے

اسی نظم کے چند مزید اشعار دیکھیے، جو ان کے احساسات کی بہت عمدہ ترجمانی کرتے ہیں:

مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں

مرے نالۂ نیم شب کا نیاز مری خلوت و انجمن کا گداز
امنگیں مری ، آرزوئیں مری امیدیں مری ، جستجوئیں مری
مری فطرت ، آئینۂ روزگار غزالانِ افکار کا مرغزار
مرا دل مری رزم گاہِ حیات گمانوں کے لشکر ، یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر اسی سے فقیری میں ہوں مَیں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ، ٹھکانے لگا دے اسے

امت کے زوال و انحطاط کے باوجود، اس کے مستقبل کے بارے میں انھی امیدوں، آرزوؤں اور امنگوں نے علامہ کو اپنے ''قافلے'' سے پابستہ رکھا اور وہ حسبِ ضرورت اس کی راہ نمائی کرتے رہے، مگر اس کی تفصیل میں جانے سے پہلے، ترتیب زمانی کے لحاظ سے ، یہاں بھوپال کے تین اسفار کا ذکر ضروری ہے۔

۲

علامہ اقبال کے قدردان تو بہت تھے، مگر ان سے سرراس مسعود (۱۸۸۹ء-۱۹۳۷ء) جیسی محبت رکھنے والے کم ہی ہوں گے۔ علامہ کو بھی ان سے ایک خاص تعلقِ خاطر تھا، جس کی ابتدا نومبر ۱۹۲۹ء میں ہوئی تھی، جب اقبال نے راس مسعود کی دعوت پر علی گڑھ جا کر چھ خطبات پیش کیے تھے۔ پھر اکتوبر ۱۹۳۳ء میں سفرِ افغانستان کے موقع پر دونوں کو مسلسل بارہ شب و روز اکٹھے رہنے اور تبادلۂ خیال کا موقع ملا۔ ۱۹۳۴ء میں سرراس مسعود کو اقبال کی علالت کی خبر ملی تو وہ سخت پریشان ہوئے۔ انھوں نے حمیدیہ ہسپتال، بھوپال کے ڈاکٹروں سے مشورے کے بعد، اقبال کو بھوپال آ کر علاج کرانے کی دعوت دی، بلکہ اصرار کیا۔ ان کے اصرار میں نواب صاحب بھوپال، حمیداللہ خاں کی فکرمندی کو بھی دخل تھا۔ علامہ ایک سال سے بیمار چلے آ رہے تھے، حکیم نابینا صاحب کی دواؤں سے انھیں کچھ زیادہ افاقہ نہ ہوا تھا، اس لیے وہ بھوپال جا کر علاج پر رضامند ہو گئے۔

وہ ۲۹ر جنوری ۱۹۳۵ء کی شام لاہور سے روانہ ہوئے۔ ۳۰ر جنوری کو علی الصبح دہلی پہنچے اور دن کا بیشتر وقت افغان قونصل خانے میں سردار صلاح الدین سلجوقی کی صحبت میں گزارا۔ شام کو جامعہ ملیہ میں ترکی کی معروف صحافی خالدہ ادیب خانم کے ایک لیکچر کی صدارت کی۔ ان سے مختصر تبادلۂ خیال بھی رہا۔ اسی شب وہ دہلی سے روانہ ہو کر اگلی صبح بھوپال پہنچ گئے۔[۳] ریلوے اسٹیشن پر

راس مسعود نے بذاتِ خود ان کا استقبال کیا۔ نواب بھوپال کی طرف سے ان کے ملٹری سیکرٹری کرنل اقبال محمد خاں اسٹیشن پر آئے ہوئے تھے۔ راس مسعود نے اقبال کو اپنے ہاں ریاض منزل میں ٹھہرایا۔ ممنون حسن خان کو اقبال کی خدمت پر مامور کر دیا۔ اس سفر میں اقبال، علی بخش کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

بھوپال ریلوے اسٹیشن پر استقبال کے موقع پر ایک دلچسپ بات یہ ہوئی کہ مہمان کا سامان لے جانے کے لیے ایک الگ گاڑی بھی منگائی گئی تھی۔ میزبانوں کا قیاس تھا کہ ایک ڈیڑھ ماہ کے لیے آنے والے مہمان (علامہ ڈاکٹر سر مع خادمِ خاص) کے ساتھ سفر و حضر کی ضروریات کا اچھا خاصا سامان بھی ہوگا، لیکن اقبال کا سامانِ سفر اس قدر مختصر تھا کہ راس مسعود کی گاڑی ہی میں سما گیا اور سامان والی گاڑی خالی ہی واپس آ گئی۔[۴]

۵ فروری کو حمیدیہ ہسپتال میں اقبال کے طبی معائنوں کے بعد ماورا بنفشی شعاعوں (Ultra Violet Rays) کا علاج شروع ہوا۔ ۶ مارچ کو پہلا کورس مکمل ہوا۔ ایک ماہ کے اس قیام میں اقبال کا دوپہر تک کا وقت عام طور پر بجلی کے علاج میں گزرتا۔ اس کے لیے وہ ہفتے میں دو تین روز حمیدیہ ہسپتال جاتے تھے۔ بقول اقبال: یہاں کے ''ڈاکٹر نہایت ہوشیار......اور ہسپتال بھی نہایت عمدہ'' تھا۔[۵]

بھوپال پہنچے تو دوسرے یا تیسرے روز سر راس مسعود کی معیت میں نواب بھوپال سے ملاقات ہوئی، جس میں دوسرے موضوعات کے علاوہ قرآنِ پاک پر اقبال کی موعودہ کتاب بھی زیرِ بحث رہی۔ اقبال نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ ریاست کے غیر آباد علاقوں میں بیرونِ ریاست کے مسلمانوں کو بلا کر آباد کر دیا جائے اور انھیں ریاست کی جانب سے آبادکاری کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔[۶] یہ بہت دُور رَس تجویز تھی۔ نواب صاحب نے عمل درآمد کی کوشش بھی کی، مگر کانگرس نے اسے ناکام بنا دیا۔

اقبال، ریاض منزل میں مقیم تھے۔ یہ ''شہر سے دُور ایک وسیع و پُرشکوہ دو منزلہ عمارت تھی، جو چہار جانب خوب صورت پہاڑیوں اور تالاب سے گھری ہوئی تھی۔''[۷] اس کے دل کش اور پُر فضا منظر نے اقبال کے تغزل کو، باوجود ان کی علالت کے، از سرِ نو بیدار کر دیا۔[۸] بھوپال کے پانچ ہفتگی قیام میں علامہ نے سات نظمیں لکھیں۔ یہ سب ضربِ کلیم میں شامل ہیں۔ نظم ''نگاہ'' (ص ۱۰۴) کے دو شعر:

اندھیری رات میں یہ چشمکیں ستاروں کی
یہ بحر، یہ فلکِ نیلگوں کی پہنائی
سفر عروسِ قمر کا عماریِ شب میں
طلوعِ مہر و سکوتِ سپہرِ مینائی

اقبال کچھ وقت مطالعے میں گزارتے۔ مثنویِ مولانا روم اور دیوانِ غالب ان کے سرہانے دھرے رہتے۔ شام کے اوقات میں بالعموم روزانہ سر راس مسعود سے ملاقات وصحبت رہتی۔ ان کی بیگم بھی علامہ کی خدمت گزار تھیں۔ سر راس مسعود کو اندازہ تھا کہ علامہ خود بیمار ہیں اور اپنی بیگم کی علالت سے انھیں ایک فکرمندی اور پریشانی لاحق رہتی ہے، اس لیے وہ ہر طرح سے ان کے آرام و آسائش کا خیال رکھتے اور برابر ان کی دل جوئی میں لگے رہتے تھے۔ کبھی کبھی انھیں گھمانے کے لیے باہر بھی لے جاتے۔ بالعموم شام کو کھانے پر ملاقات رہتی۔

فروری کا پورا مہینا برقی شعاعوں کا علاج جاری رہا۔ علاج کا پہلا مرحلہ مکمل ہوا تو اقبال کی مجموعی صحت بہتر ہو گئی،[9] مگر سردار بیگم کا خیال انھیں پریشان رکھتا اور یہ فطری امر تھا۔ بہر حال ۷ مارچ کی شام بھوپال سے روانہ ہو کر ۸ مارچ کی صبح دہلی پہنچے، حکیم صاحب نابینا سے ملاقات کی، بیگم کی دوائیں لیں اور اگلے روز صبح لاہور پہنچ گئے۔

جیسا کہ باب ۲۰ میں ذکر ہو چکا ہے، ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء کو شام چھے بجے سردار بیگم مالکِ حقیقی سے جا ملیں۔ سردار بیگم نے اپنی زندگی میں علامہ کو گھریلو مسائل اور ذمہ داریوں سے بالکل بے نیاز کر رکھا تھا۔ امورِ خانہ داری کو وہ نہایت سلیقے سے چلاتی رہی تھیں۔ علامہ ان کے سگھڑپن کے معترف تھے۔ مسز ڈورس احمد بتاتی ہیں کہ علامہ اکثر سردار بیگم کا ذکر کیا کرتے تھے۔ ان کا ایک جملہ ہے: He was always full of praise for her. یعنی وہ ہمیشہ ان کی تعریف میں رطب اللسان رہتے۔ کہا کرتے کہ وہ ایک مخلص اور بے لوث بیوی اور ماں تھیں۔[10] اب سردار بیگم کی غیر موجودگی میں دونوں بچوں کی نگرانی اور دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی اقبال پر آ پڑی تھی۔ سردار بیگم کی وفات کو انھوں نے امرِ ربی سمجھا۔ اقبال کا کہنا تھا: ہر چہ از دوست مے رسد نیکواست، مگر ان کا اطمینانِ قلب رخصت ہو گیا۔[11] قصہ مختصر سردار بیگم کی وفات، علامہ کے لیے ایک سنگین مسئلہ تھا اور بہت سے مسائل کا پیش خیمہ بھی؛ مگر ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے علامہ کی صحت بحال ہونا ضروری تھا۔

۱۵؍ جولائی کو برقی علاج کے دوسرے کورس کے لیے علامہ لاہور سے روانہ ہوئے۔ ۱۶ کا دن دہلی ریلوے اسٹیشن پر گزار کر ۱۷ کو بھوپال پہنچ گئے۔ اس بار علی بخش کے علاوہ جاوید بھی اپنے ہمراہ لائے تھے۔ نواب صاحب کے حسب ہدایت انھیں سرکاری قیام گاہ شیش محل میں ٹھہرایا گیا۔ یہ جگہ حمیدیہ ہسپتال سے نسبتاً قریب تھی۔ اقبال کے معالج ڈاکٹر عبدالباسط کا مکان "قدسیہ محل" بھی نزدیک ہی واقع تھا۔ جاوید اقبال ان کے بچوں کے ساتھ کھیلتے رہتے۔ دوسرے تیسرے روز وہ والد کے ساتھ ریاض منزل جایا کرتے تھے۔[۱۲]

حسب سابق علاج کا دوسرا کورس ۲۸؍ اگست تک جاری رہا۔ اس مرتبہ علامہ نے چند نظموں کی تخلیق کے ساتھ کچھ علمی و تحقیقی کام بھی کیا۔ غالباً قرآن مجید کے حواشی کے سلسلے میں ابتدائی خاکہ بھی اسی زمانے میں تیار کیا۔ قادیانیت پر وہ چند ایک مضامین لکھ چکے تھے، مگر اس سلسلے کے سب سے طویل اور آخری مضمون Islam and Ahmadism کے لیے، وہ ان ایام میں لوازمہ جمع کر رہے تھے اور اسی ضمن میں سید سلیمان ندوی سے قادیانیت سے متعلق بعض نکات پر استفسار کر رہے تھے۔[۱۳] راس مسعود کی معیت میں وہ ایک سے زائد بار نواب صاحب بھوپال سے بھی ملاقات کرنے گئے اور مختلف مسائل پر ان سے گفتگو کی۔[۱۴] حسب ضرورت مطالعہ و تحقیق کے لیے حمیدیہ لائبریری اور بعض احباب سے کتابیں منگا لیتے تھے۔[۱۵] اگرچہ سر راس مسعود کی ہدایت پر علامہ کے ملاقاتیوں کی تعداد محدود کر دی گئی تھی، پھر بھی بہت سے اصحابِ علم و ادب ملاقات کے لیے آ جاتے، چنانچہ ان سے تبادلۂ خیالات بھی ہوتا۔

فکرِ سخن اور شعر گوئی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اس مرتبہ بھی علامہ نے (بعد ازاں ضربِ کلیم میں شامل) متعدد بلند پایہ نظمیں لکھیں۔ ان میں پہلی نظم "صبح" (ص ۱۴) ہے۔ صرف دو شعروں پر مشتمل یہ مختصر نظم ایک مکمل تاثر دیتی ہے:

یہ سحر، جو کبھی فردا ہے، کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر، جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

صہبا لکھنوی کہتے ہیں کہ بھوپال مساجد کا شہر کہلاتا تھا اور شیش محل کے اردگرد تقریباً چودہ مساجد تھیں، جن میں صبح کے وقت اذانوں کا سلسلہ دیر تک جاری رہتا تھا۔ اس نظم میں وجد و انبساط

کی حقیقی کیفیت نمایاں ہے۔[۱۶]

یکم اگست کو اقبال نے نذیر نیازی کو اطلاع دی: ''میری صحت ترقی کر رہی ہے، الحمدللہ!''[۱۷] ۵ر اگست کو پروفیسر شجاع الدین ناموس کو لکھا: ''میری صحت عامہ پہلے کی نسبت بہت اچھی ہے اور آواز میں بھی کسی قدر فرق ہے۔ امید ہے کہ اس دفعہ علاج سے بہت فائدہ ہوگا۔''[۱۸] ۱۰ر اگست کو پھر نیازی صاحب کو مطلع کیا: ''صحت خوب ترقی کر گئی ہے، آواز میں بھی فرق ہے۔ امید ہے، اب کے علاج سے فائدہ ہوگا۔''[۱۹] تاہم جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ برقی علاج سے بھی اقبال کی تکلیف میں خاطر خواہ افاقہ نہ ہوا تھا۔ بھوپال کے ڈاکٹروں نے ان کی بیماری کی رپورٹیں وی آنا بھجوائیں، مگر اقبال وی آنا جا کر اس عمر میں اپنے علاج پر کثیر رقم صرف کرنا بچوں کی حق تلفی سمجھتے تھے۔[۲۰]

۲۸ر اگست کو علاج کا دوسرا کورس ختم ہوا، اسی روز شام کو بھوپال سے روانہ ہو کر ۲۹ر اگست کی صبح دہلی اور ۳۰ کی صبح لاہور پہنچ گئے۔

دوسرے کورس کے دوران میں، علامہ نے نیازی صاحب کے نام خط میں لکھا تھا: ''شاید ایک دفعہ اَور بھوپال آنا پڑے گا۔''[۲۱] چنانچہ تقریباً چھے ماہ بعد، تیسری بار علامہ اقبال ۲ر مارچ ۱۹۳۶ء کو بھوپال پہنچے۔ حسبِ سابق علی بخش اور جاوید اقبال بھی ان کے ہمراہ تھے۔

اس مرتبہ بھی ان کا قیام شیش محل میں تھا۔ حسبِ سابق بجلی کا علاج شروع ہوا اور پانچ ہفتے تک جاری رہا۔ ان کے معمولات حسبِ سابق تھے، یعنی قبل دوپہر حمیدیہ ہسپتال میں علاج، دوپہر اور شام کو مطالعہ اور آرام۔ از خود سیر و تفریح کے لیے نہیں جاتے تھے۔ سر راس مسعود سے ملاقات اور تبادلۂ خیالات ہوتا اور وہ انھیں گھمانے کے لیے باہر بھی لے جاتے۔

۳

۹ر اپریل کو واپس لاہور پہنچے تو نذیر نیازی کا تأثر یہ تھا کہ ''بھوپال کا قیام ان کی صحت کے لیے بہت اچھا رہا۔ آواز کی حالت بھی بہتر ہو گئی تھی اور چہرے پر بھی تندرستی کے آثار نمایاں تھے۔''[۲۲] اس مرتبہ کے قیام میں سب سے اہم اور قابلِ ذکر واقعہ یہ تھا کہ آخری دنوں میں علامہ اقبال نے ایک خواب دیکھا۔ اس کی تفصیل انھوں نے پروفیسر محمد الیاس برنی کے نام ۱۳ر جون[۲۳] اور سر راس مسعود کے نام ۲۹ر جون[۲۴] کے خطوط میں بیان کی ہے۔ علامہ نے بتایا کہ ۳ر اپریل کی رات ۳ بجے کے قریب خواب میں سرسید احمد خاں سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے مجھے ہدایت کی: اپنی بیماری کے متعلق حضورِ رسالت مآب کی خدمت میں عرض داشت پیش کرو۔ اسی وقت آنکھ کھل

گئی اور ساٹھ اشعار عرض داشت کی صورت میں فارسی زبان میں لکھے گئے۔ لاہور پہنچ کر خیال آیا کہ یہ اشعار کسی زیادہ بڑی مثنوی کے آخری حصّے میں شامل ہوں تو خوب ہو۔ اب یہ مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق کے نام سے مکمل ہو گئی ہے۔ ۴/ اپریل کی صبح سے میری آواز میں کچھ تبدیلی شروع ہوئی۔ اب پہلے کی نسبت آواز صاف تر ہے اور اس میں وہ رِنگ (Ring) عود کر رہا ہے، جو انسانی آواز کا خاصہ ہے۔ گو اس کی رفتار بہت سست ہے۔

مذکورہ مثنوی پہلی بار اکتوبر ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی تھی۔

علامہ اقبال علاج معالجے کے مذکورہ بالا مراحل میں بھی ہندستانی سیاست کا مطالعہ کرتے رہے۔ بھوپال سے علاج کے تیسرے کورس کے بعد، واپس آ کر وہ حسبِ سابق مسلم زعما کے مشوروں میں شریک ہونے لگے۔ حالات جس رُخ پر جا رہے تھے، اس میں ہندی مسلمانوں کو اقبال جیسے صاحبِ تدبیر و بصیرت شخص کی راہ نمائی کی اشد ضرورت تھی۔ جلد ہی انھیں مسلم لیگ پنجاب کی صدارت کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ تفصیل آگے آ رہی ہے۔

۱۹۳۵ء میں انڈیا ایکٹ نافذ ہونے پر نئے آئین کے تحت ہندستان میں انتخابات ہونے والے تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے ۱۲/ اپریل ۱۹۳۶ء کے بمبئی اجلاس میں صوبائی اسمبلیوں کے آئندہ انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ محمد علی جناح کو مرکزی اور صوبائی پارلیمانی بورڈ قائم کرنے کا اختیار دیا گیا۔[۲۵] فیصلہ ہوا کہ تمام مسلمان امیدوار مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے اور اسی نام کے تحت انتخاب میں حصہ لینے کے پابند ہوں گے، کیونکہ کُل ہند بنیادوں پر صرف مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی واحد اور نمائندہ تنظیم تھی، مگر افسوس یہ ہے کہ مختلف صوبوں کے مسلم زعما مسلم لیگ کے ممبر ہونے کے باوجود، علاقائی، صوبائی یا کسی مقامی عصبیت یا مصلحت کی بنیاد پر الگ الگ گروہوں میں بٹے ہوئے تھے[۲۶] اور صوبائی خود مختاری کے تصور کے تحت مرکز سے بے نیاز ہو کر انتخاب لڑنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اس صورت میں بقول عاشق حسین بٹالوی: ''مسلم لیگ کا ان تمام صوبائی پارٹیوں کے ساتھ تصادم ناگزیر ہو گیا تھا۔''[۲۷] جناح کے لیے یہ بہت بڑا چیلنج تھا۔

پروفیسر احمد سعید لکھتے ہیں: ''صوبہ پنجاب انگریزوں کا ایک قلعہ تھا اور اس میں اس نے بڑے بڑے جاگیرداروں اور زمینداروں کے ذریعے ایک مضبوط حصار قائم کر رکھا تھا، تا کہ اس کو فوج مہیا ہوتی رہے، اسی لیے آل انڈیا مسلم لیگ کو پنجاب میں اپنے قیام، بقا اور استحکام کے لیے سب سے زیادہ جدوجہد کرنی پڑی۔ پنجاب کے لیڈر سر فضل حسین سے لے کر سر خضر حیات ٹوانہ

تک قائداعظم کو اپنا سب سے بڑا حریف سمجھتے تھے اور کسی بھی صورت آپ کے پنجاب میں داخلے کے مخالف تھے۔" [۲۸] بہر حال جناح نے سب سے پہلے پنجاب کا رُخ کیا۔ لاہور پہنچ کر ۳۰ ر اپریل ۱۹۳۶ء کو وہ یونینسٹ پارٹی کے بانی راہ نما سر فضل حسین سے ملنے ان کے گھر گئے۔

سر فضل حسین نے دس روز پہلے ممدوٹ ولا میں یونینسٹ پارٹی کے دَورِ جدید کا ایک شاندار اور کامیاب افتتاحی اجلاس منعقد کیا تھا۔ [۲۹] یہ اجتماع کیا تھا، زیادہ تر مفاد پرستوں اور انگریز کے ٹوڈیوں کا گٹھ جوڑ تھا۔ عاشق حسین بٹالوی اس ''پُر تکلف اجتماع'' کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اس کی ''ایک خصوصیت یہ تھی کہ نواب صاحب ممدوٹ نے، جہاں چاے کے ساتھ اعلیٰ درجے کی مٹھائی مہمانوں کی خدمت میں پیش کی تھی، وہاں برف میں جمی ہوئی ملائی کی قلفیوں سے بھی ان کے کام و دہن کی تواضع فرمائی تھی، جو اس زمانے میں ایک بالکل نئی بات تھی، چنانچہ اگلے ہی روز لاہور کے اخبار زمیندار نے ان قلفیوں پر ایک پھڑکتی ہوئی نظم شائع کی تھی۔ دوسری خصوصیّت جو مجھے یاد ہے، وہ یہ ہے کہ میاں احمد یار خاں دولتانہ نے، سر فضل حسین کی خدمت میں انگریزی میں لکھا ہوا بڑا طویل ایڈریس پیش کیا تھا، جس میں سر فضل حسین کی بے انتہا تعریف کی گئی تھی اور آخر میں میاں صاحب کے محاسن و مکارم اور کمالات و فضائل پر تبصرہ کیا گیا تھا۔ [۳۰] یہ سب کچھ علامہ اقبال کے سامنے ہوا، وہ ایک روز پہلے بھوپال سے واپس آئے تھے۔ اقبال کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے قدرتی طور پر اسی زمانے کی تخلیقات پر مشتمل ضربِ کلیم (ص ۱۳۸) کی نظم ''خوشامد'' کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے:

مَیں کارِ جہاں سے نہیں آگاہ، ولیکن — اربابِ نظر سے نہیں پوشیدہ کوئی راز
کر تو بھی حکومت کے وزیروں کی خوشامد — دستور نیا اور نئے دَور کا آغاز
معلوم نہیں ہے یہ خوشامد کہ حقیقت — کہہ دے کوئی اُلّو کو اگر رات کا شہباز

بہر حال قدرتی طور پر اس اجتماع نے سر فضل حسین کا دِماغ آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ پنجاب ان کی مٹھی میں ہے۔ ایسے شخص سے گفت و شنید کر کے کامیاب ہونا آسمان میں تھگلی لگانے کے مترادف تھا۔ محمد علی جناح بھی کامیاب نہ ہوئے اور ملاقات بے نتیجہ رہی۔

۴

۶ رمئی کی شام جناح علامہ اقبال سے ملنے جاوید منزل گئے، انھیں مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ کا رُکن بننے کی دعوت دی اور آئندہ انتخابات میں ان سے تعاون کی درخواست بھی

کی۔ اس موقع پر فضل کریم درانی بھی وہاں موجود تھے۔ وہ بتاتے ہیں کہ "جب گفتگو شروع ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے امداد کا پورا وعدہ کیا اور ساتھ مسٹر جناح سے یہ بھی فرمایا کہ اگر آپ اودھ کے تعلقہ داروں یا بمبئی کے کروڑ پتی سیٹھوں کی قسم کے لوگ پنجاب میں تلاش کریں گے تو یہ جنس میرے پاس نہیں۔ مَیں صرف عوام کی مدد کا وعدہ کر سکتا ہوں...... یہ سن کر مسٹر جناح کرسی سے دو انچ اوپر اٹھے اور بڑے جوش سے کہنے لگے کہ مجھے صرف عوام کی مدد درکار ہے۔"[۳۱] محمد علی جناح جانتے تھے کہ علامہ عملی سیاست کے آدمی نہیں اور وہ عملی سیاست میں اس سے پہلے جو تھوڑا بہت حصہ لیتے رہے، اب اس سے بھی دست کش ہو چکے ہیں۔ طویل علالت نے ان کی عملی زندگی تقریباً ختم کر دی تھی، اس کے باوجود انھوں نے قائداعظم کو اپنے پورے تعاون کا یقین دِلایا۔ شاید آج اس کا اندازہ نہ لگایا جا سکے کہ علامہ کی طرف سے "عوام کی مدد کا وعدہ" جناح کے لیے کس قدر تقویت کا باعث ہوا اور ان کے اس اقدام نے آئندہ چل کر مسلم لیگ کے قبولِ عام اور تحریک پاکستان کی کامیابی کو کس قدر آسان بنا دیا۔

دو روز بعد، علامہ اقبال نے پنجاب کے دیگر مسلم زعما کے ساتھ محمد علی جناح اور مسلم لیگ کی حمایت میں "مسلمانانِ پنجاب کے نام اپیل" شائع کی، جس میں کہا گیا: "بطلِ جلیل مسٹر محمد علی جناح ان قابلِ فخر مسلم راہ نماؤں میں سے ہیں، جن کی سیاسی دانش ہمیشہ مسلمانوں کے لیے صبر آزما وقتوں میں مشعل راہ کا کام دیتی رہی ہے۔ انھوں نے مسلمانانِ ہند کی تمام اہم اور نازک موقعوں پر خدمت کی ہے، اس لیے مسلمانوں کی آنے والی نسلوں کے سر عقیدت واحترام سے جھکے رہیں گے۔"[۳۲] اس اپیل میں مسلمانوں کو یونینسٹ پارٹی کے نام نہاد راہ نماؤں سے ہوشیار رہتے ہوئے صرف ایسے کھرے اور قابلِ اعتماد ارکان، اسمبلی میں بھیجنے کی اپیل کی گئی تھی، جو کسی مصلحت کو خاطر میں لائے بغیر اور بلا تامّل مسلم لیگ کے جھنڈے تلے الیکشن لڑنے کے لیے تیار ہوں۔

۱۲رمئی کو مسلم لیگ سے وابستہ زعمائے لاہور میاں عبدالعزیز بیرسٹرایٹ لا کے مکان (واقع: بیرون یکی دروازہ) پر جمع ہوئے۔ علامہ اقبال کی طبیعت ناساز تھی، اس کے باوجود وہ اس اجلاس میں شریک ہوئے اور انھوں نے صوبائی مسلم لیگ کا صدر بننا منظور فرمایا۔ غلام رسول خان بیرسٹر سیکرٹری مقرر ہوئے۔[۳۳]

۲۱رمئی کو محمد علی جناح نے مرکزی پارلیمانی بورڈ کا اعلان کیا۔ پنجاب سے گیارہ آدمی لیے گئے تھے۔ اقبال کا نام سرِ فہرست تھا۔ ۲۸رمئی کو بورڈ کے اجلاس منعقدہ جاوید منزل میں علامہ

اقبال کو مذکورہ صوبائی پارلیمانی بورڈ کا صدر چن لیا گیا، مگر ان کی صحت اچھی نہیں تھی اور وہ عملی طور پر بورڈ کی سرگرمیوں اور اجلاسوں میں شریک نہ ہو سکتے تھے، اس لیے انھوں نے تقریباً اڑھائی ماہ تک یہ ذمہ داری نباہنے کے بعد ۱۳ راگست کو پارلیمانی بورڈ کی صدارت سے استعفا دے دیا، تاہم صوبائی لیگ کے صدر کے طور پر بدستور فرائض انجام دیتے رہے۔ اس عرصے میں انھوں نے صوبے میں مسلم لیگ کو منظم کرنے اور انتخابات کا پروگرام بنانے میں سرگرمی سے حصّہ لیا۔ پارٹی کے بعض اجلاسوں میں وہ بذاتِ خود شریک ہوتے، کارکنوں کو دَورے کرنے اور ہر جگہ مقامی شاخیں قائم کرنے کی تاکید کرتے اور انھیں عوام سے ربط وضبط بڑھانے کی مختلف تدبیریں سجھاتے۔ بقول عاشق حسین بٹالوی: ''اپنی بیماری اور نقاہت کے باوجود سارے کام کی ایک ایک تفصیل بغور ملاحظہ فرماتے تھے۔''[۳۴] یہاں یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ صوبے میں مسلم لیگ کے لیے حالات حد درجہ نامساعد تھے۔ جس کی ایک مثال یہ ہے کہ ۸ جون کو مسلم لیگ کونسل اور پارلیمانی بورڈ کے اجلاس کے لیے اسلامیہ کالج حبیبیہ ہال درکار تھا، علامہ نے انجمن حمایتِ اسلام کے صدر نواب مظفر خان کے پاس اپنا آدمی بھیجا، نواب صاحب یونینسٹوں کے اہم رکن تھے، انھوں نے علامہ کی درخواست رَد کرتے ہوئے مسلم لیگ کو ہال استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی۔[۳۵]

۱۱ راکتوبر کو مسلم لیگ نے بیرون دہلی دروازہ جلسہ منعقد کر کے اپنی انتخابی مہم کا آغاز کیا۔ اس میں جناح نے اپنی زوردار تقریر میں یونینسٹوں، خصوصاً سر سکندر حیات کو ہدفِ تنقید بنایا۔ انتخابی مہم کے دوران میں ایک موقع پر نہرو نے محمد علی جناح پر نارَوا حملے کیے تھے۔ اقبال نے واشگاف الفاظ میں کہا کہ مسٹر جناح آج مسلمانوں کے سب سے بڑے اور سب سے معتمد علیہ لیڈر ہیں۔ انھوں نے اپنے ملک کی جو خدمت کی ہے، وہ کسی اور لیڈر سے کم نہیں، لیکن مسٹر جناح تخیل کی دنیا میں پرواز کرنے کے بجائے حقیقت بینی کو ترجیح دیتے ہیں...... مجھے امید ہے کہ پنڈت نہرو کو جلد اس بات کا احساس ہو جائے گا کہ مسٹر جناح مسلمانوں میں کتنی بلند حیثیت اور ارفع مقام کے مالک ہیں۔[۳۶]

پنجاب میں مسلم لیگ نے ۸۴ نشستوں میں سے سات نشستوں پر اپنے امیدوار کھڑے کیے، جن میں سے صرف دو (ملک برکت علی اور راجا غضنفر علی خاں) کامیاب ہوئے۔ راجا صاحب کامیابی کے فوراً بعد لڑھک کر یونینسٹوں سے جا ملے۔ یوں اگرچہ پنجاب میں مسلم لیگ کو نشستوں کے اعتبار سے زیادہ کامیابی نہ ہوئی تھی، لیکن مسلم لیگ وسیع پیمانے پر متعارف ہوگئی اور اس کا سب سے بڑا سبب علامہ اقبال کا نام تھا۔ انتخابی مہم میں اقبال کے نام کو کلید کی حیثیت حاصل تھی۔ عاشق

حسین بٹالوی اس دور کے الیکشن میں اپنے تجربات کے ضمن میں لکھتے ہیں: ''سب سے بڑی دِقت یہ تھی کہ لوگ مسلم لیگ کے نام اور کام سے قطعاً نا آشنا تھے۔ جناح کا نام بھی اکثر لوگوں نے نہیں سنا تھا، البتہ اقبال کا نام ایک ایسا کھرا سکہ تھا، جسے ہم بے دریغ چلاتے تھے۔ مَیں نے انھی دِنوں محسوس کیا کہ اقبال صرف پڑھے لکھے لوگوں ہی میں نہیں، بلکہ عوام میں بھی کتنا مقبول تھا۔''[۳۷]

انتخابات میں کانگرس کو چھے صوبوں میں غیر معمولی کامیابی ہوئی تھی، لیکن مسلمانوں کی ۵۵۰ نشستوں میں سے کانگرس صرف ۲۵ نشستوں پر قبضہ کر سکی تھی۔ اب جواہر لعل نہرو نے مسلمان راہ نماؤں اور مسلم لیگ کو نظر انداز کر کے ''براہِ راست عوام سے ربط ضبط'' پیدا کرنے کی بات کی اور مسلم رابطۂ عوام (Muslim Mass Contact) کے نام پر مسلم عوام کو براہِ راست کانگرس میں شمولیت کی دعوت بھی دے ڈالی۔ ۱۹ / مارچ ۱۹۳۷ء کو دہلی کے آل انڈیا نیشنل کنونشن میں نہرو کی تقریر سے یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے وہ ساتویں آسمان سے بول رہے ہوں۔ انھوں نے مسلمانوں سے مفاہمت یا سمجھوتے کے تصور کو ٹھکراتے ہوئے اسے ایک ''وہم'' قرار دیا۔ اسی تسلسل میں نہرو نے محمد علی جناح پر الزام لگایا کہ وہ ایک فرقہ پرست لیڈر ہے، جو مسلمانوں کو گمراہ کر رہا ہے۔ عاشق حسین بٹالوی لکھتے ہیں: ''مسلمانوں پر یہ بڑا نازک وقت تھا۔ اقلیت کے صوبوں میں کانگرس کی عظیم الشان کامیابی نے وہاں کے مسلمانوں کو ایک عجیب مخمصے میں ڈال دیا تھا۔''[۳۸]

اس نازک موقع پر علامہ اقبال نے جناح کو متعدد خط لکھے۔ ۲۰ / مارچ ۱۹۳۷ء کے خط میں انھوں نے نہرو کے آل انڈیا نیشنل کنونشن کے جواب میں آل انڈیا مسلم کنونشن منعقد کرنے کی تجویز پیش کی۔ ۲۲ / اپریل کے خط میں ایک مرتبہ پھر انھوں نے اپنی تجویز کو دہراتے ہوئے اس پر زور دیا۔ ۱۰ / مئی کے خط میں علامہ نے جناح کو شمالی ہند کا دَورہ کرنے کی دعوت دی، تاکہ عوام الناس کو مسلم لیگ کے قریب لایا جا سکے۔ غرض علامہ اقبال؛ پنجاب میں مسلم لیگ کے اثرات پھیلانے اور اسے مقبولِ عام بنانے کے لیے مسلسل اپنی سی کوشش کرتے رہے۔

۵

ادھر پنجاب کے وزیرِاعلیٰ سر سکندر حیات نے محسوس کیا کہ مستقبل میں مسلم لیگ کی حمایت کے بغیر ان کی وزارت قائم رہنا مشکل ہوگا، چنانچہ وہ لکھنؤ جا پہنچے اور ۱۵ / اکتوبر ۱۹۳۷ء کے اجلاس میں جناح کو اپنا لیڈر تسلیم کرتے ہوئے مسلم لیگ میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ پھر جناح سے گفت و شنید کے بعد انھیں ایک تحریر لکھ دی، جسے ''جناح سکندر پیکٹ'' کا نام دیا گیا۔ اس میں انھوں نے یہ

وعدہ کیا کہ یونینسٹ پارٹی کے تمام مسلم ارکان مسلم لیگ کے ممبر بن جائیں گے۔

چندروز بعد علامہ اقبال نے سرسکندر حیات کو مسلم لیگ کی رکنیت کے فارم بھیجے، مگر جواب نہ پاکر انھوں نے جناح کو ۱۰ ر نومبر ۱۹۳۷ء کے خط میں لکھا: ''سکندر حیات اور ان کے احباب نے ابھی تک مسلم لیگ کے منشور پر دستخط نہیں کیے۔ اس معاہدے [جناح سکندر پیکٹ] سے لیگ کے وقار کو پہلے ہی صدمہ پہنچا ہے۔ سرسکندر اور ان کے احباب سے متعدد ملاقاتوں کے بعد مَیں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ مسلم لیگ اور صوبائی پارلیمانی بورڈ پر مکمل قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ مَیں مسلم لیگ کو سرسکندر کے حوالے کرنے کی ذمہ داری نہیں لے سکتا۔'' غالباً محمد علی جناح بھی پنجاب کے نتائجِ انتخاب (صرف ۲ نشستوں) کی وجہ سے دباؤ میں تھے یا پھر مصلحتوں کا شکار تھے، ورنہ سکندر حیات سے کوئی معاہدہ کرتے ہوئے علامہ اقبال کو ضرور اعتماد میں لینا چاہیے تھا، کیونکہ وہ مسلم لیگ پنجاب کے سب سے اہم راہ نما تھے۔ ۱۰ ر نومبر کے مذکورہ بالا خط میں جناح سکندر پیکٹ پر اقبال کا تاسف اور شکوہ محسوس کیا جا سکتا تھا۔ اس سے دو روز پہلے ۸ ر نومبر کے خط میں بھی اقبال نے واضح کیا تھا کہ جناح سکندر پیکٹ سے، پنجاب میں مسلم لیگ کی حیثیت، یونینسٹ پارٹی کے ماتحت (subordinate) ادارے کی سی رہ جائے گی۔[۳۹] اس کے باوجود وہ کوشش کرتے رہے کہ پنجاب میں مسلم لیگ کو یونینسٹ پارٹی کے پھندے سے نجات دلا کر ایک آزاد اور خود مختار جماعت بنادیا جائے۔[۴۰] اس ضمن میں انھوں نے جناح کو متعدد خطوط لکھے۔

فروری ۱۹۳۸ء کے آخر میں علامہ نے ایک نہایت تفصیلی بیان تیار کیا، جس کا مقصد یہ تھا کہ سکندر جناح پیکٹ کو ختم کر دیا جائے۔ یہ بیان، جاری کرنے سے پہلے انھوں نے ملک برکت علی کی تجویز پر منظوری کے لیے جناح کو بھیجا، مگر انھوں نے بعض مصالح کی بنا پر اس کی اشاعت کی منظوری نہ دی۔[۴۱] دراصل اقبال، سرسکندر کے خلاف فوری کارروائی کے خواہش مند تھے،[۴۲] لیکن بقول پروفیسر محمد سلیم: ''قائداعظم بجا طور پر سمجھتے تھے کہ اس وقت سرسکندر حیات، مولوی فضل الحق اور سرسعداللہ کی شرکت ہی سے مسلم لیگ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت بن سکتی ہے۔ ان حالات میں سرسکندر کے خلاف فوری ایکشن مسلمانوں کے مفاد میں نہ تھا۔ مسلمانوں کو ایک جماعت کے پرچم تلے متحد رکھنا اس دَور کی سب سے اہم ضرورت تھی۔''[۴۳] بعض مجبوریوں کی وجہ سے محمد علی جناح، علامہ اقبال کی تجاویز پر پوری طرح عمل پیرا نہ ہو سکے، اس کے باوجود وہ اقبال کے اخلاص اور مسلم لیگ کے لیے ان کی بھرپور تائید کے دل سے قائل تھے۔ مارچ ۱۹۴۰ء میں پنجاب یونی

ورسٹی ہال، لاہور میں منعقدہ یومِ اقبال کے جلسے میں اقبال کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے انھوں نے اعتراف کیا کہ ''اپریل ۱۹۳۶ء کی ملاقات میں جب مَیں نے اپنے خیالات ان کے سامنے پیش کیے تو انھوں نے فوراً لبیک کہی اور اس وقت سے تا دمِ مرگ، اقبال میرے ساتھ مضبوط چٹان کی طرح کھڑے رہے۔''[۴۴]

مسلم لیگ، حصولِ پاکستان اور بحیثیت مجموعی ہندی مسلمانوں کے لیے علامہ اقبال کی خیر خواہی، دردمندی اور خدمت و کاوش کے سلسلے میں یہ بات بھی بہت اہمیت رکھتی ہے کہ انھوں نے محمد علی جناح کو قائداعظم بنانے اور ہندی مسلمانوں کا واحد قابلِ اعتماد اور غیر متنازعہ لیڈر تسلیم کرانے میں بنیادی کردار ادا کیا، خصوصاً آخری زمانے میں انھوں نے ہر موقع پر اور ہمیشہ جناح کی غیر مشروط حمایت اور تائید کی۔

۱۹۳۶ء کے آخری دِنوں میں ایک روز علامہ اقبال کی محفل احباب میں محمد علی جناح کی امانت و دیانت اور قابلیت کا ذکر ہو رہا تھا۔ علامہ نے فرمایا: ''مسٹر جناح کو اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی خوبی عطا کی ہے، جو آج تک ہندستان کے کسی مسلمان میں مجھے نظر نہیں آئی۔ حاضرین میں سے کسی نے پوچھا کہ وہ خوبی کیا ہے؟ آپؒ نے انگریزی میں فرمایا: He is incorruptible and unpurchasable[۴۵] ۲۱ر جون ۱۹۳۷ء کے خط میں علامہ نے جناح کو لکھا: جو طوفان شمال مغربی ہند، بلکہ پورے ہندستان کو اپنی لپیٹ میں لینے والا ہے، پورے ہندستان میں آپ واحد مسلمان ہیں، جن سے ہند کی ملتِ اسلامیہ محفوظ راہ نمائی کی توقع رکھ سکتی ہے۔

سید نذیر نیازی اپنے ۲۱ر مارچ ۱۹۳۸ء کے روزنامچے میں لکھتے ہیں کہ آج اثنائے گفتگو، علامہ نے فرمایا: ''ہمارے مسائل کا حل صرف ایک ہے: یونینسٹ پارٹی توڑ دی جائے، لیگ جو متحدہ محاذ قائم کر رہی ہے، سب اس میں شامل ہو جائیں، سب اس کو تقویت پہنچائیں...... ہمیں جناح سے بہتر کوئی آدمی نہیں مِل سکتا۔ جناح ہی ہماری قیادت کے اہل ہیں۔''[۴۶]

۶

زندگی کے آخری برسوں میں اقبال عملی طور پر سیاسی سرگرمیوں میں شریک نہیں رہے۔ ایک تو انھوں نے سیاست میں اپنی دلچسپی کی حدود خود متعین کر لی تھیں۔[۴۷] دوسرے: بیماری نے انھیں سیاست میں سرگرم رہنے سے روک دیا تھا۔ اسی زمانے کا شعر ہے:

غواص تو فطرت نے بنایا ہے مجھے بھی
لیکن مجھے اعماقِ سیاست سے ہے پرہیز [۴۸]

لیکن ان کی تحریریں، تقریریں، بیانات، گفتگوئیں اور خطوط اس امر کے شاہد ہیں کہ وہ اپنی خداداد سیاسی بصیرت کی بنا پر بسترِ علالت ہی سے مسلمانانِ ہند کی بہترین راہ نمائی کرتے رہے۔ مکاتیب اقبال بنام جناح اس کا واضح ثبوت ہے۔

چوتھے عشرے کی ہندی سیاست، مسلمانانِ ہند کے حقیقی مسائل، مستقبل کے نقشۂ کار، شمال مغربی ہند میں ایک آزاد اسلامی ریاست، قراردادِ پاکستان اور تحریک پاکستان کے مقاصد کے سلسلے میں، یہ مکاتیب ایک لحاظ سے بنیادی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان خطوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبال ہندی مسلمانوں، خصوصاً عوام الناس کے مزاج اور ان کی نفسیات کو بخوبی سمجھتے اور ان کی نبض پہچانتے تھے۔ اسی طرح وہ سیاسیاتِ پنجاب کے مہروں سے بھی بخوبی واقف تھے۔ زیرِ بحث مکاتیب، اقبال کے ولولوں، آرزوؤں اور مضطرب جذبوں کے آئینہ دار ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی تمام تر امیدیں جناح سے وابستہ کر لی تھیں اور ان خطوط کے ذریعے انھوں نے اپنی دانست میں محمد علی جناح کی بہترین راہ نمائی کی کوشش کی۔ ان مکاتیب کے اہم نکات حسب ذیل ہیں:

۱۔ مسلمانانِ ہند ایک نہایت نازک صورتِ حال سے دوچار ہیں۔ ان کے لیے "ثقافتی مسئلہ" زیادہ اہم ہے اور ان کی بقا کا انحصار "جداگانہ سیاسی وجود" پر ہے۔ یہ امر ہندی مسلمانوں کی مکمل تنظیم کے بغیر ممکن نہیں۔

۲۔ مسلم لیگ کے لیے اب یہ فیصلہ کرنا ناگزیر ہو گیا ہے کہ وہ حسب سابق صرف مسلمانوں کے بالائی طبقوں تک ہی محدود رہے گی یا جمہور مسلمانوں کی ترجمانی بھی کر سکے گی۔ بالائی طبقوں کی جماعت ہونے کی وجہ سے عوام مسلم لیگ میں بہت کم کشش محسوس کرتے تھے۔

۳۔ روٹی کا مسئلہ روز بروز نازک صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ یہ بھی مسلم لیگ کے لیے ایک آزمائش ہے کہ وہ اس مسئلے کو کیسے حل کرے گی۔

۴۔ غربت کا خاتمہ مقصود ہو یا روٹی کا مسئلہ حل کرنا ہو، شریعتِ اسلامی کے نفاذ کے بغیر یہ ممکن نہیں۔ (جواہر لعل نہرو کی لادینی اشتراکیت اس مسئلے کو حل کرنے سے قاصر ہے۔)

۵۔ مگر شریعتِ اسلامی کا نفاذ ایک آزاد مسلم ریاست یا ریاستوں کے بغیر ممکن نہیں ہے اور اگر

ایسا نہ ہوا تو ہندو مسلم فسادات کی شکل میں خانہ جنگی کا شدید اندیشہ ہے۔

علامہ اقبال نے خطبۂ الٰہ آباد میں تو ہندستان کے شمال مغربی خطے میں مسلم مرکزیت کا ایک تصور پیش کیا تھا۔ ان کے زیرِ نظر خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ چھے سات برس تک کے سیاسی اتار چڑھاؤ اور صورتِ حال میں تبدیلیوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد وہ رفتہ رفتہ اس نتیجے پر پہنچے کہ شمال مغربی مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل ایک آزاد اسلامی ریاست ہی ہندستانی مسلمانوں کی جدوجہد کا منتہا ہے مقصود ہونی چاہیے۔

علامہ اقبال کی سیاسی جدوجہد کے اس تذکرے میں ان کا ربع صدی پرانا ایک شذرہ برمحل معلوم ہوتا ہے۔ ۱۹۱۰ء میں انھوں نے *Stray Reflections* (ص ۱۱۲) میں لکھا تھا:

Nations are born in the hearts of poets; they prosper and die in the hands of politicians. (قومیں شعرا کے دلوں میں جنم لیتی ہیں، سیاست دانوں کے ہاتھوں میں نشو و نما پاتی اور پھر انھی کے ہاتھوں مر جاتی ہے۔)

حوالے اور حواشی

۱۔ اقبال نامہ، ص ۱۷۲۔ میاں عبدالعزیز مالواڈہ کہتے ہیں کہ جب اقبال نے رُکنیت کے تین سال مکمل کر لیے تو "میں نے ڈاکٹر صاحب کو کہا کہ اس دفعہ بھی کھڑا ہونا ہے کہ نہیں؟ اس دفعہ بھی آپ کامیاب ہو جائیں گے۔ کہنے لگے: 'میں تو تنگ آ گیا ہوں، کوئی سنتا ہی نہیں، نہ کوئی مانتا ہے۔ ہماری اکثریت نہیں۔ میرا ارادہ بالکل چھوڑنے کا ہے۔ تم کھڑے ہو جاؤ۔'" (نقوش، اقبال نمبر دوم، دسمبر ۱۹۷۷ء، ص ۲۶۳)

۲۔ بالِ جبریل، ص ۱۲۴-۱۲۵

۳۔ مکتوبات بنام نیازی، ص ۲۵۳-۲۵۶

۴۔ اقبال اور دارالاقبال بھوپال، ص ۴۲

۵۔ مکتوبات بنام نیازی، ص ۲۵۶

۶۔ اقبال اور بھوپال، ص ۱۱۹

۷۔ ایضاً، ص ۹۵

۸۔ خواجہ غلام السیدین: آندھی میں چراغ، ص ۱۴۴، بحوالہ اقبال اور بھوپال، ص ۱۰۲

۹۔ اقبال اور بھوپال، ص ۱۱۱

۱۰۔ *Iqbal: As I Knew Him*، ص ۱۶

۱۱۔ مکتوبات بنام نیازی، ص۲۷۴

۱۲۔ زندہ رُود، ص۶۱۳-۶۱۴

۱۳۔ اقبال نامہ، ص۱۸۴-۱۸۷۔ صہبا لکھنوی کا یہ بیان درست نہیں کہ ''اسی قیام کے دوران میں انھوں نے فتنۂ قادیانی پر اپنے مشہور مضامین لکھے''۔ (اقبال اور بھوپال، ص۱۵۴) آخری انگریزی مضمون (اسلام اینڈ احمدازم) کے علاوہ قادیانیت پر سب مضامین وہ دوسری بار بھوپال جانے سے پہلے مئی، جون میں لکھ چکے تھے اور متذکرہ بالا آخری مضمون (مشمولہ *Speeches*، ص۲۱۴-۲۴۰) دسمبر ۱۹۳۵ء میں لاہور میں لکھا گیا۔

۱۴۔ اقبال اور بھوپال، ص۱۵۴۔

۱۵۔ اقبال نامہ، ص۱۸۸

۱۶۔ اقبال اور بھوپال، ص۱۵۲

۱۷۔ مکتوبات بنام نیازی، ص۲۸۰

۱۸۔ اقبال نامہ، ص۲۰۴

۱۹۔ مکتوبات بنام نیازی، ص۲۸۳

۲۰۔ زندہ رُود، ص۶۱۴

۲۱۔ مکتوبات بنام نیازی، ص۲۸۳

۲۲۔ ایضاً، ص۳۲۹۔ اقبال کے خلوص کے اس اعتراف کے باوجود جناح نے کئی مواقع پر اقبال کی تجاویز کو نظر انداز کیا۔ قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں؟ ہمارے خیال میں جناح کی مجبوریاں یہ تھیں کہ ان کے یمین و یسار میں بیشتر لوگ ''کھوٹے سکے'' تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ مجھے انھی سے کام چلانا ہے۔ میاں عبدالعزیز مالواڈہ بتاتے ہیں کہ قیامِ پاکستان کے بعد، ایک ملاقات پر مَیں نے گزارش کی کہ آپ بہت کمزور ہو گئے ہیں، اپنی صحت کی فکر کیا کریں اور جو آدمی حکومت میں لیں، وہ بڑے بااعتبار، ایمان دار اور لائق آدمی ہونے چاہییں۔'' قائداعظم نے فرمایا: ''مَیں کیا کروں، سارا کام مجھے خود کرنا پڑتا ہے۔ میری جیب میں جو کھوٹے سکے (spurious coins) ہیں، مَیں ان سے کیسے کام لوں؟ (نقوش، اقبال نمبر دوم، دسمبر ۱۹۷۷ء، ص۶۲۶)

۲۳۔ اقبال نامہ، ص۳۰۴-۳۰۵

۲۴۔ اقبال نامے، ص۲۰۴-۲۰۵

۲۵۔ اقبال اور تحریکِ پاکستان، ص۲۷

۲۶۔ زندہ رُود، ص۶۲۱

۲۷۔ اقبال اور تحریکِ پاکستان، ص۱۲

۲۸۔ اقبال اور قائد اعظم، ص۶۳

۲۹۔ اقبال اور تحریکِ پاکستان، ص۱۴-۱۵

۳۰۔ ایضاً، ص۱۴

۳۱۔ ایضاً، ص۳۱-۳۲

۳۲۔ گفتارِ اقبال، ص۲۰۳-۲۰۴
۳۳۔ اقبال اور تحریکِ پاکستان، ص۳۵، زندہ رُود، ص۶۲۳
۳۴۔ اقبال کے آخری دو سال، ۳۱۹
۳۵۔ ایضاً، ص۳۲۰
۳۶۔ بحوالہ علامہ اقبال کی سیاسی زندگی، ص۱۴۲
۳۷۔ اقبال کے آخری دو سال، ص۳۶۴
۳۸۔ اقبال اور تحریکِ پاکستان، ص۵۰
۳۹۔ ایضاً، ص۵۷
۴۰۔ ایضاً، ص۶۱
۴۱۔ ایضاً، ص۶۱-۶۴
۴۲۔ تاریخ کی ستم ظریفی دیکھیے کہ فروری ۱۹۳۸ء میں اقبال، جناح سکندر پیکٹ کی تنسیخ اور سکندر حیات کے خلاف فوری کارروائی کے خواہش مند تھے، مگر قائداعظم نے اسے بوجوہ مناسب خیال نہیں کیا، لیکن سات برس تک یونینسٹوں کے رویّے کا مشاہدہ کرنے کے بعد بالآخر جناح بھی اسی نتیجے پر پہنچے اور ۱۹۴۴ء میں انھوں نے جناح سکندر پیکٹ کو بے حیثیت قرار دے کر خضر حیات ٹوانہ کو مسلم لیگ سے خارج کر دیا۔ دیکھیے سر گذشت، ص۴۹۴-۴۹۵۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ علامہ کی سیاسی بصیرت قابلِ داد تھی۔
۴۳۔ علامہ اقبال کی سیاسی زندگی، ص۱۴۷
۴۴۔ اقبال اور قائد اعظم، ص۹۲
۴۵۔ آثارِ اقبال، ص۴۱
۴۶۔ اقبال کے حضور، ص۳۹۴
۴۷۔ Disclaimer، ص۸۰
۴۸۔ ضربِ کلیم، ص۱۴۸

❖......❖......❖

(۲۲)

بنتے ہیں مری کارگہِ فکر میں انجم

ا

علامہ اقبال فقط ایک شاعر ہی نہ تھے، علمی اور فقہی مسائل و مباحث سے بھی گہری دل چسپی رکھتے تھے۔ وہ ایک ایسے عالم اور سکالر تھے، جس کی دل چسپیاں کسی ایک شعبۂ علم تک محدود نہیں ہوتیں۔ اُن کے علمی ذوق کا آغاز تو سید میر حسن کے تلمذ و صحبت میں ہوا، لیکن اس مذاق کو پختہ تر کرنے اور اقبال کو تحقیق و تجسس کی چاٹ لگانے میں پروفیسر آرنلڈ کا کردار بہت اہم ہے۔ میکلوڈ عربک ریڈر کے طور پر ان کی علمی تحقیق نے بھی انھیں فائدہ پہنچایا۔ یورپ کے زمانۂ قیام (۱۹۰۵ء-۱۹۰۸ء) میں ایک طرف تو کیمبرج اور میونخ کے اساتذہ سے اقبال نے علمی جستجو کے طریقے سیکھے، دوسری جانب کیمبرج کی مجموعی علمی فضا، پروفیسر آرنلڈ کی صحبت اور سید علی بلگرامی کی مجالس نے بھی ان کے ذوق کو جلا بخشی۔ علمی تحقیق و جستجو کا یہ ذوق ان کی فطرتِ ثانیہ کا حصہ بن گیا۔ ترکِ موالات کا مسئلہ ہو؛ دارالحرب کی بحث ہو؛ زمان و مکان یا مہدیِ موعود کا موضوع ہو یا اجتہاد اور اس سے متعلقہ فقہی مباحث، فلسفی شاعر ہمیں ہمیشہ ''گرم دمِ جستجو'' نظر آتا ہے۔ ان کے خطوط میں مختلف علوم کی بلند پایہ کتابوں کا بکثرت ذکر ملتا ہے، جو ان کے زیر مطالعہ ہوتیں، یا جن کی انھیں تلاش ہوتی یا احباب سے بعض عبارات کی صحت و استناد کے بارے میں استفسار کرتے۔ خواجہ عبدالوحید کہتے ہیں: ''مَیں کسی مذہبی، علمی یا ادبی مسئلے سے متعلق کوئی سوال کرتا، وہ فی الفور جواب دینا شروع کر دیتے۔ ان کی وسعتِ معلومات کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات مجھے یوں محسوس ہوتا، جیسے انھیں پہلے سے میرے سوال کا علم تھا اور وہ اس کا جواب دینے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ وہ جب گفتگو کرتے تو میرے سامنے علوم و فنون کے بے شمار رازوں سے پردے اٹھنے لگتے۔''[۱]

انگریزی خطبات میں اقبال نے لکھا تھا کہ علمی مباحث میں حرفِ آخر کوئی چیز نہیں ہوتی۔ غالباً اسی سبب سے وہ اپنے خطبات پر نظر ثانی کرنا چاہتے تھے۔ اسی طرح وہ اسلامی فقہ کی تدوینِ

نو کے بھی شدید متمنی تھے اور ان کا خیال تھا کہ جو شخص یہ کارنامہ انجام دے گا، وہ عصرِ حاضر کا مجدد کہلائے گا۔[۲] علامہ اقبال خود ایک مفکر و فلسفی اور سکالر تھے اور بجا طور پر انھیں بعض علمی موضوعات پر کچھ لکھنے اور کام کرنے کا خیال آتا رہا۔ خطبات سے قطع نظر، علامہ کی علمی تحقیق و جستجو کا ذکر ان کے تذکروں میں بہت کم ملتا ہے اور ان کی شخصیت کا یہ پہلو بالعموم نظروں سے اوجھل رہا ہے۔

۲

ذیل میں ان کے بعض علمی منصوبوں کا ذکر کیا جاتا ہے:

ا۔ قرآنِ حکیم کے مطالعے اور اس پر برسوں کے فکر و تدبر کے نتائج کو وہ مقدمۃ القرآن کے نام سے مرتب کرنا چاہتے تھے۔ ۱۹۲۳ء میں انھوں نے عزم کر لیا تھا کہ: ''تفسیر قرآن از بس ضروری ہے''۔[۳] اس عزم کا پس منظر ان کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے، لکھتے ہیں: ''حق بات یہ ہے کہ جب ہم وید [وید کے بعد ایک لفظ پڑھا نہیں جا سکا۔ مرتب]......انجیل وغیرہ کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد قرآن کا مطالعہ کریں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا خیالات کی ایک نئی فضا میں داخل ہو گئے ہیں۔ افسوس کہ مسلمانوں کو قرآن کی جدت کا کبھی احساس نہ ہوا، بلکہ انھوں نے اس جدید کتاب کے مطالب و حقائق کو قدیم اقوام کے خیالات کی روشنی میں تفسیر کر کے اس کے اصل مطلب و مفہوم کو مسخ کر دیا۔''[۴] مگر عملاً اس موضوع پر قلم اٹھانے میں ان کی کسرِ نفسی مانع رہی۔ ایک طرف اس اہم کام کا علمی تقاضا، دوسری جانب کسرِ نفسی اور اپنی 'کم علمی'، نتیجہ یہ کہ ایک مدت تک وہ ذہنی کشمکش کا شکار رہے اور کچھ نہ لکھ سکے۔ موعودہ تفسیر کے لیے انھوں نے مختلف اوقات میں تین مختلف نام تجویز کیے تھے:

1. An Introduction to the Study of Quran.
2. Aids to the Study of Quran.
3. An Interpretation of Holy Quran in the Light of Modern Philosophy.[۵]

وقت کے ساتھ ساتھ مقدمۃ القرآن لکھنے کی آرزو بڑھتی گئی۔ اس کا اندازہ بعض مکاتیب، بنام ڈاکٹر تاثیر، بنام سر راس مسعود اور بنام نذیر نیازی اور بعض گفتگوؤں (مثلاً عبدالرشید طارق سے) بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔[۶]

وہ اس علمی منصوبے کی تکمیل کے لیے بے چین اور مضطرب تھے۔ ایک بار عبدالرشید طارق سے فرمانے لگے: ''ایک بار کتاب شروع کی تو ان شاء اللہ اسلام کے بارے میں یورپ کی تمام

theories (نظریات) کو توڑ پھوڑ کے رکھ دوں گا۔ ارادہ ہے، قانون کی تمام کتب بیچ کر فقہ، حدیث اور تفاسیر خریدوں گا۔[۷] مگر ۱۹۳۴ء میں جب طویل علالت کا آغاز ہوا اور ان کی صحت رفتہ رفتہ خراب ہوتی گئی تو انھیں احساس ہوا کہ تمام تر عزم و ارادے کے باوجود، شاید وہ یہ کام انجام نہ دے سکیں گے۔ سر راس مسعود کو ۱۳ رمئی ۱۹۳۵ کو لکھتے ہیں:

''چراغِ سحر ہوں، بجھا چاہتا ہوں؛ تمنا ہے کہ مرنے سے پہلے قرآنِ کریم سے متعلق اپنے افکار قلم بند کر جاؤں۔ جو تھوڑی سی ہمت و طاقت ابھی مجھ میں باقی ہے، اسے اسی خدمت کے لیے وقف کر دینا چاہتا ہوں، تا کہ (قیامت کے دن) آپ کے جدِ امجد (حضورِ نبی کریمؐ) کی زیارت مجھے اس اطمینانِ خاطر کے ساتھ میسر ہو کہ اس عظیم الشان دین کی، جو حضورؐ نے ہم تک پہنچایا، کوئی خدمت بجالا سکا۔''[۸]

اپنے بارے میں اقبال کا یہ خدشہ درست ثابت ہوا۔ حیاتِ مستعار کا وقفہ ختم ہوا اور موعودہ تصنیف کا خیال عملی شکل اختیار نہ کر سکا۔ سید نذیر نیازی لکھتے ہیں: ''اس سلسلے میں ان کی ایک دو تحریریں ضرور دستیاب ہوئیں، [مگر] حضرتِ علامہ نے ان تحریروں میں...... صرف چند الفاظ مستفسرانہ انداز میں لکھے ہیں''۔[۹]

نہیں کہا جا سکتا کہ موعودہ کتاب میں اقبال کیا طریقِ تفسیر اختیار کرتے، لیکن اس سلسلے کی بعض تحریروں اور گفتگوؤں سے واضح ہوتا ہے کہ مقدمۃ القرآن لکھنے سے اقبال کی بنیادی غایت خدمتِ دین تھی اور اپنی اس موعودہ کتاب میں وہ اُمتِ مسلمہ کو قرآنی رموز و نکات سے آگاہ کرنا چاہتے تھے، تا کہ مسلمانانِ عالم اس کی روشنی میں اپنے سیاسی اور معاشی مسائل حل کر سکیں۔ وہ یہ بھی ارادہ رکھتے تھے کہ اسلام اور قرآن پر یورپ کے متعصبانہ اور بے بنیاد اعتراضات کا مدلل جواب دیا جائے۔ اگر اقبال مقدمۃ القرآن لکھنے میں کامیاب ہو جاتے تو بلا شبہہ عصرِ حاضر میں یہ ان کا ایک بڑا علمی کارنامہ ہوتا۔

۲۔ دوسرا بڑا منصوبہ اسلامی فقہ کی جدید تدوین کا تھا۔ اسے علامہ ''اسلام کی سب سے بڑی خدمت'' سمجھتے تھے۔ صوفی تبسم کے نام ۲ ستمبر ۱۹۲۵ء کے خط میں لکھتے ہیں: ''میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے جیورس پروڈنس پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا، وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا''۔[۱۰] لیکن اس کے ساتھ ہی وہ فقہ اسلامی کی مفصل تاریخ کی ''سخت

ضرورت'' پر بھی زور دیتے تھے۔[۱۱] بلکہ ابتدائی زمانے میں انھوں نے فقۂ اسلام پر ایک مفصل کتاب بزبانِ انگریزی لکھنا شروع کر دی تھی، جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ یہ ''اپنے فن میں ایک بے نظیر کتاب''[۱۲] ہوگی۔ یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا انجام کیا ہوا، تاہم بعد میں علامہ نے An Introduction to the Study of Islam کے نام سے ایک کتاب کا خاکہ تیار کیا تھا[۱۳] لیکن یہ تصنیفی منصوبہ بھی عملی صورت اختیار نہ کر سکا۔

فقۂ اسلام کی تاریخ و تدوین کے سلسلے میں انھوں نے مولانا شبلی، سید سلیمان ندوی اور سید انور شاہ کاشمیری کو لاہور بلانا چاہا، مگر کامیابی نہ ہوئی۔[۱۴] آخری زمانے میں انھیں امید تھی کہ چودھری نیاز علی خاں کا ادارۂ دارالاسلام، فقہ کی تدوینِ نو کا کام دے سکے گا، مگر ایسا نہ ہو سکا۔ (اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔)

۳۔ اسرارِ خودی کی اشاعت (۱۹۱۵ء) پر اقبال کے خلاف ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ بعض غلط فہمیوں کے ازالے کے لیے انھوں نے تصوف کی تاریخ پر ایک مبسوط مضمون لکھنا شروع کیا، جو بعد میں پھیل کر ایک کتاب کی شکل اختیار کر گیا۔ محمد اسلم جیراج پوری کو لکھتے ہیں: ''مَیں نے ایک تاریخ تصوف کی لکھنی شروع کی تھی، مگر...... ایک دو باب لکھ کر رہ گیا۔''[۱۵] یہ علمی منصوبہ بھی ناتمام رہا۔[۱۶]

۴۔ اقبال کے موعودہ علمی منصوبوں اور تصنیفات و تالیفات میں بہت سی چیزیں شامل ہیں، مثلاً قلب و دماغ کی سرگذشت، ایک فراموش شدہ پیغمبر کی کتاب، فصوص الحکم پر تنقید، تاریخِ ادبِ اردو، کچھ دیگر متفرق چیزیں اور بعض تراجم شامل تھے۔

اقبال کے ان منصوبوں کا اہم ترین محرک مِلّی انحطاط کا وہ شدید احساس تھا، جس نے اقبال کو ساری عمر مضطرب رکھا۔ تصانیفِ موعودہ کے ذریعے وہ قارئین میں دین کا فہم پیدا کر کے تجدید و احیاے اسلام کی راہ ہموار کرنا چاہتے تھے۔ اپنے تصنیفی منصوبوں کا مقصد ان کے لیے ان کے اپنے بقول یہ تھا کہ: ''مَیں اپنے ملک کے تعلیم یافتہ لوگوں پر دین کے اثرات منکشف کر جاؤں، تا کہ وہ دین کے قریب آجائیں''۔[۱۷]

۳

متذکرہ بالا عزائم اور ارادوں کے باوجود علامہ کو بجا طور پر احساس تھا کہ بسا اوقات علمی منصوبے فردِ واحد کے بجاے اجتماعی کاوشوں اور تحقیقی اداروں کے ذریعے ہی بروے کار آسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں علامہ یورپ کے علمی اداروں اور دانش گاہوں کا براہِ راست مشاہدہ کر چکے تھے۔

خواجہ عبدالوحید نے بعض دوسرے دوستوں سے مل کر ۱۹۲۸ء میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمان نوجوانوں کو اسلامی تمدن و تاریخ کے مطالعے کی طرف راغب کیا جائے۔ وہ بتاتے ہیں کہ علامہ اقبال اس ادارے کی سرگرمیوں میں دل چسپی لیتے تھے اور بعض کاموں میں وہ عملی تعاون بھی کرتے تھے۔[۱۸]

اسی ضمن میں خواجہ عبدالوحید مزید بتاتے ہیں کہ ۱۹۳۱ء میں علامہ کی تجویز پر اور انھی کی رہنمائی میں علومِ اسلامیہ کی ترویج و تحقیق کے لیے لاہور میں ادارہ معارفِ اسلامیہ قائم کیا گیا۔ اس ادارے سے علامہ کا کوئی تنظیمی تعلق تو نہ تھا، لیکن وہی اس کے روحِ رواں تھے اور تمام کام انھی کے مشوروں سے انجام پاتے تھے۔ اقبال کو اس ادارے سے بڑی امیدیں تھیں اور وہ اسے ایک معیاری تحقیقی ادارہ بنانے کے خواہش مند تھے۔ انھوں نے اپنے اثر و رسوخ سے ریاست حیدرآباد دکن سے اس ادارے کے لیے تین سال کے لیے دو ہزار روپے سالانہ مالی امداد بھی منظور کرائی تھی۔ اوّلین اجلاس (۱۵-۱۶/ اپریل ۱۹۳۳ء) علامہ اقبال کی صدارت میں منعقد ہوا۔[۱۹]

علمی منصوبوں کی تکمیل کے لیے کوئی ایک ادارہ کافی نہیں ہوتا۔ خاطر خواہ نتائج مختلف النوع کاوشوں کے ذریعے ہی ممکن ہوتے ہیں۔ علامہ علمی تحقیق کے مسئلے پر وقتاً فوقتاً بعض احباب سے تبادلۂ خیال کرتے رہتے تھے۔ اس سلسلے میں عبدالمجید سالک لکھتے ہیں:

''مدتِ دراز سے علامہ کے دماغ میں یہ تجویز گردش کر رہی تھی کہ ایک علمی مرکز قائم کیا جائے، جہاں دینی و دنیاوی علوم کے ماہرین جمع کیے جائیں اور ان ماہرین کو خورد و نوش کی فکر سے بالکل آزاد کر دیا جائے، تاکہ وہ ایک گوشے میں بیٹھ کر علامہ کے نصب العین کے مطابق اسلام، تاریخِ اسلام، تمدنِ اسلام، ثقافتِ اسلامی اور شرعِ اسلام کے متعلق ایسی کتابیں لکھیں، جو آج کل کی دنیاے فکر میں انقلاب پیدا کر دیں، چنانچہ ایک دفعہ مرزا جلال الدین بیرسٹر سے ذکر آیا تو انھوں نے ریاست بہاول پور میں سرکار بہاول پور کے زیرِ سرپرستی اس قسم کے ادارے کے قیام کا سروسامان درست کیا، لیکن ریاستوں کے معاملات ایسے ہی ہوتے ہیں، معاملہ جو تعویق میں پڑا تو پھر اس کا کوئی سراغ ہی نہ مِلا۔''[۲۰]

مختلف علوم و فنون میں تحقیق و تصنیف کے ضمن میں علامہ کا ایک نہایت مفصل خط بنام صاحبزادہ آفتاب احمد خاں بھی اہمیّت رکھتا ہے[۲۱]، جس میں وہ اسلامی تاریخ، آرٹ، قانون اور تہذیب و تمدن کے مختلف پہلوؤں پر حاوی عالموں کی تیاری، ان کی تعلیم و تربیت اور اسلامی افکار

اور ادبیات میں تحقیق کا ذکر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کہتے ہیں: ''اقبال کی بہت سی تمناؤں میں سے ایک تمنا یہ بھی تھی کہ کسی مسلم یونی ورسٹی کے اندر یا کسی پُرسکون مقام پر ایک چھوٹی سی بستی کی صورت میں ایسا ادارہ قائم کیا جائے، جس میں بہترین دل و دماغ کے مسلم نوجوان خالص اسلامی ماحول میں اسلامی ریاضیات، طبیعیات، کیمیا، تاریخ، فقہ اور دینیات کی تعلیم حاصل کر کے علومِ جدیدہ کا علومِ قدیمہ سے تعلق دریافت کر سکیں۔''[۲۲]

یہ ایک حسن اتفاق ہے کہ اسی زمانے میں ایک دردمند مسلمان چودھری نیاز علی خاں نے اپنی جائداد، واقع جمال پور، پٹھان کوٹ، ضلع گورداس پور کا ایک حصہ خدمتِ دین کے لیے وقف کر کے وہاں ایک درس گاہ قائم کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس سلسلے میں متعدد زعما اور علما سے راہ نمائی چاہی، جن میں مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ اقبال، عبدالماجد دریابادی، سید سلیمان ندوی اور مولانا مودودی شامل تھے۔[۲۳] مجوزہ ادارے کے سلسلے میں مولانا مودودی نے جو انھیں ایک تفصیلی نقشہ بنا کر پیش کیا، اس میں انھوں نے علمی کام کے لیے چار شعبوں (فقہ، معاشیات، علومِ عمران، فلسفہ اور نظری سائنس) کی نشان دہی کی تھی۔ مولانا نے لکھا: ''سب علمی و تحقیقی کام اس بنیادی نظریے کے ساتھ کیا جائے کہ قرآن اور سنّت ہی علم کا اصل منبع ہے۔ سب کچھ ہم کو اسی سے لینا ہے۔''[۲۴] عبدالمجید سالک لکھتے ہیں کہ اس پر چودھری صاحب نے علامہ کی خدمت میں حاضر ہو کر بتایا کہ مَیں نے ادارے کے لیے ایک بڑا قطعۂ اراضی وقف کر دیا ہے، جس پر کتب خانہ، دارالمطالعہ اور مکانات تعمیر کیے جائیں گے، جتنے علما اور مصنفین یہاں رہ کر علومِ اسلامی کی خدمت کے لیے اپنی زندگیاں وقف کریں گے۔ میری جائداد زرعی کی آمدنی، ان سب کی معاش کی کفیل ہوگئی۔''[۲۵] اس کے ساتھ ہی انھوں نے مولانا کے علمی منصوبے سے بھی علامہ کو آگاہ کیا اور بتایا کہ دارالاسلام کے نام سے ادارہ قائم کرنے کا ارادہ ہے۔ حضرت علامہ، چودھری نیاز علی خاں کی دین پروری سے بے حد خوش ہوئے اور انھیں دارالاسلام کے منصوبے میں اپنے خواب کی تعبیر نظر آئی۔

پٹھان کوٹ کے مجوزہ علمی مرکز کے لیے علامہ اقبال کو مصر سے کسی عالمِ دین کو بلانے کا خیال آیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے الازہر یونی ورسٹی کے شیخ الجامعہ، علامہ مصطفیٰ المراغی کو ایک خط لکھا۔ یہ خط اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس سے علامہ کے مجوزہ تحقیقی ادارے کے مقاصد اور اس کی صحیح نوعیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مذکورہ خط میں وہ لکھتے ہیں: ''ہم نے ارادہ کیا ہے کہ ہم پنجاب کی ایک بستی میں ایک اہم ادارے کی بنیاد رکھیں کہ اب تک کسی اَور نے ایسا ادارہ قائم نہیں کیا اور

اِن شاءاللہ اسے اسلامی دینی اداروں میں بہت اونچی حیثیت حاصل ہوگی۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ کچھ ایسے لوگوں کو، جو جدید علوم سے بہرہ ور ہوں، کچھ ایسے لوگوں کے ساتھ یک جا کر دیں، جنھیں دینی علوم میں مہارت حاصل ہو، جن میں اعلیٰ درجے کی ذہنی صلاحیت پائی جاتی ہو اور جو اپنا وقت دینِ اسلام کی خدمت میں لگانے کو تیار ہوں اور ہم ان لوگوں کے لیے نئی تہذیب اور جدید تمدن کے شور و شغب سے دُور ایک دارالاقامت بنا دیں، جو ان کے لیے ایک اسلامی علمی مرکز کا کام دے اور اس میں ہم ان کے لیے ایک لائبریری ترتیب دیں، جس میں وہ تمام قدیم و جدید کتابیں موجود ہوں، جن کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ مزید برآں ان کے لیے ایک کامل اور صالح گائڈ کا تقرر کیا جائے، جسے قرآنِ حکیم پر بصیرتِ تامہ حاصل ہو اور جو دنیائے جدید کے احوال و حوادث سے بھی باخبر ہو، تاکہ وہ ان لوگوں کو کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہؐ کی رُوح سمجھا سکے اور فلسفہ و حکمت اور اقتصادیات و سیاسیات کے شعبوں میں فکرِ اسلامی کی تجدید کے سلسلے میں انھیں مدد دے سکے، تاکہ یہ لوگ اپنے علم اور اپنے قلم سے اسلامی تمدن کے احیا کے لیے کوشاں ہو سکیں۔

''آپ جیسے فاضل شخص کے سامنے اس تجویز کی اہمیّت واضح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، چنانچہ مَیں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ ازرہِ کرم ایک روشن دماغ مصری عالم کو جامع ازہر کے خرچ پر بھجوانے کا بندوبست فرمائیں، تاکہ وہ اس کام میں ہمیں مدد دے سکے۔ لازم ہے کہ یہ شخص علومِ شرعیہ، نیز تاریخِ تمدنِ اسلامی میں کامل دستگاہ رکھتا ہو اور یہ بھی لازم ہے کہ اُسے انگریزی زبان پر قدرت حاصل ہو۔''[۲۶]

اس کے جواب میں شیخ الازہر نے لکھا: ''ہمارے ہاں علمائے ازہر میں کوئی ایسا شخص موجود نہیں، جو انگریزی زبان پر قدرت رکھتا ہو۔''[۲۷] سید نذیر نیازی اور میاں محمد شفیع کہتے ہیں کہ علامہ کی نظر سے مولانا مودودی کی تحریریں گزری تھیں اور ان کی کتاب الجہاد فی الاسلام بھی علامہ نے دیکھی تھی، چنانچہ وہ ان کی علمیت اور ان کے فہمِ اسلام سے متاثر تھے۔ انھوں نے چودھری نیاز علی خاں کو مشورہ دیا کہ وہ مولانا مودودی کو حیدر آباد سے دارالاسلام بلا لیں۔ چودھری نیاز علی خاں کہتے ہیں: ''حضرت علامہ کی نظرِ جوہر شناس بھی سید صاحب پر جا پڑی۔''[۲۸] مختصر یہ کہ مولانا مودودی نے لاہور آکر، چودھری نیاز علی اور علامہ محمد اسد کی معیت میں علامہ اقبال سے ملاقات کی اور مجوزہ ادارے کے آئندہ منصوبوں، منہاج اور طریقۂ کار وغیرہ کے بارے میں تفصیلی گفتگو کے بعد، مارچ ۱۹۳۸ء میں حیدر آباد دکن سے جمال پور، پٹھان کوٹ منتقل ہو گئے۔ علامہ کا

ارادہ تھا کہ وہ بھی ہر سال، چند ماہ کے لیے وہاں آ کر قیام کیا کریں گے۔ مولانا مودودی مزید مشوروں اور رہنمائی کے لیے لاہور جانے کا پروگرام بنا ہی رہے تھے کہ سید نذیر نیازی کا خط موصول ہوا، جس میں نیازی صاحب نے انھیں لکھا: ''جس قدر جلد ممکن ہو، لاہور آ یئے، کیونکہ علامہ اقبال کی حالت اچھی نہیں ہے۔'' اس خط کے تیسرے روز علامہ اقبال عالمِ فانی سے عالمِ جاوِدانی کو سدھار گئے۔[۲۹] یوں ایک اسلامی تحقیقی ادارے کا جو خواب علامہ اقبال نے دیکھا تھا، وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔[۳۰]

۴

یہاں ایک دلچسپ نکتے کی نشان دہی ضروری ہے اور وہ یہ کہ آخری زمانے میں اسلامی فقہ میں تحقیق کا مسئلہ اقبال کی نظر میں جس قدر زیادہ اہمیت اختیار کر گیا تھا، فلسفہ اور تصوف جیسے موضوعات اسی قدر ان کی نظر سے گر گئے تھے۔ عملی زندگی، خصوصاً مسلم نشاتِ ثانیہ کے ضمن میں فلسفے اور تصوف کی افادیت ان کی نظر میں مشکوک ہو گئی تھی۔ پروفیسر عمر الدین کے نام ۸ر مئی ۱۹۳۶ء کو لکھتے ہیں: مسلم فلسفے اور تصوف میں میری زیادہ تر دلچسپی ختم ہو گئی ہے۔ اسلامی فقہ کے وہ اصول و ضوابط، جن کا تعلق معاملات سے ہے اور جو دنیا کی اقتصادی اور تہذیبی تاریخ کے نقطۂ نظر سے کہیں زیادہ اہم ہیں، ان کے مقابلے میں فلسفہ اور تصوف فقط قیاس آرائی (mere speculation) کی حیثیت رکھتے ہیں اور غیر شعوری طور پر یہ اسلام میں انتشار اور افتراق کا سبب بھی بنے ہیں۔[۳۱] اس کی بازگشت ضربِ کلیم میں شامل (ص ۱۸-۱۹) نظم ''ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام'' میں ملتی ہے۔ اس میں وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ فلسفہ میرے آب و گِل میں ہے اور مَیں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں، لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ:

انجامِ خرد ہے بے حضوری ہے فلسفہ زندگی سے دُوری

اسی طرح وہ خانقاہی تصوف کو زوالِ مسلم کا ایک اہم سبب گردانتے تھے۔[۳۲]

۵

علمی مسائل میں علامہ اقبال کے نزدیک مسئلہ قومیت بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اگرچہ اس کی حیثیت علمی سے زیادہ سیاسی ہے، تاہم فقہی مسائل کی طرح، مسلم حیاتِ نو، خصوصاً ہندستان میں مسلمانوں کے مستقبل کی بہتر صورت گری کے لیے علامہ اسے اساسی حیثیت دیتے تھے: ع

بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین و وطن

آخری زمانے میں مسئلہ قومیت پر انھیں مولانا حسین احمد مدنی کے ساتھ قلمی مباحثہ کرنا پڑا۔

معروف عالمِ دین، شیخ الہند مولانا حسین احمد مدنی تحریکِ آزادیِ ہند کے نامور راہ نما تھے۔ مئی ۱۹۲۷ء میں انجمن خدام الدین کے سالانہ جلسے میں شرکت کے لیے وہ لاہور آئے تو ۲ر مئی کو ۸ بجے شام موچی دروازے کے باہر انھوں نے مسلمانوں کے ایک جلسۂ عام سے خطاب کیا۔ اڑھائی گھنٹے کی طویل تقریر میں انھوں نے حالاتِ حاضرہ پر مفصل تبصرہ کیا۔ جلسے کے صدر علامہ اقبال تھے، جنھوں نے اپنے مختصر صدارتی تقریر میں مولانا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ مولانا کے ارشادات پر خلوص اور سرگرمی کے ساتھ عمل کریں۔[۳۳] علامہ اقبال اور مولانا مدنی کے درمیان غالباً یہی پہلی ملاقات تھی۔

گیارہ برس گزر گئے۔

۸ر جنوری ۱۹۳۸ء کو صدر بازار دہلی کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے مولانا مدنی نے فرمایا: ''موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں، نسل یا مذہب سے نہیں بنتیں۔ انگلستان کے سب لوگ خواہ وہ یہودی ہوں یا عیسائی اور عیسائیوں میں بھی پروٹسٹنٹ ہوں یا کیتھولک، سب ایک قوم شمار ہوتے ہیں۔ امریکہ، جاپان اور فرانس وغیرہ میں بھی یہی صورت ہے۔''[۳۴] اس جلسے کی اجمالی رُوداد، روزنامہ انقلاب، لاہور، ۱۲ر جنوری ۱۹۳۸ء میں چھپی تھی۔ اخبار نے لکھا کہ تقریر کرتے ہوئے، مولانا مدنی نے فرمایا: ''قوم مذہب سے نہیں؛ قوم ملک سے بنتی ہے۔'' اس فقرے کو سن کر مسلمانوں میں جوش پیدا ہو گیا اور ان کا جامِ صبر لبریز ہو گیا، کیونکہ مسلمانوں کے نزدیک قومیت کی اساس مذہب کے سوا کچھ نہیں۔ ملک و وطن اور رنگ و نسل کا امتیاز اسلام میں ہرگز معتبر نہیں۔ اس فقرے کو سن کر مسلمانوں میں جوش پیدا ہو گیا۔ ''اسلام زندہ باد، مذہب زندہ باد'' اور تکبیر کے پیہم نعرے بلند ہونا شروع ہوئے۔ منتظمین جلسہ نے نعرے لگانے والوں پر حملہ کر دیا۔ اتنے میں پولیس آ گئی اور حضرت مولانا مدنی نے پولیس کے پہرے میں اپنی تقریر ختم فرمائی۔[۳۵]

مولانا مدنی کا یہ بیان پڑھ کر علامہ اقبال کو دلی رنج ہوا۔ تقریباً تین ہفتے بعد ''حسین احمد'' کے عنوان سے ان کا فارسی قطعہ (مشمولہ ارمغان حجاز اردو، ص ۴۹) اخبارات میں شائع ہوا۔ اس پر حلقۂ دیوبند میں بڑا ہنگامہ ہوا۔ کہا گیا کہ مولانا مدنی کی توہین کی گئی ہے۔ مولانا کی حمایت اور اقبال کی مخالفت میں بہت سے مضامین، بیانات اور نظمیں شائع ہوئیں۔

علامہ اقبال قومیت کے مسئلے پر ہمیشہ ایک واضح مؤقف رکھتے تھے۔ باب ۱۶ میں ذکر آ چکا

ہے کہ یورپ جانے سے پہلے بلاشبہ وہ نظریۂ وطنیت کے قائل تھے، لیکن انھوں نے اپنے بقول: ''اپنی عمر کا نصف حصہ [تقریباً تیس سال کا عرصہ] اسلامی قومیت اور ملّت کے اسلامی نقطۂ نظر کی تشریح و توضیح میں گزارا ہے۔''[۳۶] اپنی پوری سیاسی زندگی میں، مخلوط انتخاب کے مقابلے میں وہ ہمیشہ جداگانہ انتخاب پر اصرار کرتے رہے، کیونکہ ان کے خیال میں مسلمانوں کا تشخص صرف جداگانہ انتخاب ہی سے برقرار رہ سکتا ہے۔ اس مسئلے پر بعض مسلم راہ نما، حتیٰ کہ محمد علی جناح بھی، حسبِ ضرورت لچک دکھاتے رہے، مگر علامہ نے کبھی کسی سے سمجھوتا نہیں کیا۔

اب مولانا حسین احمد مدنی جیسے عالمِ دین کی زبان سے وطنیت کا پرچار سن کر اقبال کو دلی افسوس ہوا اور کئی روز بعد انھوں نے مذکورہ بالا قطعے میں رنج و افسوس کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ مولانا مدنی کے ایک عقیدت مند علامہ طالوت نے علامہ اقبال اور مولانا مدنی سے خط کتابت کر کے دونوں کے درمیان ''غلط فہمی دور کرانے کی کوشش کی۔''[۳۷] علامہ اقبال نے واضح کیا کہ اگر ان الفاظ ''قومیں اوطان سے بنتی ہیں'' سے مولانا کا مقصود فقط امرِ واقعہ کا بیان ہے تو کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا، لیکن اگر وہ چاہتے ہیں کہ ہندی مسلمان اس فرنگی نظریۂ سیاست کو قبول کر لیں تو پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ یہ نظریہ کس حد تک اسلام کے مطابق ہے یا نہیں؟ علامہ اقبال نے واضح کیا کہ مَیں مولانا کے احترام میں کسی اَور مسلمان سے پیچھے نہیں ہوں۔ میرا مقصود کسی سیاسی جماعت کا پروپیگنڈا بھی نہیں ہے۔

اس اثنا میں مولانا مدنی کا ایک بیان شائع ہوا، جس میں قوم اور ملت کی لفظی بحث چھیڑی گئی تھی۔ انھوں نے کہا کہ قوم تو وطن ہی سے بنتی ہے، البتہ ملت وطن سے نہیں بنتی، اس لیے میرا یہ کہنا کہ موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں، قابلِ اعتراض نہ تھا۔ اس کے جواب میں علامہ اقبال کا ایک مدلّل اور طویل مضمون روزنامہ احسان، لاہور میں ۹ رمارچ ۱۹۳۸ء شائع ہوا۔[۳۸] اس طویل مضمون میں انھوں نے نہایت محکم دلائل کے ساتھ اپنے مؤقف کی وضاحت کی۔ علامہ اقبال نے مولانا مدنی کے فرمودات کا جواب دینے کے ساتھ، مسئلہ قومیت پر اپنے نقطۂ نظر کو بھی بڑی عمدگی سے واضح کر دیا۔ علامہ کے مؤقف کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ بلاشبہ مَیں نے اپنے مصرعے:

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است

میں لفظ ملت قوم کے معنوں میں استعمال کیا ہے اور از رُوے لغت ملت قوم کے معنوں میں بھی

مستعمل ہے، تاہم مَیں تسلیم کرتا ہوں کہ مولانا حسین احمد کا ارشاد یہی تھا کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" اور اس پر مجھے اعتراض نہیں، لیکن اگر ہندی مسلمانوں کو قومیت کا جدید فرنگی نظریہ اپنانے کا مشورہ دیا جائے تو یہ بات قابلِ گرفت ہے۔

۲۔ زمانۂ قدیم سے بطور ایک جغرافیائی اصطلاح کے، وطن کی بنیاد پر قومیت کا نظریہ رائج چلا آرہا ہے اور ان معنوں میں ہر انسان اپنی جنم بھومی سے فطری طور پر محبت رکھتا ہے، لیکن عصر حاضر میں وطن محض جغرافیائی اصطلاح نہیں، بلکہ قومیت کا ایک سیاسی تصور ہے اور یہاں یہ اسلام سے متصادم ہے۔ اسلام نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے، نہ نسلی، نہ انفرادی، نہ پرائیویٹ، بلکہ خالصتاً انسانی ہے، مگر نظریۂ وطنیت کا منطقی نتیجہ ہے: دین سے بے پروائی اور سیاسی معاملات میں انہماک؛ یعنی مذہب اور سیاست کی جدائی، جس کا لازمی اور منطقی نتیجہ لادینیت ہے۔

۳۔ مولانا حسین احمد مدنی جیسے عالم کا پیش کردہ نظریہ، امتِ اسلامیہ کے لیے نہایت خطرناک ہے۔ گویا آٹھ کروڑ مسلمانوں کو بحیثیت قوم اور بحیثیت ملت اپنا مذہب چھوڑ کر ہندی قومیت میں جذب ہو جانا چاہیے۔

۴۔ مَیں عالمِ دین نہیں، نہ عربی زبان کا ادیب ہوں:

قلندر جز دو حرفِ لا اِلٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

مگر قرآنِ حکیم میں قوم نہیں، "ملت" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اگر مولانا قرآن سے استشہاد کرتے تو اس مسئلے کا حل خود بخود ان کی آنکھوں کے سامنے آجاتا۔

۵۔ نبی کریمؐ کی بعثت سے پہلے ان کی قوم واقعی "قوم" تھی، لیکن جن لوگوں نے آپ کی پیروی کی، وہ ملتِ اسلامیہ بن گئے اور ان کی سابقہ قومی حیثیت ثانوی بن کر رہ گئی۔ اگر قوم وطن کی بنیاد پر بنتی تو پھر ضرورت نہ تھی کہ نبی کریمؐ ابولہب کو بھی دعوتِ دین دیتے۔ ابولہب، ابوجہل اور کفارِ مکہ اپنی بت پرستی پر قائم رہتے ہوئے "وحدتِ عربیہ" میں شامل رہ سکتے تھے۔

۶۔ ایک اعتبار سے وطنیت کا نظریہ قادیانیت سے مماثلت رکھتا ہے۔ ایک جدید نبوت کی اختراع کا منطقی نتیجہ ختمِ نبوت کی نفی ہے، اسی طرح نظریۂ وطنیت بھی امتِ مسلمہ کی اساس و بنیاد کی نفی کرنے والا ہے۔

۷۔ فقط انگریز کی غلامی سے آزاد ہونا منتہائے مقصود نہیں ہے، بلکہ ہمارا اصل مقصد اسلامی حکومت کا قیام ہے۔ مجرد آزادی تو ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنے کے مترادف ہے۔ ''ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندستان کلیتاً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے، لیکن اگر آزادیِ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر ہے، ویسا ہی رہے گا یا اس سے بھی بدتر بن جائے تو مسلمان ایسی آزادیِ وطن پر ہزار مرتبہ لعنت بھیجتا ہے۔ ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا، بولنا، روپیا صرف کرنا، لاٹھیاں کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا سب کچھ حرام اور قطعی حرام ہے۔''[۳۹]

بعد ازاں مولانا مدنی نے اپنے ایک خط میں وضاحت کی کہ میں نے نظریۂ وطنیت کا ذکر بطور امرِ واقعہ کے کیا تھا۔ یہ نہیں کہا کہ ''تم کو ایسا'' کرنا چاہیے، تاہم مولانا مدنی یہ کہہ کر اقبال پر چوٹ بھی کر گئے کہ ملتِ اسلامیہ کی اساس اور اس کی ماہیت کا ہمیں بخوبی علم ہے اور ہم نے اس کی خاطر مصائب اٹھائے اور جیل کاٹی۔ ''کوئی تو صرف اس کا قوال ہی ہوگا، ہم قوّال اور فعّال دونوں ہیں۔''[۴۰]

قومیت کے مسئلے پر اس قلمی مجادلے کے آخر میں ۲ر مارچ کو علامہ اقبال نے طالوت کو ایک خط میں لکھا کہ مولانا کے اس اعتراف کے بعد کہ مولانا مدنی نے جدید نظریۂ قومیت اختیار کرنے کا مشورہ نہیں دیا، میں مولانا پر کسی قسم کے اعتراض کا حق نہیں رکھتا۔ میں ان کی حمیتِ دینی کے احترام میں، ان کے کسی عقیدت مند سے پیچھے نہیں ہوں اور ان کے عقیدت مندوں کے جوش کی قدر کرتا ہوں، جنھوں نے پرائیویٹ خطوں اور پبلک تحریروں میں مجھے گالیاں دیں۔[۴۱]

اس طرح گویا علامہ اقبال نے وفات سے ۴۴ دن پہلے، اس بحث کو ختم کر دیا۔[۴۲]

•

حوالے اور حواشی

۱۔ مجالسِ اقبال، ص ۱۳۵

۲۔ اقبال نامہ، ص ۹۸

۳۔ چودھری محمد حسین اور علامہ اقبال: روابط، ص ۷۳

۴۔ ایضاً، ص ۷۲

۵۔ علی الترتیب: ملفوظات، ص ۲۲۶؛ ذکرِ اقبال، ص ۲۱۲؛ اقبال، بھوپال میں، ص ۱۴

۶۔ دیکھیے علی الترتیب: انوارِ اقبال، ص ۲۰۵-۲۰۶؛ اقبال نامہ، ص ۲۷۰، ۲۷۳، مکتوبات بنام نیازی، ص ۲۷۷؛ ملفوظات، ص ۲۲۶

۷۔ ملفوظات، ص۲۲۷
۸۔ اقبال نامہ، ص۲۷۳، اس خط کی صحیح تاریخ ۱۳ مئی ہے۔ دیکھیے: اقبال نامے، ص۱۶۱
۹۔ مکتوبات بنام نیازی، ص۳۴۴-۳۴۵
۱۰۔ اقبال نامہ، ص۹۸
۱۱۔ ایضاً، ص۱۵۵
۱۲۔ اقبال بنام شاد، ص۲۲۷
۱۳۔ *Letters & Writings of Iqbal*، ص۸۶-۹۵
۱۴۔ اقبال نامہ، ص۱۱۰-۱۱۱، ۱۵۵-؛ حیاتِ انور، ص۱۶۵
۱۵۔ اقبال نامہ، ص۱۰۰
۱۶۔ تاریخ تصوف کے نام سے صابر کلوروی کی مرتبہ کتاب اسی سلسلے کی نا تمام تحریروں اور شذرات کا مجموعہ ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: نقوش، اقبال نمبر، دوم، دسمبر ۱۹۷۷ء، ص۱۵۶-۱۵۸
۱۷۔ بحوالہ نقوش، محولہ بالا، ص۱۶۵
۱۸۔ مجالسِ اقبال، ص۱۳۹-۱۴۰
۱۹۔ ایضاً، ص۱۴۱، نیز: داؤد رہبر کا مضمون ''ایک یادگار ادارہ'' در: علامت، لاہور، مئی ۲۰۰۱ء
۲۰۔ ذکرِ اقبال، ص۲۱۲-۲۱۳
۲۱۔ اقبال نامہ، ص۵۲۲
۲۲۔ زندہ رُود، ص۶۶۷
۲۳۔ چودھری نیاز علی خاں اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کی خط کتابت کے لیے دیکھیے: سید اسعد گیلانی کی تصنیف: اقبال، دارالاسلام اور مودودی۔ اسلامی اکادمی لاہور، ۱۹۷۸ء
۲۴۔ خطوطِ مودودی، دوم، ص۶۰
۲۵۔ ذکرِ اقبال، ص۲۱۳
۲۶۔ خطوطِ اقبال، ص۲۸۶
۲۷۔ ایضاً، ص۲۸۸
۲۸۔ صحیفہ، اقبال نمبر حصہ اوّل، اکتوبر ۱۹۷۳ء، ص۲۳۰
۲۹۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: مولانا مودودی کے خطوط بنام چودھری نیاز علی خاں اور سید نذیر نیازی کا خط بنام مولانا مودودی، مشمولہ: خطوطِ مودودی، دوم
۳۰۔ مولانا مودودی اور ان کے رفقا اگست ۱۹۴۷ء تک جمال پور، پٹھان کوٹ میں مقیم رہے اور علامہ اقبال ہی کے خواب [ملتِ اسلامیہ کی حیاتِ نو] کی تعبیر کے لیے اپنی دانست اور فہم کے مطابق کوشاں رہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد، کچھ اَور علمی اداروں نے بھی اپنے اپنے دائرہ کار میں بعض اعتبار سے قابلِ قدر خدمات انجام دیں، جیسے: اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور؛ ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد؛ اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد وغیرہ۔

۳۱۔ نقوش، اقبال نمبر، دوم، دسمبر ۱۹۷۷ء، ص ۱۸
۳۲۔ ارمغانِ حجاز، اردو، ص ۱۵
۳۳۔ انقلاب، ۴؍ مئی ۱۹۲۷ء بحوالہ مخفی گوشے، ص ۲۶۸
۳۴۔ متحدہ قومیت اور اسلام، ص ۴
۳۵۔ روزنامہ انقلاب، لاہور، ۱۲؍ جنوری ۱۹۳۸ء، بحوالہ مخفی گوشے، ص ۲۷۰-۲۷۱
۳۶۔ انوارِ اقبال، ص ۱۶۸
۳۷۔ زندہ رُود، ص ۶۹۸
۳۸۔ مشمولہ مقالاتِ اقبال، ص ۲۶۲-۲۷۹
۳۹۔ یہ نکات و اقتباسات مقالاتِ اقبال میں شامل اقبال کے مضمون: ''جغرافیائی حدود اور مسلمان'' سے اخذ کیے گئے ہیں۔ نمبر ۶ میں شامل اقتباس مولانا مودودی کی تحریر سے ماخوذ ہے، جو ان کے رسالے ترجمان القرآن کے شمارہ مئی ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ معلوم ہے کہ ترجمان القرآن علامہ کے زیرِ مطالعہ رہتا تھا۔
۴۰۔ متحدہ قومیت اور اسلام، ص ۲۰-۲۱
۴۱۔ ایضاً، ص ۲۴
۴۲۔ لیکن علامہ کی وفات کے بعد مولانا مدنی نے اپنی ''انتہائی عدیم الفرصتی'' کے باوجود علامہ کے جواب میں ایک طویل مضمون قلم بند کرنا ضروری سمجھا۔ محمد احمد خاں لکھتے ہیں: ''یہ بات قابلِ گرفت ہے کہ مولانا نے اس مسئلے کو دوبارہ اس وقت چھیڑا، جب علامہ اقبال، ان کا جواب دینے کے لیے اس دنیا میں موجود نہ تھے۔ اور اس سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ ناشر اور خود مولانا نے اس کتابچے میں علامہ مرحوم پر طنز و تعریض کی۔'' (اقبال کا سیاسی کارنامہ، ص ۵۹۹) متذکرہ مضمون میں حضرت مولانا نے علامہ اقبال کو ''ساحرینِ برطانیہ کے سحر میں جتلا'' قرار دیا تھا۔ (متحدہ قومیت اور اسلام، ص ۳۰) ـــــ اب اس صورت میں مولانا کے بعض عقیدت مندوں کی یہ رائے کیسے صائب قرار دی جاسکتی ہے کہ ''حسین احمد'' نامی قطعہ ارمغانِ حجاز میں شامل نہیں ہونا چاہیے تھا۔

❖......❖......❖

(۲۴)

کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست

۱

علامہ اقبال نے ۱۳؍ جون ۱۹۳۷ء کو سر اکبر حیدری کے نام ایک خط میں لکھا کہ عمر کے ان ڈھلتے سالوں میں، جب کہ میری زندگی کا کام عملاً انجام کو پہنچ چکا ہے...... ایک ہی خواہش، جو ہنوز میرے جی میں خلش پیدا کرتی ہے، یہ رہ گئی ہے کہ اگر ممکن ہو سکے تو حج کے لیے مکہ جاؤں اور وہاں سے اس ہستی کی تربت پر حاضری دوں، جس کا ذاتِ الٰہی سے بے پایاں شغف میرے لیے وجہِ تسکین اور سرچشمۂ الہام رہا ہے۔[۱]

علامہ اقبال ۱۹۳۴ء سے بیمار چلے آ رہے تھے۔ وہ حج بیت اللہ اور زیارتِ مدینہ کی دیرینہ آرزو رکھتے تھے، لیکن اب علالت نے ان کی خواہش کو تیز تر کر دیا تھا۔ جن دنوں اکبر حیدری کو مذکورہ بالا خط لکھا، اسی زمانے میں وہ ارمغانِ حجاز کی رباعیات بھی لکھ رہے تھے اور اس حوالے سے تصور ہی تصور میں وہ حجاز کے سفرِ سعادت پر روانہ ہو چکے تھے۔

دو روز بعد ۱۵؍ جنوری ۱۹۳۷ء کو انھوں نے سر راس مسعود کو ایک خط میں لکھا: ''اِن شاء اللہ امید ہے کہ سالِ آئندہ حج بھی کروں گا اور دربارِ رسالتؐ میں حاضری بھی دوں گا اور وہاں سے ایسا تحفہ لاؤں گا کہ مسلمانانِ ہند یاد کریں گے۔''[۲] یہ اشارہ ہے، آخری مجموعۂ کلام ارمغانِ حجاز کی طرف، جسے وہ ضربِ کلیم (۱۹۳۶ء) کے بعد سے مرتب کر رہے تھے۔

۲

علامہ اقبال کے ہاں ابتدا ہی سے جذبۂ عشقِ رسولؐ کا ایک والہانہ اظہار ملتا ہے۔ اوائل میں اظہارِ عقیدت کا انداز بالعموم رسمی اور روایتی تھا، مثلاً ''نالۂ یتیم'' (۱۹۰۰ء) کا یہ شعر:

اس نے پہچانا نہ تیری ذاتِ پُر انوار کو
جو نہ سمجھا احمدِ بے میم کے اسرار کو[۳]

یا ''فریادِ اُمت'' کے بعض اشعار، جیسے:

جس کی تاثیر سے ہو عزتِ دین و دُنیا
ہائے اے شافعِ محشر وہ دُعا کون سی ہے
جس کی تاثیر سے یک جان ہو امت ساری
ہاں بتا دے ہمیں وہ طرزِ وفا کون سی ہے[۴]

لیکن ایسے روایتی اشعار سے کہیں زیادہ والہانہ شیفتگی کا اظہار ۱۹۰۵ء کے اس مکتوب سے ہوتا ہے، جو انھوں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان جاتے ہوئے اثنائے سفر اپنے دوست مولوی انشاء اللہ خاں کو لکھا تھا:

''اب ساحل قریب آتا جاتا ہے اور چند گھنٹوں میں ہمارا جہاز عدن جا پہنچے گا۔ ساحل عرب کے تصور نے جو ذوق وشوق اس وقت دل میں پیدا کر دیا ہے، اس کی داستان کیا عرض کروں! بس دل یہی چاہتا ہے کہ زیارت سے اپنی آنکھوں کو منور کروں:

اللہ رے خاکِ پاکِ مدینہ کی آبرو
خورشید بھی گیا تو اُدھر سر کے بل گیا

اے عرب کی مقدس سرزمین! تجھ کو مبارک ہو۔ تو ایک پتھر تھی، جس کو دنیا کے معماروں نے رَد کر دیا تھا، مگر ایک یتیم بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا افسوں پڑھ دیا کہ موجودہ دنیا کی تہذیب و تمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی...... تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس نقشِ قدم دیکھے ہیں اور تیرے کھجوروں کے سائے نے ہزاروں ولیوں اور سلیمانوں کو تمازتِ آفتاب سے محفوظ رکھا۔ کاش! میرے بدکردار جسم کی خاک تیرے بیابانوں میں اڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری زندگی کے تاریک دنوں کا کفارہ ہو۔ کاش! مَیں تیرے صحراؤں میں لٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پروا نہ کرتا ہوا، اس پاک سرزمین میں جا پہنچوں، جہاں کی گلیوں میں اذانِ بلال کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی۔''[۵]

اقبال اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت جا رہے تھے۔ ان کا رُخ سوئے فرنگ تھا، لیکن دل ـــــ ! دل نواحِ کاظمہ میں اٹکا ہوا تھا۔

۳

اس عبوری دَور کے بعد آنحضور کی پیغمبرانہ حیثیت، یعنی آپ کا منصب رسالت، آپ کی

بشری عظمت اور آپؐ کی رحمت و شفقت کا پہلو اقبال کے لیے سب سے زیادہ جذب و کشش کا باعث بنتا ہے۔ آپؐ نے اپنی ۲۳ سالہ پیغمبرانہ زندگی میں جو مثالی کارنامے انجام دیے، ان کا ذکر کلامِ اقبال میں متعدد مقامات پر مِلتا ہے، جیسے: رموزِ بیخودی (۱۹۱۸ء) کا آخری باب بعنوان: ''عرضِ حالِ مصنف بحضور رحمت للعالمینؐ'' یا پس چہ باید کرد میں ایک نظم بعنوان: ''درحضورِ رسالت مآب'' یا بالِ جبریل کے نعتیہ اشعار (ص ۲۵، ۳۸):

وہ دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کُل، جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل، وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰس، وہی طٰہٰ

....

تو اے مولائے یثرب! آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی، مرا ایماں ہے زناری

اور نظم ''ذوق وشوق'' کا ایک حصّہ:

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّہٴ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب[۶]

شاعری کے علاوہ اقبال کی نثر، خصوصاً ان کے خطوط میں حبِ رسولؐ کا اظہار ایک اَور طرح سے بھی مِلتا ہے؛ مثلاً: ''مَیں جو اپنی گذشتہ زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے بہت افسوس ہوتا ہے کہ مَیں نے اپنی عمر یورپ کا فلسفہ وغیرہ پڑھنے میں گنوائی۔ خدا تعالیٰ نے مجھ کو قوائے دماغی بہت اچھے عطا فرمائے تھے، اگر یہ قویٰ دینی علوم کے پڑھنے میں صرف ہوتے تو آج خدا کے رسولؐ کی میں کوئی خدمت کر سکتا تھا اور جب مجھے یہ خیال آتا ہے کہ والد مکرم مجھے علومِ دینی ہی پڑھانا چاہتے تھے تو مجھے اَور بھی قلق ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ صحیح راہ معلوم بھی تھی، تو بھی وقت کے حالات نے اس راہ پر چلنے نہ دیا۔ بہر حال جو کچھ خدا کے علم میں تھا، ہوا اور مجھ سے بھی جو کچھ ہو سکا، مَیں نے کیا؛ لیکن دل چاہتا ہے کہ جو کچھ ہوا، اس سے بڑھ کر ہونا چاہیے تھا اور زندگی تمام و کمال نبی کریمؐ کی

خدمت میں بسر ہونی چاہیے تھی۔"[۷] اسی حوالے سے مولوی صالح محمد کو لکھا کہ آئندہ نسلوں کی فکر کرنا ہمارا فرض ہے، تاکہ ان کا دین اور کلچر محفوظ رہے۔ اگر اس سلسلے میں غفلت کی گئی تو "ہم سب لوگ قیامت کے روز خدا اور رسولؐ کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔"[۸] گویا دینی علوم کی تحصیل اور ان علوم کو آئندہ نسلوں تک منتقل کرنا بھی نبی کریمؐ کی محبت اور خدمت ہی کا ایک پہلو ہے۔ اسی سلسلے میں سید غلام میراں شاہ کے نام لکھتے ہیں: "دعا کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ آپ کو اس امر کی توفیق دے کہ آپ اپنی قوت، ہمت، اثر، رسوخ اور دولت و عظمت کو حقائقِ اسلام کی نشر و اشاعت میں صرف کریں۔ اس تاریک زمانے میں حضورِ رسالت مآبؐ کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے۔"[۹]

اس طرح خدمتِ اسلام، علامہ اقبال کے نزدیک خدمتِ رسولؐ کے مترادف تھی۔ جب وہ کہتے ہیں: "اس وقت مسلمان کا فرض ہے کہ جو قوت خدا تعالیٰ نے اسے عطا کی ہے، اسے اسلام کی خدمت اور اقوام و مللِ اسلامیہ کے احیا و بیداری میں صرف کرے۔"[۱۰] تو گویا وہ رسول اللہؐ سے اپنے تعلق کو اور مضبوط کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

تذکرۂ رسولؐ، حبِ رسولؐ اور خدمتِ رسولؐ کے ساتھ اقبال کے ہاں حجازِ مقدس کے سفر، حج بیت اللہ، زیارتِ مدینہ اور روضۂ رسولؐ پر حاضری کی تمنا بھی ابتدائی زمانے ہی سے موجود تھی۔ ۶ر اکتوبر ۱۹۱۱ء کو اکبر الٰہ آبادی کو لکھتے ہیں: "خدا آپ کو اور مجھ کو بھی زیارتِ روضۂ رسولؐ نصیب کرے۔ مدت سے یہ آرزو دل میں پرورش پا رہی ہے۔ دیکھیے، کب جوان ہوتی ہے۔"[۱۱]

غلام رسول مہر بتاتے ہیں کہ ۱۹۲۵ء، ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۷ء کے زمانے میں علامہ اقبال سے ملاقاتوں میں اکثر سفرِ حجاز کا ذکر چھڑ جاتا اور گھنٹوں اس موضوع پر گفتگو رہتی تھی۔ دوسری گول میز کانفرنس سے واپسی پر ۱۹۳۲ء میں فلسطین گئے۔ وہاں سے حجاز جانا مشکل نہ تھا، مگر جیسا کہ باب ۱۷ میں ذکر آ چکا ہے، حجاز اس لیے نہ گئے: "دنیوی مقاصد کے لیے سفر کرنے کے ضمن میں حرمِ نبوی کی زیارت کی جرأت کرنا سوءِ ادب ہے۔"[۱۲]

فقیر سید وحید الدین کی ایک روایت قابلِ غور ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ۱۹۳۲ء میں علامہ یورپ سے واپس آئے تو میرے والد مرحوم اس موقع پر ان سے ملنے گئے۔ بڑی مدت کے بعد، ایک دوسرے سے ملاقات ہوئی تھی، اس لیے بڑے تپاک سے ملے اور ڈاکٹر صاحب سے ان کے سفر کے تجربات کے متعلق گفتگو ہونے لگی۔ والد مرحوم نے اثنائے گفتگو میں کہا: "اقبال! تم یورپ ہو آئے، مصر اور فلسطین کی سیر بھی کی؛ کیا ہی اچھا ہوتا کہ واپسی پر روضۂ اطہر کی زیارت سے بھی

آنکھیں نورانی کر لیتے۔" یہ سنتے ہی ڈاکٹر صاحب کی حالت دِگرگوں ہوگئی، یعنی چہرے پر زردی چھا گئی اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ چند لمحے تک یہی کیفیت رہی۔ پھر کہنے لگے: "فقیر! مَیں کس منہ سے روضۂ اطہر پر حاضر ہوتا۔"[۱۳]

بالفاظِ دیگر، انھیں ضمناً دربارِ رسالت مآبؐ میں حاضر ہونا اچھا نہ لگا۔ دراصل آنحضورؐ کے ہر امتی کی طرح اقبال کو بھی اپنی لغزشوں اور کوتاہیِ فکر و عمل کا شدید احساس تھا۔ احساسِ ندامت کے سبب، وہ روضۂ رسولؐ پر حاضری سے گریزاں تھے اور وہ ایک جگہ بارگاہِ خداوندی میں اس طرح التماس کرتے ہیں:

تو غنی از ہر دو عالم، من فقیر　　　روزِ محشر عذر ہاے من پذیر
ور حسابم را تو بینی ناگزیر　　　از نگاہِ مصطفیٰ پنہاں بگیر[۱۴]

(اے اللہ! تو غنی ہے [اور] مَیں تہی دست ہوں۔ روزِ محشر مجھے جواب دہی سے معاف رکھنا، لیکن اگر جواب دہی ناگزیر ہو تو پھر آنحضورؐ کی نظروں سے اوجھل ہو کر حساب لیجیو [تاکہ آپؐ کے سامنے میری رُسوائی نہ ہو])

۴

بہر حال انھوں نے سفرِ حجاز کا ارادہ ترک نہیں کیا، مگر جیسا سطورِ بالا میں ذکر ہوا، یورپ سے واپسی کے چند ماہ بعد وہ شدید طور پر علیل ہو گئے۔ انھیں وکالت ترک کرنی پڑی، بہت سے معمولات متأثر ہوئے، علاج معالجے کے لیے بار بار دہلی اور بھوپال جانا پڑا۔ بیماری کے نتیجے میں طرح طرح کے تفکرات اور غم ہاے روزگار نے گھیر لیا، مگر اس عالم میں بھی سرزمینِ مقدس کے سفر کے لیے ان کے عزم و ارادے میں فرق نہیں آیا۔ ارادہ نہ صرف برقرار رہا، بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سفرِ حجاز کی آرزو تیز تر ہوتی گئی اور اس کا ذکر جہاں تہاں ان کے خطوط میں بھی ملتا ہے۔ ۱۳ر جون ۱۹۳۷ء کو عبداللہ چغتائی کے نام لکھتے ہیں: "اگر توفیقِ الٰہی شامل رہی تو زیادہ سے زیادہ مکہ ہوتا ہوا، ممکن ہے، مدینہ تک پہنچ سکوں۔ اب مجھ ایسے گنہگاروں کے لیے آستانِ رسالتؐ کے سوا اَور کہاں جاے پناہ ہے۔"[۱۵]

اسی روز سر اکبر حیدری کے نام متذکرہ بالا خط میں بھی انھی جذبات کا اظہار کیا۔ اس آخری زمانے میں نبی پاکؐ کے لیے ان کا ذوق و شوق اس قدر بڑھ گیا تھا کہ آنحضورؐ کا ذکر آتے ہی وہ آبدیدہ ہو جاتے اور اکثر اوقات ان پر رقت طاری ہو جاتی۔ غلام رسول مہر کا بیان ہے کہ آپؐ کا نام زبان پر

آتے ہی چہرہ سرخ ہو جاتا تھا اور آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ آپ کی ذاتِ بابرکات کے ساتھ اقبال کا عشق، بیان کا متحمل نہیں۔ ان کی تصانیف میں جو اشعار حضورؐ کے متعلق ہیں، ان میں سے ایک شعر بھی ایسا نہیں، جسے انھوں نے سنایا ہو اور اس پر بے اختیار اشک بار نہ ہوئے ہوں۔[16]

وفات سے کوئی آٹھ دس ماہ پہلے علامہ کے ایک دوست مخدوم الملک سید غلام میراں شاہ نے حج بیت اللہ کا عزم کیا اور غالباً ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ جواباً انھیں لکھا: ''حج بیت اللہ کی آرزو تو گذشتہ دو تین سال سے میرے دل میں بھی ہے۔ خدا تعالیٰ ہر پہلو سے استطاعت عطا فرمائے تو یہ آرزو پوری ہو اور اگر آپ رفیقِ راہ ہوں تو مزید برکت کا باعث ہو...... آپ ایسے باہمت جوان کے لیے تو یہ سفر قطعاً مشکل نہیں، ہمت تو میری بھی بلند ہے، لیکن بدن عاجز و ناتواں ہے۔ کیا عجب کہ خدا تعالیٰ توفیق عطا فرمائے اور آپ کی معیت اس سفر میں نصیب کرے۔''[17]

یہی زمانہ تھا، جب وہ ''حضورِ رسالتؐ'' کے عنوان سے فارسی رباعیات اور قطعات لکھ رہے تھے۔ بقول نذیر نیازی: ''رباعیوں پر رباعیات موزوں ہوتی چلی گئیں۔''[18] اس کے ساتھ ہی حج پر جانے کے لیے انھوں نے مختلف جہاز راں کمپنیوں سے خط کتابت بھی شروع کر رکھی تھی۔ گویا ایک اعتبار سے حالتِ سفر میں تھے اور اس کا اظہار اس طرح کر رہے تھے:

بہ ایں پیری رہِ یثرب گرفتم   نوا خواں از سرورِ عاشقانہ
چوں آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام   کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ[19]

(اس بڑھاپے میں مدینے کی طرف سرورِ عاشقی سے مست گاتا چلا جا رہا ہوں۔ میری مثال اس پرندے سے مختلف نہیں ہے، جو شام کے وقت صحرا میں اپنے آشیانے تک پہنچنے کی فکر میں مستعد ہوتا ہے۔)

بیماری کے سبب، اقبال کے لیے جسمانی طور پر سفر کرنا بہت مشکل تھا، چنانچہ عالمِ خیال ہی میں وہ مدینہ طیبہ کی جانب رواں دواں رہے۔ اپنی علالت کے حوالے سے اسی زمانے کی حسب ذیل رباعی یا قطعہ بھی ان کے حسب حال تھا:

سحر با ناقہ گفتم : نرم تر رَو   کہ راکب خستہ و بیمار و پیر است
قدم مستانہ زد چنداں کہ گوئی   بہ پایش ریگِ ایں صحرا حریر است[20]

(بوقتِ صبح مَیں نے اونٹنی سے کہا کہ ذرا آہستہ چل کہ سوار خستہ، بیمار اور بوڑھا ہے۔ اس پر وہ اس طرح مستانہ انداز میں قدم زن ہوئی، گویا اس کے پاؤں کے نیچے پھیلی ہوئی ریگِ صحرا، ریت نہیں، ریشم ہے۔)

مگر اثنائے سفر کی لذت ایسی سرور انگیز اور وجد آفریں ہے کہ مسافر، ساربان کو راہِ دراز اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے، تاکہ شوقِ سفر میں مسرت کے لمحات دراز تر ہوسکیں:

غمِ راہی نشاط آمیز تر کن　　فغانش را جنوں انگیز تر کن
بگیر اے سارباں راہِ درازے　　مرا سوزِ جدائی تیز تر کن[۲۱]

(اے ساربان! تو مسافر کے غم میں نشاط اور کیف کی آمیزش بڑھا دے اور اس کی آہ و زاری میں جنوں کا عنصر زیادہ کر دے۔ اے ساربان! لمبا راستہ اختیار کر اور یوں میرے سوزِ جدائی کو تیز تر کر دے۔)

مولانا محمد اسلم جیراج پوری ۹ رجنوری کو یومِ اقبال کی تقریب میں شریک تھے۔ اگلے روز علامہ سے ملاقات کے لیے جاوید منزل گئے۔ بیمار پرسی کے بعد پوچھا کہ موجودہ تصنیف [ارمغانِ حجاز] کب مکمل ہوگی؟ فرمایا: ''اگلے سال اِن شاءاللہ مدینہ پہنچ کر۔''[۲۲]

۵

سید نذیر نیازی کو علامہ کے آخری زمانے میں بالالتزام ان کی خدمت میں حاضر رہنے کا موقع مِلا۔ وہ اپنی ۱۰ رجنوری ۱۹۳۸ء کی یادداشت میں بتاتے ہیں کہ سفرِ حج کا ذکر آیا تو حضرت علامہ نے فرمایا: ''ایک طرح سے تو مَیں حج ہی کے راستے میں ہوں۔ چاہتا ہوں، یہ راستہ جلد طے ہو جائے۔'' پھر ذرا دم لے کر، مگر بھرائی ہوئی آواز میں فرمایا: ''یہ راستہ طے تو ہو جاتا ہے، لیکن مجھے اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا۔ مَیں تو اب جو کچھ کہتا ہوں، وہیں کے لیے کہتا ہوں۔'' اور یہ کہتے کہتے دفعتاً رک گئے، جیسے شدتِ جذبات، اظہارِ مدعا میں حارج ہو۔

بالآخر ارشاد فرمایا: ''آشیانۂ اقدس پر پہنچ جاؤں تو کچھ اَور بھی عرض کروں۔'' یہ گویا اشارہ تھا، ارمغان حجاز کی طرف، جس کی ابتدا کب سے ہو چکی تھی۔ حضرت علامہ نے بات ختم کی تو احباب نے تبرک کی فرمائش کر دی۔ فرمایا: ''مَیں تو معذور ہوں، انھیں کچھ یاد ہو تو سن لیجیے۔'' مَیں نے حافظے پر زور دیا تو گفتگو کی رعایت سے ایک رباعی ذہن میں آ گئی۔ مصرعِ اوّل پڑھا، دوسرا مصرع پڑھ رہا تھا کہ حضرت علامہ پر رقت طاری ہوگئی اور وہ بار بار اس کی تکرار کرنے لگے۔ مَیں خاموش ہو گیا۔ اس پر انھوں نے تیسرا مصرع خود ہی ارشاد فرمایا؛ لیکن ابھی پورے طور پر ادا نہیں کر پائے تھے کہ آواز گلوگیر ہوگئی اور وہ یوں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے کہ احباب پریشان ہو گئے۔ رباعی یہ تھی:

تنم واماند و جانم در تگ و پوست   سوے شہرے کہ بطحا در رہِ اوست
تو باش ایں جا و باخاصاں بیامیز   کہ من دارم ہواے منزلِ دوست [۲۳]

(میرا جسم مسلسل بیماری کے سبب مضمحل ہے، لیکن میری روح اس شہر کی جانب کھنچی چلی جا رہی ہے، جس کے راستے میں مکہ آتا ہے۔ [اے مخاطب!] تم یہیں رکو، اور بڑے لوگوں سے میل ملاقات کرو۔ مجھے تو اپنے دوست [حضورِ اکرمؐ] کے در تک پہنچنے کی ہڑک لگی ہوئی ہے۔)

آخری زمانے میں جناب غلام رسول مہرا کثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ حضرت کی بڑی آرزو تھی کہ حجاز جائیں اور حج و زیارت کا شرف حاصل کریں۔ کئی برس سے ہر سال تیاری کا خیال ہوتا تھا، لیکن چند در چند موانع کے باعث اور آخر میں خرابیِ طبیعت کی وجہ سے آرزو پوری نہ ہوسکی۔ ارمغان حجاز کے متعلق ایک دو موقعوں پر ارشاد فرمایا کہ اس میں بعض خلا ہیں، جو سفرِ حجاز میں پورے کیے جائیں گے، لیکن اس سفر کا موقع نہ آیا۔ وفات سے تین چار روز پیشتر فرماتے تھے کہ سہارن پور سے ایک صاحب نے خط لکھا ہے کہ مَیں حجاز گیا تھا اور طواف میں صدقِ دل سے دعا کی تھی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بھی حجاز لائے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ دعا منظور ہو چکی ہے۔ یہ خط اطلاع کی غرض سے لکھا گیا ہے۔ پھر فرمانے لگے: اب بظاہر میرا حجاز جانا غیر ممکن ہے، لیکن ان صاحب نے لکھا کہ دعا منظور ہو چکی ہے۔ دیکھیں، اس کی کیا صورت ہو۔ [۲۴]

ایک بار گھر میں اُن کے عزمِ حجاز کا ذکر چھڑا تو علامہ کی ہمشیرہ نے کہا: آپ کی آنکھوں میں پانی [موتیا] بھی تو اُتر رہا ہے، ایسی حالت میں حج کا سفر کیسے کر سکتے ہیں؟ اللہ خیر سے رکھے، اگلے سال آپریشن کے بعد چلے جایئے گا۔ اس پر بڑے درد انگیز، مگر پُر شوق لہجے میں فرمایا: ''آنکھوں کا کیا ہے، آخر اندھے بھی تو حج کر ہی لیتے ہیں۔'' [۲۵] دردمندی اور سوز و گداز کی یہی کیفیت ارمغان حجاز کے حصّہ ''حضورِ رسالت'' کی رباعیات میں انتہا درجے پر نظر آتی ہے۔ دربارِ رسالتؐ میں حاضری کے تصور نے علامہ کو آخر دم تک بے چین و مضطرب رکھا۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں: ''زندگی کے آخری ایام میں پیمانۂ عشق اس طرح لبریز ہوا کہ مدینے کا نام آتے ہی اشکِ محبت بے ساختہ جاری ہو جاتے۔ وہ اپنے اس کمزور جسم کے ساتھ مدینۃ الرسول میں حاضر نہ ہو سکے، لیکن اپنے مشتاق اور بے تاب دل، نیز اپنی قوتِ تخیل اور زورِ کلام کے ساتھ انھوں نے حجاز کی وجد انگیز فضاؤں میں بار بار پرواز کی اور ان کا طائرِ فکر ہمیشہ اسی آشیانے یا آستانے پر منڈلاتا رہا۔'' [۲۶]

حوالے اور حواشی

۱۔ خطوطِ اقبال، ص ۲۷۷
۲۔ اقبال نامے، ص ۲۰۹
۳۔ کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال، ص ۴۱
۴۔ ایضاً، ص ۱۱۸
۵۔ خطوطِ اقبال، ص ۹۲
۶۔ بالِ جبریل، ص ۱۱۳۔ بعض شارحین اور ناقدین 'ذوق و شوق' کے اس بند کو نعتیہ کے بجائے حمد یہ قرار دیتے ہیں۔ ان میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر عبدالمغنی اور ڈاکٹر اسرار احمد شامل ہیں۔ پروفیسر غلام رسول ملک کے خیال میں اس کا مطالعہ حمد کی حیثیت سے بھی کیا جا سکتا ہے اور نعتیہ قصیدے کی حیثیت سے بھی۔ رسالہ اقبالیات، سری نگر، شمارہ ۸، ص ۲۲-۲۳
۷۔ مظلوم اقبال، ص ۲۸۱-۲۸۲
۸۔ اقبال نامہ، ص ۶۲۷
۹۔ ایضاً، ص ۲۱۱
۱۰۔ انوارِ اقبال، ص ۱۹۲
۱۱۔ اقبال نامہ، ص ۳۷۳
۱۲۔ ایضاً، ص ۶۳۲
۱۳۔ روز گارِ فقیر [اوّل]، ص ۳۷
۱۴۔ اقبال نامہ، ص ۲۵۶۔ یہ رُباعی علامہ نے محمد رمضان عطائی (م: ۲؍اگست ۱۹۶۸ء) کی درخواست پر انھیں بخش دی تھی، اسی لیے ارمغانِ حجاز میں شامل نہیں کی گئی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: اقبال اور عطائی از غلام قاسم مجاہد بلوچ، بزمِ اقبال، ڈیرہ غازی خاں، ۲۰۰۰ء)، البتہ اسی مفہوم کو اقبال نے ایک اَور رباعی (ارمغانِ حجاز فارسی، ص ۱۸) میں اسی طرح پیش کیا ہے:

بہ پایاں چوں رسد ایں عالم پیر ——— شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضورِ خواجہ ما را ——— حسابِ من ز چشمِ او نہاں گیر

۱۵۔ اقبال نامہ، ص ۵۹۷
۱۶۔ مخفی گوشے، ص ۵۶۷
۱۷۔ اقبال نامہ، ص ۲۰۷
۱۸۔ اقبالیاتِ نذیر نیازی، ص ۸۰۔ بعض اصحاب کے نزدیک مذکورہ رباعیات فنی اعتبار سے رباعی کے مقررہ اوزان میں نہیں، اس لیے انھیں قطعات کہنا زیادہ موزوں ہے۔
۱۹۔ ارمغانِ حجاز فارسی، ص ۲۴
۲۰۔ ایضاً، ص ۲۵

۲۱۔ ایضاً، ص ۲۹

۲۲۔ اقبال کے حضور، ص ۳۷-۳۸

۲۳۔ مکرر ارمغان حجاز، فارسی (ص ۱۹) میں پہلا مصرع اس طرح ہے: بدن وا ماندو جانم در تگ و پوست

۲۴۔ انقلاب، ۲۶/ اپریل ۱۹۳۸ء، بحوالہ: مخفی گوشے، ص ۵۶۱-۵۶۲

۲۵۔ روز گارِ فقیر، دوم، ص ۲۰۵

۲۶۔ کاروانِ مدینہ، ص ۱۴۳

❖......❖......❖

(۲۴)

لطفِ قرآنِ سحر باقی نماند

۱

سردار بیگم کی وفات (۲۳ رمئی ۱۹۳۵ء) کے بعد، نہ صرف علامہ اقبال، بلکہ جاوید منزل کے تمام مکینوں کی زندگی میں ایک خلا پیدا ہو گیا تھا۔ دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے سردار بیگم کی یہ حسرت تو پوری ہو گئی کہ "اپنا مکان" ہو، لیکن "اپنے مکان" کے مکین ان کی جدائی میں جس درجہ سوگوار تھے، اس کا اندازہ علامہ اقبال، جاوید اور منیرہ کے علاوہ کسی اَور کو نہیں ہو سکتا تھا۔

نومبر ۱۹۳۴ء میں، جب جاوید منزل کی تعمیر کا ڈول ڈالا گیا اور سردار بیگم نے اپنی تمام عمر کی پونجی (نقدی اور زیورات) تعمیری اخراجات کے لیے دے دی تو وہ کیا کیا نہ سوچتی ہوں گی ـــــ اپنا مکان بنے گا، وہاں جا کر رہیں گے۔

"اپنے مکان" کا تصور کیسا دل خوش کن اور طمانیت بخش ہوتا ہے۔

یہ انسانی فطرت ہے، مگر انسان ہو یا مکان ـــــ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِكْرَام ـــــ

ضربِ کلیم (ص ۱۵) کی نظم "لا الٰہ الا اللہ" کو، شاید انھی شب و روز میں، کسی لمحے لفظوں کا روپ ملا ہو گا:

یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں، لا الٰہ الا اللہ

ڈاکٹر جاوید اقبال کہتے ہیں: "سردار بیگم کی بے وقت موت نے اقبال کو پژمردہ سا کر دیا تھا[۱] اور ان کا یہ مشاہدہ بھی اسی زمانے کا ہو گا: "اکثر اوقات تو راقم انھیں اپنی آرام کرسی پر بیٹھے یا چارپائی پر دراز آنکھیں بند کیے خیالات میں مستغرق پاتا۔"[۲] اسی عالمِ استغراق میں اقبال نے سردار بیگم کا قطعہ تاریخِ وفات[۳] تصنیف کیا ہو گا، جو لاہور کے قبرستان بی بی پاک دامن میں واقع

ان کی قبر کے سنگِ مزار پر کندہ ہے۔ اس قطعے کا یہ شعر اب بھی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے آنے والوں کو، اقبال کی دلی کیفیت کا آئینہ دکھاتا ہے:

راہیِ سوے فردوس ہوئی مادرِ جاوید
لالے کا خیاباں ہے مرا سینۂ پُر داغ

لالے کا داغ تو ہر کسی کو نظر آتا ہے، مگر اقبال کے سینے کا داغ کون دیکھ سکتا تھا! اور دکھاتے بھی کیسے!

۲

وہ ڈیڑھ سال سے بیمار چلے آرہے تھے، علاج معالجے سے انھیں وقتی افاقہ تو ہو جاتا تھا، لیکن گلا بیٹھ جانے کا عارضہ جڑ پکڑ گیا تھا۔ جاوید اقبال لکھتے ہیں: ''صحت کے نقطۂ نظر سے اقبال اگرچہ اپنے سرخ و سپید چہرے کی بدولت ہمیشہ تندرست و توانا دکھائی دیتے تھے، مگر انھیں جوانی ہی سے مختلف قسم کے عوارض نے آگھیرا تھا۔'' تبخیرِ معدہ، دردِ گردہ اور دردِ نقرس، جس کے دَورے پڑتے تھے تو لگاتار کئی راتیں کرب اور بے چینی کے عالم میں تڑپتے گزر جاتیں۔ کھانسی، جس نے رفتہ رفتہ دمہ ٔ قلبی کی صورت اختیار کر لی، کھانستے کھانستے بے ہوش ہو جایا کرتے تھے۔ ایک آنکھ تو بچپن ہی سے بے کار تھی، دوسری آنکھ میں بھی موتیا اترنے لگا۔ آخر، بحیثیت مجموعی، کمزوری اور ضعف کے باعث دل بڑھ گیا۔[۴]

ایک طرف تو صحت کی یہ تشویش ناک کیفیت تھی اور دوسری جانب اقبال کے معاشی حالات بھی دِگرگوں تھے۔ وکالت کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا، تاہم کتابوں کی رائلٹی سے کچھ یافت ہو جاتی تھی۔ ریاست بھوپال کے پانچ صد روپے کے وظیفے کے علاوہ کوئی اَور مستقل ذریعہ آمدنی نہ رہا تھا۔ بن ماں کے دونوں بچے دیکھ بھال اور تربیت کے محتاج تھے، مگر وہ خود بچوں کے لیے کچھ بھی نہ کر سکتے تھے۔ اپنے طبعی تساہل اور نقل و حرکت سے گریز کے سبب علامہ کا عالم یہ تھا کہ سردار بیگم کی وفات کے بعد، وہ دو سال تک جاوید منزل کے زنان خانے میں ایک بار بھی نہ گئے تھے۔ بچوں کے احساسِ محرومی کو کم کرنے کے لیے اب یہ اہتمام ضرور کرتے کہ صبح سکول جاتے ہوئے ان کی پیشانی پر بوسہ دے کر انھیں رخصت کرتے اور واپسی پر بھی بوسے ہی سے ان کا استقبال کرتے۔[۵]

اس صورتِ حال میں اقبال کی ذہنی کیفیت اور اس شدید آزمائش کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، جس سے وہ دوچار تھے، مگر اپنی فطرت کے لحاظ سے تمام تر مشکلات، ناسازگار حالات اور پریشانیوں کے باوجود وہ حوصلہ مند اور باہمت انسان تھے۔ ایک تو انھوں نے بھوپال سے برقی علاج جاری

رکھا۔ (ان اسفار کا ذکر باب ۲۱ میں آچکا ہے۔) دوسری طرف انھوں نے بچوں کے تحفظ کی خاطر ۱۳/ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو ایک وصیت نامے کے ذریعے چار افراد (جاوید کے ماموں: خواجہ عبدالغنی۔ برادر زادہ: شیخ اعجاز احمد۔ چودھری محمد حسین۔ منشی طاہر الدین) کو ان کا ولی اور سرپرست (گارڈین) مقرر کیا۔ وصیت نامے میں چند کتابیں اور مسودات و کاغذات جاوید کو اور باقی کتابیں اسلامیہ کالج لاہور کی لائبریری کو دینے کی وصیت کی۔[۶]

یہ وضاحت ضروری ہے کہ خواجہ عبدالغنی کی وفات (۱۹/ مئی ۱۹۳۷ء) پر، علامہ نے ان کی جگہ میاں امیر الدین کو گارڈین مقرر کیا۔ شیخ اعجاز احمد قادیانی تھے اور بقول اقبال: ''قادیانیوں کے عقیدے کے مطابق تمام مسلمان کافر ہیں''، اس لیے علامہ ان کی جگہ سر راس مسعود کو گارڈین مقرر کرنے کے خواہاں تھے،[۷] مگر راس مسعود نے معذرت کی کہ وہ لاہور سے دُور ہیں، مزید یہ کہ جولائی ۱۹۳۷ء میں خود راس مسعود بھی فوت ہو گئے۔

سردار بیگم کی وفات کے بعد، اقبال کا بھتیجا امتیاز اور اس کی بیوی، اقبال کی ہمشیرگان (کریم بی بی اور زینب) یا کچھ اَور خواتین وقتاً فوقتاً سیالکوٹ سے لاہور آ کر جاوید منزل میں قیام کرتیں اور گھریلو معاملات چلاتیں۔ کبھی کبھی لاہور سے بچوں کے ماموں خواجہ عبدالغنی اور ممانی آ جاتے۔ مزید برآں بچوں کی دیکھ بھال کے لیے عارضی طور پر کسی ملازمہ کا انتظام بھی کر لیا گیا تھا، مگر ظاہر ہے، یہ سب عارضی بندوبست تھے۔ علامہ چاہتے تھے اور برابر اس کوشش میں لگے رہے کہ کوئی سمجھ دار خاتون مل جائے، جو بچوں کی دیکھ بھال کرے؛ گھر کا نظم و نسق بھی سنبھال لے، تاکہ ان کی فکرمندی کم ہو جائے۔ آخر تقریباً دو سال کی مسلسل کوششوں کے بعد یہ مسئلہ اس طرح حل ہوا کہ جولائی ۱۹۳۷ء میں مسز ڈورس احمد، علی گڑھ سے لاہور آئیں اور بطور آیا جاوید منزل میں مقیم ہوئیں۔

۳

مسز ڈورس احمد ایک جرمن خاتون تھیں، جو اپنی بہن لیزا کے ساتھ علی گڑھ میں رہتی تھیں۔ ان کے بہنوئی ڈاکٹر اصغر علی حیدر، علی گڑھ یونی ورسٹی میں شعبۂ نباتیات کے صدر تھے۔ اقبال نے پروفیسر رشید احمد صدیقی سے بھی کہہ رکھا تھا کہ بچوں کی دیکھ بھال کے لیے کسی موزوں خاتون کی تلاش میں مدد دیں، چنانچہ ان کی کوششوں سے ڈاکٹر اصغر علی حیدر مسز ڈورس احمد کو لاہور بھیجنے پر رضامند ہو گئے اور مسز ڈورس نے جاوید منزل پہنچ کر اقبال گھرانے کا نظم و نسق سنبھال لیا۔

مسز ڈورس ایک سمجھ دار اور سلیقہ مند خاتون تھیں۔ جاوید اقبال کی عمر ۱۱ برس تھی اور منیرہ سلطانہ ۵ برس کی تھیں۔ جاوید اقبال کہتے ہیں کہ ان کے آنے سے ہماری زندگیوں میں ایک ترتیب اور کسی قدر نظم وضبط آ گیا۔ یوں تو گھر میں کام کاج کے لیے دو تین ملازم اور کھانا پکانے کے لیے باورچی بھی موجود تھا، لیکن ڈورس احمد کی آمد سے جاوید منزل کی زندگی ایک ڈھب پر آ گئی۔[۸] رفتہ رفتہ جاوید، منیرہ، علی بخش اور دیگر ملازمین ان سے مانوس ہوتے گئے اور مجموعی طور پر ایک خوش گوار فضا بن گئی۔

بچے بھی آپا ڈورس کی نگرانی اور توجہ سے مطمئن اور مسرور تھے۔ خود علامہ کے معمولات میں نسبتاً باقاعدگی آ گئی تھی۔ اب وہ دوپہر کا کھانا بچوں اور مسز ڈرُوس کے ساتھ کھانے کے کمرے میں آ کر کھاتے تھے۔ اس طرح بچوں سے ان کی باقاعدہ ملاقات ہو جاتی اور وہ جاوید اور منیرہ دونوں کی تعلیم، مصروفیات، ضروریات اور مسائل سے آگاہ ہو جاتے۔ اس زمانے میں علامہ شام کا کھانا ترک کر چکے تھے، لیکن ڈورس احمد کے اصرار پر وہ شام کے وقت سوپ کا ایک پیالہ لے لیتے اور اس کے ساتھ دو توس بھی کھا لیا کرتے تھے۔

ڈورس احمد کو جلد اندازہ ہو گیا کہ سر محمد اقبال، ایک اہم شخصیت ہیں۔ وہ اردو کے معروف و مقبول شاعر بھی ہیں اور ہندستانی سیاسیات میں ایک نمایاں حیثیت رکھنے والے راہ نما بھی ـــــ مسز ڈورس جاوید منزل میں رہتے ہوئے سوچتی ہوں گی کہ علی گڑھ میں رشید احمد صدیقی نے مجھے اس ملازمت پر آمادہ کرنے کے لیے جب کہا تھا کہ ہندستان میں علامہ اقبال کو وہی مقام حاصل ہے، جو جرمنی میں گوئٹے کو ہے ـــــ تو کچھ غلط نہ تھا۔ بعد ازاں ایک موقع پر مسز ڈورس نے رشید احمد صدیقی کے سامنے اعتراف کیا کہ مَیں نے اپنی زندگی میں ایسا مخلص اور شریف آدمی نہیں دیکھا۔[۹]

اقبال کے اہم آدمی ہونے کی ایک علامت تو یہ تھی کہ جاوید منزل میں اقبال کے ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ علامہ اقبال کے چند نیاز مند باقاعدگی اور التزام کے ساتھ علامہ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ ان میں خواجہ عبدالوحید، چودھری محمد حسین، سید نذیر نیازی، حکیم محمد حسن قرشی، راجا حسن اختر اور میاں محمد شفیع شامل تھے۔ علامہ کو کہیں آنا جانا تو ہوتا نہیں تھا، اس لیے ان کی خواہش ہوتی تھی کہ احباب ان کے پاس بیٹھیں؛ باتیں کریں؛ اپنی کہیں اور کچھ ان کی سنیں۔ نیازی صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے ایک بار فرمایا: ''لوگوں سے بات چیت کرنے میں بہت سے عمدہ خیالات سوجھتے ہیں۔''[۱۰]

ڈورس احمد لکھتی ہیں: ''وہ ایک معروف شخص تھے، چنانچہ مستقل ملاقاتیوں کے علاوہ ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگ ازراہِ عقیدت ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ نوجوان، خصوصاً طالب علم ان سے راہ نمائی اور مشورے لینے آتے تھے۔''[۱۱]

علامہ اقبال سے اظہارِ عقیدت کی ایک اَور صورت یہ تھی کہ علالت کے ان آخری مہینوں میں، ان کے مداحوں اور نیاز مندوں نے لاہور میں اور بیرونِ لاہور بھی یومِ اقبال کی تقاریب منعقد کیں۔ ایک تقریب تو ۹ رجنوری ۱۹۳۸ء کو پنجاب یونی ورسٹی کے مینارڈ ہال [موجودہ: شیرانی ہال] میں منعقد ہوئی، اس کا اہتمام انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ نے کیا تھا۔ اس کی تین نشستوں میں تقریباً دو درجن مقالے پڑھے گئے اور ایک مشاعرہ بھی ہوا۔[۱۲] صحت کی خرابی کی وجہ سے علامہ اس تقریب میں خود شریک نہیں ہو سکے۔ اس موقعے پر محمد علی جناح، پنڈت نہرو، سر عبدالقادر، سر تیج بہادر سپرو اور سر سکندر حیات وغیرہ نے اقبال کے لیے نیک تمناؤں کے پیغامات بھی ارسال کیے۔ اس سے دو روز قبل ۷ جنوری ۱۹۳۸ء کو ڈاکٹر عبداللطیف کی کاوشوں سے حیدر آباد دکن میں بھی یومِ اقبال منایا گیا تھا۔ انھی دِنوں لاہور کے علاوہ بعض دیگر شہروں میں بھی یومِ اقبال منایا گیا۔ یوم منانے کا مقصد علامہ اقبال کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف ہوتا تھا اور ایسی تقاریب بالعموم ان کی تعلیمات کے تعارف اور فروغ کا ذریعہ ثابت ہوتی تھیں۔ اوّلین یومِ اقبال کئی سال پہلے ۶ رمارچ ۱۹۳۲ء کو لاہور میں منایا گیا تھا، اس کا اہتمام خواجہ عبدالوحید کے ادارے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے کیا تھا۔ بقول خواجہ عبدالوحید: ''یہ تقریب اجتماعی سطح پر اقبال فہمی اور اقبال شناسی کی پہلی کوشش تھی۔'' یونی ورسٹی کے جلسۂ عام میں اقبال کے فکر و فن پر مقالے پڑھے گئے اور شام کو اقبال کے اعزاز میں لورینگ ہوٹل میں استقبالیہ دیا گیا۔ علامہ بھی اس میں شریک ہوئے۔[۱۳]

یہ ذکر آ چکا ہے کہ علامہ اقبال نے ۱۹۳۴ء سے بہ سبب علالت اَور پھر وسطِ ۱۹۳۵ء سے والدۂ جاوید کی وفات کی وجہ سے گھر سے نکلنا کم کر دیا تھا، نوبت یہاں تک پہنچی کہ کئی کئی ماہ گزر جاتے، گھر سے ان کا نکلنا ہی نہیں ہوتا تھا۔ ۱۹۳۷ء کے اوائل میں ہندستان کے اچھوتوں میں تبلیغ اسلام کے امکانات کا جائزہ لینے کے لیے مصری علما کا ایک وفد لاہور پہنچا اور علامہ نے سپنسر ہوٹل (۶ رمنٹگمری روڈ) میں ان کے اعزاز میں ظہرانہ دیا۔ ان کے اپنے بقول: وہ چھے مہینے کے بعد گھر سے نکلے تھے۔[۱۴]

شروع شروع میں تو اقبال اپنی خواب گاہ میں چل پھر لیتے تھے،[۱۵] اب ان کا زیادہ تر وقت

پلنگ پر لیٹے لیٹے دوستوں سے گفتگو میں گزرتا تھا۔ ان کی صحت روز بروز گرتی جارہی تھی۔ ڈاکٹر جمعیت سنگھ اور ڈاکٹر عبدالحمید ملک وقتاً فوقتاً ان کا معائنہ کرتے، کوئی دوا تجویز کرتے، مگر وہ انگریزی دواؤں کے مقابلے میں دیسی (یونانی) ادویہ پسند کرتے تھے۔ آخری دِنوں میں تو انھوں نے بڑی بے زاری سے فرمایا: I have lost all faith in allopathy[16] دہلی کے حکیم نابینا صاحب کے وہ بہت قائل تھے۔ انھی سے دوائیں منگاتے تھے۔ کئی مرتبہ خود دِلی جا کر ان سے مِلے۔ بہت پہلے جب علامہ کے گردے میں پتھری کا انکشاف ہوا تھا تو آپریشن کے بجائے حکیم نابینا صاحب کی دوا نے پتھری کو ریزہ ریزہ کر کے پیشاب کے راستے خارج کر دیا تھا۔ آخری زمانے میں جب بوجوہ حکیم صاحب حیدرآباد دکن چلے گئے تو مقامی طور پر حکیم محمد حسن قرشی کے علاج معالجے کے ساتھ ساتھ جامعہ عثمانیہ کے ڈاکٹر مظفرالدین قریشی کے واسطے سے دکن سے بھی دوائیں منگانے لگے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیق کے مطابق تیس سے زائد حکیموں اور ڈاکٹروں کے نام اقبال کے معالجین کی فہرست میں شامل ہیں۔[17]

سردیوں کے موسم میں دھوپ نکلتی تو وہ باہر تخت پر لیٹ کر دھوپ تاپتے؛ کبھی آرام کرسی پر بیٹھ جاتے۔ جیسا اوپر بھی ذکر ہوا، تقریباً سارا دِن ان کے ہاں ملاقاتیوں کی آمدورفت جاری رہتی۔ ان ملاقاتیوں میں ایسے سادہ دل اور معصوم عقیدت مند بھی ہوتے، جو کچھ دیر ان کے پاس بیٹھتے اور اس طرح کے سوالات کرتے: اسلام پھر دنیا میں کب پھیلے گا؟ مسلمان کب ترقی کریں گے؟[18] بعض لوگ اقبال کی صرف خبرگیری کے لیے آتے تھے اور بعض فقط ان کی زیارت کے لیے؛ البتہ بعض قریبی دوست، مداح اور حاضر باش کئی کئی گھنٹے ان کے پاس بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔ اپنی کہتے اور علامہ کی سنتے۔ سید نذیر نیازی آخری زمانے میں نسبتاً زیادہ باقاعدگی کے ساتھ حاضرِ خدمت رہتے تھے۔ وہ گھر جا کر اس روز کی باتیں اور رُودادِ ملاقات اپنے روزنامچے میں درج کر لیتے۔ وہ لکھتے ہیں: ”حضرت علامہ کے ارشادات کی دنیا وسیع تھی، اتنی وسیع کہ ہم ان کی خدمت میں حاضر ہیں، کوئی بات شروع ہوئی...... ہم نے حضرت علامہ کا مزاج پوچھا یا حضرت علامہ نے خود اپنی طبیعت کا حال بیان کیا، کوئی استفسار فرمایا، یا کسی امر کی طرف اشارہ ہوا اور بات ہے کہ معمولی سے معمولی مسائل؛ معمولی سے معمولی واقعات اور حوادث سے پھیلتے پھیلتے اسلام، عالمِ اسلام، تاریخ، تمدن، سیاست اور معیشت، سب پر چھا گئی۔ انسان، کائنات، علم و عقل، فکر و وجدان، ادب اور فن، سب اس کی زَد میں ہیں۔ اس پر حضرت علامہ کا حُسنِ بیان، صاف و سادہ

اور دل نشین الفاظ، فصاحت و بلاغت، برجستگی اور بے ساختگی، توجہ اور التفات، شفقت اور تواضع، خلوص اور دردمندی کہ جو ارشاد ہے، دل میں اتر رہا ہے؛ جو بات ہے، ذہن میں بیٹھ رہی ہے۔ پھر ان کا انکسارِ علم، شگفتگی اور زندہ دلی کہ اِدّعا ہے، نہ تعلّی، نہ غرور، نہ تمکنت، متانت بھی ہے تو ظرافت کی چاشنی سے خالی نہیں۔ اِدھر ہم ہیں کہ سراپا ادب؛ سراپا احترام، حضرت علامہ کے ارشادات سن رہے ہیں۔ بغیر کسی جھجک کے سوالات کر رہے، سوالات کا جواب دے رہے ہیں...... دل و دماغ کا رنگ نکھر رہا ہے...... اللہ اکبر!''[۱۹]

بے تکلفانہ گفتگو میں، علامہ اپنے دل کی بات بلا تردّد، بے تأمل اور لگی لپٹی رکھے بغیر احباب کے سامنے رکھ دیتے تھے۔ دو برس پہلے ضربِ کلیم شائع کرتے ہوئے انھوں نے اسے ''دَورِ حاضر کے خلاف اعلانِ جنگ'' کی حیثیت سے پیش کیا تھا (ضربِ کلیم کے براہِ راست اور نسبتاً واشگاف لب و لہجے کی بنا پر بعض نقاد اسے ان کی کمزور شاعری قرار دیتے ہیں)۔ آخری ایام میں بھی اقبال کی گفتگوؤں میں کبھی کبھی اسی ''اعلانِ جنگ'' کا سا انداز محسوس ہوتا تھا۔ نذیر نیازی کہتے ہیں: ''ایک روز مَیں نے خواب گاہ میں داخل ہو کر سلام عرض کیا تو یہ دیکھ کر بڑی تشویش ہوئی کہ حضرت علامہ کچھ بے چین سے ہیں۔ م ش اور علی بخش ہی نہیں، قرشی صاحب بھی اُن کا بدن داب رہے ہیں۔ حضرت علامہ بار بار کروٹ بدلتے۔ کچھ ضیق [النفس] کی تکلیف تھی، کچھ درد کی۔ اس حالت میں بار بار اللہ کہتے۔ ایک دفعہ بڑی دل سوزی کے لہجے میں فرمایا: ''مجھے صحت ہو جائے تو جہاد بالسیف کروں۔''[۲۰]

نذیر نیازی کے روزنامچے اقبال کے حضور سے اندازہ ہوتا ہے کہ علالت کے ان ایام میں، علامہ زیادہ تر بستر میں نیم دراز لیٹے سوچ بچار میں ڈوبے رہتے۔ کسی وقت حقّے کے ایک دو کش لیتے، پھر جب کوئی ملاقاتی آ جاتا تو گفتگو شروع ہو جاتی۔ بولتے وقت وہ بالعموم بستر ہی میں اٹھ کر بیٹھ جاتے۔ اس دَوران علی بخش انھیں دوا کھلاتا، حسبِ ضرورت انھیں دابنے لگتا۔ وہ آنکھیں بند کر لیتے۔ بعض اوقات علامہ کو دَم کشی ہونے لگتی۔ دوست احباب محسوس کرتے کہ علامہ باتیں کرتے کرتے تھک گئے ہیں تو اجازت لے کر اٹھ جاتے۔ خواجہ عبدالوحید بھی بیماری کے آخری دِنوں میں صحت کا حال معلوم کرنے کے لیے جاوید منزل جایا کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں: ''میری کوشش یہ ہوتی تھی کہ ان کے سامنے نہ جاؤں، اس لیے کہ مَیں سامنے جاتا تھا تو وہ باتیں کرتے تھے اور باتیں کرنے سے انھیں بے انتہا تکلیف ہوتی تھی۔ میرا معمول یہ تھا کہ مَیں علی بخش یا رحمن

(یہ بھی علامہ اقبال کا ایک وفادار ملازم تھا، جس کو پنجابی لہجے میں 'رحما' کہا جاتا تھا) سے علامہ کی خیریت معلوم کر لیتا۔"[۲۱]

اپریل ۱۹۳۸ء کی ایک شام خواجہ عبدالوحید جاوید منزل پہنچے تو باتیں ہونے لگیں۔ لکھتے ہیں:

"میں زیادہ گفتگو نہیں کرنا چاہتا تھا، لیکن میں نے محسوس کیا کہ حضرت علامہ گفتگو کرنے کی طرف راغب ہیں۔ آپ تمدنِ اسلام اور بعض دوسرے موضوعات کے بارے میں گفتگو فرماتے رہے۔ لہجے میں بڑا جوش تھا۔ اس وقت آپ کو شدید درد تھا۔ درد کی شدت سے آپ بستر پر الٹے لیٹ جاتے اور پھر گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیتے۔ میں دل ہی دل میں افسوس کر رہا تھا کہ کیوں اندر آیا۔ نہ میں حاضر ہوتا، نہ آپ کو زحمتِ گفتگو ہوتی۔"[۲۲]

علامہ اقبال کو بے خوابی کی شکایت بھی تھی۔ نیند نہ آتی تو وہ چاہتے، دل بہلانے کے لیے ان کے احباب دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہیں۔ علامہ کو دیر سے سونے کی عادت تھی، البتہ سحر خیز تھے، لہٰذا صبح سویرے اٹھ جاتے۔ ان کی بھتیجی وسیمہ مبارک کہتی ہیں: "دس گیارہ بجے تک محفل جمی رہتی۔ محفل برخاست ہونے کے بعد، جن دِنوں میں بینائی ٹھیک تھی، کچھ دیر مطالعہ فرماتے یا حقہ منہ میں دبائے خاموش گہری سوچوں میں گم رہتے۔ اکثر نمازِ عشا ادا کر کے سوتے، مگر پھر علی الصبح بیدار ہو جاتے۔ کبھی تہجد اور کبھی نماز ادا کر کے اَور پھر حسب معمول بڑی خوش الحانی سے تلاوتِ کلامِ پاک فرماتے۔ ان کی سحر خیزی کا یہ عالم تھا کہ علی بخش کو فجر کی نماز کے لیے وضو کے پانی اور جاے نماز کا اہتمام رات کو سونے سے پہلے ہی کرنا پڑتا، کیونکہ فجر کی نماز اوّل وقت میں ادا کرنا ان کا معمول تھا۔"[۲۳]

۴

علامہ اوائلِ عمر ہی سے تلاوتِ قرآن پاک کے عادی تھے۔ تلاوت بہت خوش الحانی سے کرتے۔ باب ۹ میں یہ ذکر ہوا تھا کہ کبھی کبھی وہ رات کو اپنے دوست مرزا جلال الدین کے ہاں ہی ٹھہر جاتے۔ مرزا صاحب، ان ایام کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب جب رات میرے پاس گزارتے تھے تو صبح اٹھ کر نماز پڑھتے اور اس کے بعد بڑی خوش الحانی سے دیر تک قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے۔ ان کی تلاوت سن کر بڑا لطف آتا تھا اور ایک کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ پھر چاے پی کر وہ اپنے ہاں چلے جایا کرتے تھے۔[۲۴]

اقبال کے خادمِ خاص، علی بخش تقریباً ۳۵ برس تک اقبال کے شب و روز اور سفر و حضر کا

رفیق رہا۔ اس کی روایت ہے کہ صبح کی نماز اور قرآن خوانی مدت سے ان کا معمول تھا۔ قرآن بلند آواز سے پڑھتے تھے۔ آواز ایسی شیریں تھی کہ ان کی زبان سے قرآن سن کر پتھروں کے دل پانی ہو جاتے تھے۔ بیماری کے زمانے میں قرآن پڑھنا چھوٹ گیا۔[۲۵] اور عمر بھر کا معمول باقی نہ رہا۔ اس بات کا انھیں شدید قلق تھا:

در نفس سوزِ جگر باقی نماند
لطفِ قرآنِ سحر باقی نماند[۲۶]

جب خود تلاوت نہ کر سکتے تو کوشش ہوتی تھی کہ کسی اچھے قاری کی تلاوت سنیں۔ ڈورس احمد لکھتی ہیں: ایک روز ایک عرب علامہ سے ملنے آیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے مجھے کہا کہ بچوں کو میرے پاس لے آیئے۔ عرب مہمان ابھی قرآنِ پاک کی تلاوت کریں گے۔ اگر آپ بھی تلاوت سننا پسند کریں تو سامعین میں شامل ہو سکتی ہیں۔ ڈورس احمد کہتی ہیں: عرب مہمان نہایت خوش الحان تھے۔ جب تک وہ آیاتِ مقدسہ کی تلاوت کرتے رہے، ڈاکٹر صاحب برابر روتے رہے۔ اگرچہ مَیں آیات کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھی، لیکن قاری صاحب کے حسنِ قرأت نے جو سماں باندھ دیا، مَیں اس سے بہت متأثر ہوئی۔ بچے مسحور تھے اور ڈاکٹر صاحب تو وجد میں تھے۔[۲۷]

اقبال کی ایک آنکھ تو بچپن سے کمزور تھی، مارچ ۱۹۳۷ء میں آنکھوں میں موتیا اترنا شروع ہو گیا۔ مطالعہ کرنے میں دِقت پیش آنے لگی۔ رفتہ رفتہ نظر اس قدر کمزور ہو گئی کہ بعض اوقات وہ آنے والوں کو پہچان بھی نہیں سکتے تھے۔ خطوں کے جواب بھی بالعموم دوسروں سے لکھوایا کرتے۔ آخری زمانے کے خطوط لکھنے والوں میں: چودھری محمد حسین، سید نذیر نیازی، میاں محمد شفیع، ڈورس احمد، منشی طاہر الدین، ڈاکٹر عبدالحمید ملک اور جاوید اقبال شامل ہیں۔ جاوید اقبال سے کبھی کبھار اخبار پڑھوا کر سنتے، انگریزی خطوط مسز ڈورس پڑھ کر سناتیں۔ اشعار قلم بند کرنے اور انھیں بیاض میں درج کرنے کی ذمہ داری عموماً نذیر نیازی انجام دیا کرتے۔ ڈاکٹروں نے طے کیا تھا کہ مارچ ۱۹۳۸ء میں موتیے کا آپریشن کریں گے، لیکن علامہ کی دمے کی شکایت کے پیشِ نظر اسے ستمبر تک ملتوی کر دیا گیا۔

اقبال اپنے بقول: ''ایک دائم المریض کی زندگی'' بسر کر رہے تھے، تاہم ''صابر و شاکر'' تھے۔ اور دوستوں سے کہا کرتے تھے کہ ''موت آئے گی تو اِن شاء اللہ مجھے متبسم پائے گی۔'' گویا انھیں اپنی گرتی ہوئی کیفیتِ صحت کا بخوبی ادراک تھا اور وہ ذہنی طور پر دنیائے فانی کو الوداع کہنے کے لیے بطیبِ خاطر تیار تھے۔ ایک موقع پر بڑے بھائی، شیخ عطا محمد سے بھی کہا: ''بھائی صاحب! مَیں

موت سے نہیں ڈرتا، اِن شاء اللہ مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کروں گا۔"[۲۸] مہر صاحب کہتے ہیں[۲۹]: ان دنوں آپ نے یہ خیال کئی صاحبوں کے سامنے دُہرایا اور ساتھ ہی اپنا یہ شعر بھی سنایا:

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

۵

حیاتِ مستعار کے آخری برس، موسمِ سرما کی آمد کے ساتھ ہی بلغم کی مقدار میں اضافہ ہوتا گیا۔ دواؤں سے اس میں کچھ کمی تو ہوئی، مگر دمہ قلبی بڑھ گیا۔ ذرا سی حرکت سے دَم پھول جاتا تھا اور رات کو تنفس کی شکایت رہتی تھی۔ دمے کی اصل وجہ قلب کی کمزوری تھی۔ ۳۰، ۳۵ برس سے مسلسل تمباکو نوشی جاری تھی، یہی علامہ کی بیماریوں کی جڑ تھی، مگر حقہ نوشی انھوں نے آخری وقت تک ترک نہیں کی۔ "آخری علالت کے ایام میں اقبال کو دَمے کے ایسے شدید متواتر دَورے پڑتے تھے کہ وہ تقریباً بے ہوش ہو جاتے۔" اس ضمن میں تقی عابدی لکھتے ہیں: "افسوس کی بات یہ ہے کہ ابھی دَم پھولنے سے مکمل فراغت نہ ہوتی تھی بخش تازہ تمباکو بھر کر حقہ حاضر کر دیتا۔"[۳۰]

اپریل میں ان کی حالت دیکھ کر احباب تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ حکیم اور ڈاکٹر ان کا معائنہ کرتے؛ دوائیں تبدیل کرتے، مگر افاقہ نہیں ہو رہا تھا۔ ان کے پھیپھڑوں میں پانی بھر گیا تھا، اس سے خون میں آکسیجن کم ہو گئی۔ اپریل میں دَمے کے حملے زیادہ ہونے لگے اور بلغم میں خون آنے لگا تھا۔ ممنون حسن خان کے نام ۹/اپریل کے خط میں زندگی سے مایوسی کا اظہار کیا۔ چہرے اور پاؤں پر ورم آ گیا، پھر یہ تمام جسم پر پھیل گیا۔ سید نذیر نیازی نے ۱۸/اپریل کو مولانا مودودی کو ایک خط میں علامہ کا یہ پیغام لکھ بھیجا کہ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں: "جلد لاہور تشریف لائیے، تاکہ ملاقات ہو جائے۔" اس خط میں نیازی صاحب نے اپنے طور پر مولانا کو لکھا تھا: "ڈاکٹر صاحب قبلہ کی حالت نہایت اندیشہ ناک ہے۔ ایک لمحے کا بھی بھروسا نہیں۔"[۳۱] اس پیغام سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسی تشویش ناک حالت میں بھی اقبال کا ذہن فعال تھا اور وہ امت کے مسائل کی طرف برابر متوجہ تھے۔ حکیم محمد حسن قرشی لکھتے ہیں: "ایک رات مَیں ان کو نہایت اچھی حالت میں چھوڑ کر آیا۔ نبض کی رفتار امید افزا تھی، مگر جب مَیں نے صبح جا کر نبض دیکھی تو وہ بہت خفیف تھی۔ مَیں بہت پریشان ہوا۔ شفیع صاحب کو الگ لے جا کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ رات مسلمانوں کے متعلق سوچتے رہے اور پھر شدت سے روتے رہے۔ اس وقت ان پر دیر تک رِقت کی کیفیت[۳۲] طاری

رہی اور خطرہ تھا کہ ان کے قلب کی حرکت رُک جائے۔"[۳۳]

وفات سے ایک روز قبل سہ پہر کے وقت علامہ کے ایک جرمن دوست بیرن فان والتھائم ملاقات کے لیے آئے۔ اقبال کے قیامِ جرمنی کے دِنوں میں غالباً وہ بھی شیر رمنزل کے مکین تھے۔ علامہ ان سے زمانۂ طالب علمی کی باتیں کرتے رہے اور کچھ دیر کے لیے اپنا دُکھ درد بھول گئے۔[۳۴] وہ گئے تو کچھ اَور احباب آ گئے اور سیاسیاتِ حاضرہ پر گفتگو ہوتی رہی۔

۶

آخری شب معالجین جاوید منزل میں جمع ہوئے تو انھیں بتایا گیا کہ کل شام سے علامہ کو بلغم میں خون آ رہا ہے۔ معالجین کے نزدیک یہ علامت یاس انگیز تھی۔[۳۵] اس کی بھنک اقبال کے کان میں بھی پڑ گئی تھی۔ احباب کی سرگوشیاں بھی معنی خیز تھیں۔ جاوید اقبال کہتے ہیں: "انھیں یقین ہو گیا تھا کہ ان کی موت کا وقت قریب آ پہنچا ہے"، [بایں ہمہ وہ] "ضرورت سے زیادہ ہشاش بشاش نظر آ رہے تھے۔"[۳۶]

نذیر نیازی بتاتے ہیں کہ ڈاکٹر عبدالقیوم کے مطابق: فیملی ڈاکٹر جمعیت سنگھ نے ایک ٹیکہ تجویز کیا، مگر اس سے پہلے ایمونیم کلورائیڈ پلانا ضروری تھا۔ جب پلایا گیا تو علامہ بہت بدمزہ ہوئے اور فرمایا: "تم ڈاکٹروں کی دوائیں بدمزہ ہوتی ہیں۔ یہ دوائیں غیر انسانی ہیں۔" حکیم قرشی نے خمیرہ گاؤزبان عنبری کی ایک خوراک کھلائی، جس سے سکون ہو گیا۔ طے ہوا کہ ٹیکہ اگلی صبح لگایا جائے گا۔ ڈاکٹر عبدالقیوم رات وہیں ٹھہر گئے۔[۳۷]

رُخصت ہوتی ہوئی بہار کے یہ آخری دِن تھے، ابھی جاوید منزل کے چمن میں پھول کھلنا بند نہیں ہوئے تھے۔ اس شام جاوید منزل کا لان پھولوں کی خوش بو سے مہک رہا تھا۔ علامہ اقبال باہر لان میں بچھی چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ رات اترنے پر خنکی بڑھی تو چارپائی اندر گول کمرے میں لائی گئی۔ اتنے میں منیرہ آ کر ان سے لپٹ گئی۔ ڈورس احمد بھی قریب بیٹھ کر مزاج پرسی کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد جب اس نے منیرہ کو اندر لے جانا چاہا تو اس نے "کچھ دیر اَور" بابا کے پاس بیٹھے رہنے پر اصرار کیا۔ علامہ نے مسکرا کر ڈورس احمد سے کہا: "اس کی حس اسے بتا رہی ہے کہ بابا کے ساتھ یہ تمھاری آخری ملاقات ہے۔"[۳۸]

شب کے بارہ بجے تک بہت سے لوگ وہاں موجود رہے، پھر ایک ایک کر کے چلے گئے۔

شروع میں تو علامہ پُرسکون رہے، پھر بے چینی ہونے لگی، نیند بھی نہ آئی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب زیادہ بے چین ہوئے تو حکیم محمد حسن قرشی کو بلا بھیجا، مگر وہ نہ ملے۔ ڈاکٹر عبدالقیوم ستانے کے لیے باہر لان میں آ کر لیٹ گئے تھے۔ رات ڈھل چکی تھی، ستارے ماند پڑتے جا رہے تھے۔ دفعتاً علی بخش نے چلّا کر ڈاکٹر عبدالقیوم کو بلایا۔ وہ اٹھے اور لپک کر اندر پہنچے اور علامہ کی نبض ٹٹولی ——— اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

لاہور کی فضا اذانوں سے گونج رہی تھی اور علامہ اقبال کی روح، اللہ اکبر کی انھی صداؤں کے بیچ میں سے ملاءِ اعلیٰ کی جانب محوِ پرواز تھی۔ علی بخش ان کے قدموں سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر سسکیاں لے رہا تھا اور علامہ کے لبوں پر ہلکا ہلکا تبسم رقصاں تھا۔[۳۹]

۷

رموزِ بے خودی (۱۹۱۸ء، ص ۱۷۰) میں علامہ اقبال نے اپنی اس دیرینہ تمنا کا اظہار کیا تھا کہ اگر مجھے حجاز جانے کا موقع ملے تو [کیا خوب ہو، کہ] مَیں سرزمینِ حجاز ہی میں پیوندِ خاک ہو جاؤں: ع

آرزو دارم کہ میرم در حجاز

(میری آرزو ہے کہ مجھے موت آئے تو سرزمینِ حجاز میں)

بیس سال بعد، جب وہ اس عالمِ فانی سے رُخصت ہو کر عالمِ جاودانی کو سدھارے اور عالمگیری مسجد، لاہور کے سایۂ دیوار میں سپردِ خاک ہوئے تو ان کی یہ آرزو، جو ایک طرح کی دُعا تھی:

کوکبم را دیدۂ بیدار بخش — مرقدے در سایۂ دیوار بخش
تا بیاساید دلِ بے تابِ من — بستگی پیدا کند سیمابِ من
با فلک گویم کہ آرامم نگر — دیدہ آغازم انجامم نگر

(میری قسمت کے ستارے کو بھی دیدۂ بیدار عطا فرمایئے اور اپنی دیوار کے سائے میں آسودۂ خاک ہونے کے لیے ذرا سی جگہ عطا فرمایئے، تاکہ میرے دلِ بے تاب کو سکون نصیب ہو اور میرے اضطراب کو قرار آ جائے اور مَیں فلک سے کہہ سکوں کہ دیکھ، مجھے کیسا آرام نصیب ہوا؛ تو میرا آغاز دیکھ چکا ہے، اب میرے انجام پر بھی نظر ڈال۔)

اس دعا کو ایک شکل میں شرفِ قبولیت حاصل ہوا۔ وہ عالمگیری مسجد، لاہور کی دیوار تلے آسودۂ خاک ہیں، جہاں ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء سے آج تک نماز اور زیارتِ مسجد کے لیے آنے والے ہزاروں اور لاکھوں مسلمان ان کے لیے مستقلاً دست بہ دُعا رہتے ہیں۔

حوالے اور حواشی

۱۔ زندہ رُود، ص ۶۰۸
۲۔ ایضاً، ص ۱۰۸
۳۔ کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال، ص ۵۲۴
۴۔ زندہ رُود، ص ۵۹۷
۵۔ ایضاً، ص ۶۰۸
۶۔ ایضاً، ص ۶۱۴-۶۱۵۔
۷۔ اقبال نامے، ص ۲۱۸
۸۔ ڈورس احمد نے جاوید منزل میں اپنے زمانۂ قیام کی یادداشتیں انگریزی میں قلم بند کی تھیں۔ دیکھیے: *Iqbal: As I Knew Him*۔ سیدہ قرۃ العین بخاری نے اس دلچسپ کتاب کا اردو ترجمہ اقبال میری نظر میں کے نام سے شائع کیا ہے (پورب اکادمی اسلام آباد، ۲۰۰۷)، مگر نہیں معلوم، انھوں نے ڈورس (Doris) کو ڈوریس (Dorees) کیوں بنا دیا ہے؟
۹۔ اقبال: شخصیت اور شاعری، ص ۲۲
۱۰۔ اقبالیاتِ نذیر نیازی، ص ۷۸
۱۱۔ *Iqbal: As I Knew Him*، ص ۹
۱۲۔ مخفی گوشے، ص ۵۲۷
۱۳۔ اقبالیاتِ خواجہ، ص ۳۶
۱۴۔ روایت: غلام بھیک نیرنگ، بحوالہ مجالسِ اقبال، ص ۳۵
۱۵۔ اقبالیاتِ نذیر نیازی، ص ۸۴
۱۶۔ اقبالیاتِ خواجہ، ص ۴۱
۱۷۔ چوں مرگ آید، ص ۷۹۔ عابدی صاحب نے بڑی محنت سے معالجینِ اقبال کا تفصیلی گوشوارہ تیار کیا ہے۔ دیکھیے: کتابِ مذکورہ، ص ۸۰-۸۲
۱۸۔ اقبالیاتِ نذیر نیازی، ص ۴۴
۱۹۔ اقبال کے حضور، ص ۵-۶
۲۰۔ ایضاً، ص ۲۸۲

۲۱۔ اقبالیاتِ خواجہ، ص ۴۰-۴۱
۲۲۔ ایضاً، ص ۴۱-۴۲
۲۳۔ اقبال درونِ خانہ [اوّل]، ص ۲۹
۲۴۔ روایاتِ اقبال، ص ۱۱۵
۲۵۔ اقبال نامہ، از حسرت، ص ۲۳ ۔
۲۶۔ پس چہ باید کرد، ص ۵۰
۲۷۔ *Iqbal: As I Knew Him*، ص ۹-۱۰
۲۸۔ اقبال درونِ خانہ [اوّل]، ص ۴۷
۲۹۔ اقبال نامہ، از حسرت، ص ۸۵
۳۰۔ چوں مرگ آید، ص ۴۷
۳۱۔ زندہ رُود، ص ۷۱۸۔ اس خط کا عکس وثائق مودودی اور خطوطِ مودودی [دوم] میں شامل ہے۔
۳۲۔ اقبالیاتِ نذیر نیازی، ص ۹۲
۳۳۔ اقبال نامہ، از حسرت، ص ۶۴
۳۴۔ زندہ رُود، ص ۷۱۸
۳۵۔ اقبالیاتِ نذیر نیازی، ص ۹۴
۳۶۔ زندہ رُود، ص ۷۱۹
۳۷۔ اقبال درونِ خانہ [اوّل]، ص ۱۷۰
۳۸۔ زندہ رُود، ص ۷۱۸
۳۹۔ اقبال درونِ خانہ [اوّل]، ص ۱۷۳

❖......❖......❖

کتابیات

❁ کتابیں

- آتشِ چنار: شیخ محمد عبداللہ۔ چودھری اکیڈمی لاہور۔ س ن
- آثارِ اقبال: غلام دستگیر رشید (مرتب)۔ سید عبدالرزاق حیدرآباد دکن، ۱۹۴۶ء
- آخر شب: خرم علی شفیق۔ اقبال اکادمی پاکستان لاہور، زیرِ اشاعت۔
- اپنا گریباں چاک: ڈاکٹر جاوید اقبال۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ ۲۰۰۶ء
- احوال و آثارِ اقبال، دوم: ڈاکٹر محمد باقر۔ بزمِ اقبال لاہور، ۱۹۸۸ء
- ارمغانِ اقبال: رحیم بخش شاہین۔ اسلامک پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۱ء
- اشاریہ کلیات با قیاتِ شعر اقبال: ثمیرا نسرین (مرتب)۔ اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۲۰۰۶ء
- اقبال: عطیہ بیگم، مترجم: ضیاء الدین احمد برنی۔ اقبال اکادمی کراچی، ۱۹۵۶ء
- اقبال اور انجمن حمایت اسلام: محمد حنیف شاہد۔ انجمن حمایتِ اسلام لاہور، ۱۹۷۶ء
- اقبال اور ان کے بعض احباب: پروفیسر محمد صدیق۔ بزم اقبال لاہور، ۱۹۸۸ء
- اقبال اور پنجاب کونسل: میاں محمد افضل، عطش درانی (مرتبین)۔ مکتبہ زریں لاہور، ۱۹۷۷
- اقبال اور دارالاقبال بھوپال: عبدالقوی دسنوی۔ نسیم بک ڈپو لکھنؤ، ۱۹۸۳ء
- اقبال اور کشمیر: پروفیسر جگن ناتھ آزاد۔ مکتبہ علم و دانش لاہور، ۱۹۹۳ء
- اقبال اور گجرات: ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ۔ سلیچ پبلی کیشنز گجرات، ۱۹۹۸ء
- اقبال اور مودودی: ابوراشد فاروقی (مرتب)۔ مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور، ۱۹۸۰ء
- اقبال، ایک تحقیقی مطالعہ: ڈاکٹر حسن اختر ملک۔ یونی ورسل بکس لاہور، ۱۹۸۸ء
- اقبال بنام شاد: محمد عبداللہ قریشی (مرتب)۔ بزم اقبال لاہور۔ ۱۹۸۶ء
- اقبال، دارالاسلام اور مودودی: سید اسعد گیلانی۔ اسلامی اکادمی لاہور، ۱۹۷۸ء
- اقبال، جہانِ دیگر: محمد فریدالحق (مرتب)۔ گردیزی پبلشرز کراچی، ۱۹۸۳ء
- اقبال درونِ خانہ [اول]: خالد نظیر صوفی۔ بزم اقبال لاہور، ۱۹۷۱ء
- اقبال درونِ خانہ [دوم]: خالد نظیر صوفی۔ اقبال اکادمی پاکستان لاہور۔ ۲۰۰۳ء

✦ اقبال کا سیاسی سفر: محمد حمزہ فاروقی (مرتب)۔ بزم اقبال لاہور،۱۹۹۲ء
✦ اقبال کا سیاسی کارنامہ: محمد احمد خاں۔ اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۱۹۷۷ء
✦ اقبال کی ابتدائی زندگی: ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین۔ اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۱۹۸۶ء
✦ اقبال کی تلاش میں: ظ انصاری۔ میٹرو پرنٹنگ پریس، بمبئی، ۱۹۷۸ء
✦ اقبال کی شخصیت اور شاعری: پروفیسر حمید احمد خاں۔ بزم اقبال لاہور،۱۹۸۳ء
✦ اقبال کی صحبت میں: ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی۔ اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۱۹۷۷ء
✦ اقبال کی طویل نظمیں: رفیع الدین ہاشمی۔ سنگ میل لاہور،۲۰۰۴ء
✦ اقبال کی کہانی، کچھ میری کچھ ان کی زبانی: محمد ظہیر الدین احمد الجامعی۔ مکتبہ پریس حیدر آباد دکن،۱۹۵۲ء
✦ اقبال کے حضور: سید نذیر نیازی (مرتب)۔ اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۲۰۰۰ء
✦ اقبال کے ہم نشین: صابر کلوروی (مرتب)۔ مکتبہ خلیل لاہور، ۱۹۸۵ء
✦ اقبال میری نظر میں: ڈورس احمد، مترجم: سیدہ قرۃ العین بخاری۔ پورب اکادمی اسلام آباد، ۲۰۰۷ء
✦ اقبال نامہ: شیخ عطاء اللہ (مرتب)۔ اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۲۰۰۵ء
✦ اقبال نامے: ڈاکٹر اخلاق احمد اثر۔ مدھیہ پردیش اردو اکادمی بھوپال، ۲۰۰۶ء
✦ اقبال یورپ میں: ڈاکٹر سعید اختر درانی۔ فیروز سنز لاہور، ۱۹۹۹ء
✦ اقبالیات، تفہیم و تجزیہ: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی۔ اقبال اکادمی پاکستان لاہور،۲۰۰۴ء
✦ اقبالیات خواجہ [عبد الوحید]: خواجہ عبد الرحمٰن طارق (مرتب)۔ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، ۲۰۰۷ء
✦ اقبالیات: غلام رسول مہر، مرتب: محمد سلیم علوی۔ مہر سنز لاہور، ۱۹۸۸ء
✦ اقبالیات نذیر نیازی: عبداللہ شاہ ہاشمی (مرتب)۔ اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۱۹۹۶ء
✦ انوار اقبال: بشیر احمد ڈار (مرتب)۔ اقبال اکادمی پاکستان کراچی، ۱۹۶۷ء
✦ تحریک پاکستان: پروفیسر محمد اسلم۔ ریاض برادرز لاہور، س ن
✦ تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی۔ اقبال اکادمی پاکستان لاہور،۱۹۸۲ء

❖......❖......❖

اقبالیات پر مصنف کی تصانیف و تالیفات

اقبال کی طویل نظمیں (تنقید و تجزیہ)	لاہور: ۱۹۷۴ء۔ ۱۹۸۱ء۔ ۱۹۸۵ء۔ ۱۹۹۳ء۔ ۱۹۹۸ء۔ ۲۰۰۴ء
کتب اقبالیات (مختصر کتابیات)	لاہور: ۱۹۷۵ء
خطوطِ اقبال (تحقیق و تدوین)	لاہور: ۱۹۷۶ء۔ دہلی ۱۹۷۷ء
اقبال بحیثیت شاعر (انتخاب تدوین)	لاہور: ۱۹۷۷ء۔ ۲۰۰۷ء علی گڑھ ۱۹۸۲ء۔ ۱۹۹۶ء
کتابیاتِ اقبال (مفصل کتابیات)	لاہور: ۱۹۷۷ء۔ ۲۰۰۲ء
تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ (تحقیق)	لاہور: ۱۹۸۲ء۔ ۲۰۰۲ء
۱۹۸۵ء کا اقبالیاتی ادب (تعارف و تجزیہ)	لاہور: ۱۹۸۶ء
۱۹۸۶ء کا اقبالیاتی ادب (تعارف و تجزیہ)	لاہور: ۱۹۸۸ء
اقبال شناسی اور جرنل ریسرچ (انتخابِ مضامین)	لاہور: ۱۹۸۹ء
اقبال شناسی اور محور (انتخابِ مضامین)	لاہور: ۱۹۸۹ء
اقبالیاتی جائزے (تحقیقی و تنقیدی مضامین)	لاہور: ۱۹۹۰ء
علامہ اقبال (منتخب کتابیات)	اسلام آباد: ۱۹۹۳ء
اقبالیات کے تین سال ۱۹۸۷ء تا ۱۹۸۹ء (تعارف و تجزیہ)	لاہور: ۱۹۹۲ء
علامہ اقبال اور میر حجازؐ (تجزیہ و تنقید)	لاہور: ۱۹۹۴ء
اقبال بچوں اور نوجوانوں کے لیے (شریک مصنف)	اسلام آباد: ۱۹۹۴ء
تحقیق اقبالیات کے مآخذ (تحقیق)	لاہور: ۱۹۹۶ء
اقبالیات کے سو سال (منتخب مضامین) شریک مؤلف	اسلام آباد: ۲۰۰۳ء
اقبالیات: تفہیم و تجزیہ (تحقیق و تنقید)	لاہور: ۲۰۰۵ء
علامہ اقبال: شخصیت اور فن	اسلام آباد: ۲۰۰۸ء
پاکستان میں اقبالیاتی ادب (۱۹۴۷ء-۲۰۰۸ء)	لاہور: ۲۰۰۹ء

دیگر موضوعات پر مصنف کی تصانیف و تالیفات

- چاند کا سلام (اسعد گیلانی کے منتخب مضامین) شریک مرتب — سرگودھا: ۱۹۶۸ء
- شرح مرقعِ ادب (نصابی) — لاہور: ۱۹۷۴ء
- تفہیمِ اردو (قواعد و انشا) شریک مؤلف — لاہور: ۱۹۷۴ء
- سُرور اور ''فسانۂ عجائب'' — لاہور: ۱۹۷۵ء۔۱۹۷۹ء۔۱۹۸۳ء۔۱۹۹۱ء
- اصنافِ ادب — لاہور: ۱۹۷۶ء۔۱۹۷۹ء۔۱۹۸۳ء۔ ۱۹۹۱ء۔۱۹۹۸ء۔۲۰۰۳ء۔۲۰۰۸ء
- خطوطِ مودودی، اوّل (تدوین و حواشی) شریک مؤلف — لاہور: ۱۹۸۳ء
- خطوطِ مودودی، دوم (تدوین و حواشی) شریک مؤلف — لاہور: ۱۹۹۵ء
- اورینٹل کالج کے موجودہ اساتذہ' کوائف اور علمی خدمات — لاہور: ۱۹۹۷ء
- ارمغانِ علمی بہ خدمت ڈاکٹر وحید قریشی (تدوین) شریک مؤلف — لاہور: ۱۹۹۸ء
- خطباتِ رسولؐ (انتخاب و ترتیب) — لاہور: ۱۹۹۹ء
- تصانیفِ مودودی (ایک اشاعتی اور کتابیاتی مطالعہ) — لاہور: ۱۹۹۹ء
- مضامین فرحت اللہ بیگ (انتخاب' تدوین' مقدمہ) — لاہور: ۱۹۹۹ء
- پوشیدہ تری خاک میں...... (سفرنامہ اندلس) — لاہور: ۲۰۰۲ء
- ارمغانِ شیرانی (تدوین) شریک مؤلف — لاہور: ۲۰۰۲ء
- ابوالاعلیٰ مودودی علمی و فکری مطالعہ (شریک مؤلف) — لاہور: ۲۰۰۶ء
- ......سورج کو ذرا دیکھ (سفرنامہ جاپان) — لاہور: ۲۰۰۷ء
- جامعات میں اُردو تحقیق — اسلام آباد: ۲۰۰۸ء
- مکاتیب مشفق خواجہ — لاہور: ۲۰۰۸ء
- ارمغان افتخار احمد صدیقی (شریکِ مؤلف) — لاہور: ۲۰۰۹ء



علامہ اقبال: شخصیت اور فکر و فن

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے اگرچہ اردو ادب کے مختلف موضوعات پر بھی متعدد فکر انگیز اور معلومات افزا تحقیقی و تنقیدی کتابیں پیش کی ہیں لیکن ان کی زیادہ تر کاوشیں اقبالیات کے تحقیقی و تنقیدی زاویوں کو سامنے لاتی ہیں۔ انھیں دورِ حاضر کے ممتاز اقبال شناسوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کی ادبی زندگی میں علامہ اقبال کو اہم ترین موضوع کی حیثیت حاصل ہے۔

گزشتہ ربع صدی میں وہ سالانہ جائزوں اور تجزیوں کے ذریعے، اقبالیاتی ادب کے معیار و منہاج کی نشان دہی کرتے رہے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں انھوں نے بیسویں صدی کے اس نابغۂ روزگار شاعر اور مفکر کی سوانح اور شخصیت پر قلم اٹھایا ہے۔ اقبال کی عہد بہ عہد زندگی، ان کے فکری و شعری ارتقا، اپنے عہد سے نبرد آزمائی، ان کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ادبی خدمات، کلام کی تدوین اور کتابی صورت میں اشاعت، علالت اور [illegible] کے انتقال تک کی تمام جزئیات کو مؤثر اور دل کش اسلوب میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں حیاتِ اقبال سے متعلق متعدد ایسے واقعات بھی سامنے آئے ہیں جو اقبال پر لکھی گئی دیگر سوانحی کتابوں میں نظر نہیں آتے۔ مصنف نے کتاب کو حوالوں اور حواشی سے مزین کیا ہے۔ مآخذ اور کتابوں کی لمبی فہرست ان کی محنت کا ثبوت ہے۔ ہاشمی صاحب کی یہ کاوش اقبال کے موضوع پر دستیاب ہر نوع معلومات و کوائف کی ایک جامع ترین کتاب ہے جس میں اقبال کے کلام اور حالات کی مطابقت سلیقہ مندی سے کما حقہ سامنے لائی گئی ہے۔

اقبال اکادمی پاکستان